More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com

# Part 1

"پاکستانی شمال کے اُن
برف زاروں ، وادیوں ، جھیلوں ، چشموں
اور بلندیوں کے نام
جنھیں مَیں
اِس زندگی میں نہ دیکھ سکوں گا۔"



## پہلا سفر



## دُوسرا سفر

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com





## تیسرا سفر





## پہلا سفر

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



# "پریاں اور نمکین چائے"

"خواتین و حضرات آپ کا کیپٹن آپ سے مخاطب ہے۔ اگر آپ جہاز کی دائیں قطار میں تشریف رکھتے ہیں تو ذرا کھڑکی سے باہر نظر کیجئے۔ اس وقت ہم آٹھ ہزار ایک سو پچیس میٹر بلند دنیا کی مشہور چوٹی نانگا پربت پر سے گزر رہے ہیں۔ نانگا پربت کو "قاتل پہاڑ" بھی کہا جاتا ہے۔۔۔ اس کے دامن میں۔۔۔۔"

"نانگا پربت؟" نظامی صاحب اپنی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ "اوئے یہ کہاں سے آگئی؟"

"یہ ادھر ہی ہوتی ہے نظامی جی۔۔۔۔" میں نے عرض کیا۔

"کدھر ہے؟"

ہماری طرف نہیں ادھر دائیں قطار کی کھڑکیوں میں سے نظر آ رہی ہے۔"

"ادھر تو میمیں بیٹھیں ہوئی ہیں نیکریں پہن کر۔۔۔۔" مطیع نے اپنی عینک کا زاویہ درست کرتے ہوئے کہا "ہمالین مراتھن میں دوڑنے والی"

"اندازہ کرو۔۔۔۔" نظامی صاحب خوش تھے اور بہت خوش تھے۔ "ادھر نانگا پربت گزرتی جا رہی ہے اور یہ میموں کی نیکریں دیکھ رہا ہے۔۔۔" یہ کہہ کر وہ نشست سے اٹھے اور دوسری قطار کی آخری نشست پر براجمان' ایک ادھیڑ عمر' تھل تھل کرتی' کھڑکی کے ساتھ ناک چپکائے' نانگا پربت کو تلاش کرتی' میم پر جا جھکے۔ "ایکسکیوزمی۔۔۔۔" وہ مسکرائے۔ میم نے ناک ہٹا کر انہیں دیکھا اور نظر بھر کر دیکھا کہ یہ گٹھے ہوئے جسم اور سفید بالوں والا شخص کیسی آزادی سے ایکسکیوزمی کہتا ہے اور مسکراتا جاتا ہے۔ اور پھر وہ بھی رہ نہ سکی اور مسکرانے لگی۔

"کیا میں نانگا پربت دیکھ لوں؟" نظامی صاحب کی نظریں کھڑکی پر نہیں تھیں بلکہ میم کے فراخ ان ڈھکے بوڑھے سینے پر تھیں۔

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



"کیوں نہیں۔۔۔" وہ ذرا پیچھے ہٹی۔ اور اسی لمحے اپنی نشست پر بیٹھے ہوئے مجھے بھی جہاز کی اس کھڑکی میں سے جو دوسری قطار کے آخر میں تھی' اس میم کے ذرا پیچھے ہٹنے سے' ایک برفیلی سفیدی نظر آئی اور گم ہو گئی۔

ننگا پربت!

وردستان یا دیامیر کو پریوں کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ مقامی آبادی کا عقیدہ ہے کہ ننگا پربت کی چوٹی پریوں کی ملکہ کی رہائش گاہ ہے۔ داستانوں میں آیا ہے کہ وہ ایک ایسے برفانی قلعے میں رہتی ہے جو شفاف اور دبیز برف کا بنا ہوا ہے' اور برف کے بڑے بڑے مینڈک اور برف کے ایسے سانپ جو کئی کلومیٹر لمبے ہیں اس ملکہ کی حفاظت پر مامور ہیں اور ان علاقوں میں رہنے والی عورتیں رنگین کپڑوں اور شوخ زیوروں سے اجتناب کرتی ہیں کیونکہ انہیں پہننے سے پریاں ان سے حسد کر سکتی ہیں اور ان پر جادو کر سکتی ہیں۔۔۔

نظامی صاحب کھڑکی سے پیچھے ہٹے۔ "آپ بھی دیکھ لو تارڑ صاحب۔۔۔ ننگا پربت" اور وہ ابھی تک شرارت کے موسم میں تھے۔

"نہیں جناب میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں نے سنا ہے کہ ننگا پربت بھی روم کے تریوی فوارے کی طرح ہے کہ یہ دوبارہ اپنے پاس بلا لیتی ہے اور میں فی الحال دیوسائی میدان جا رہا ہوں' ننگا پربت کے پاس جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔"

اور اسی لمحے شاید یہ آواز اور لفظ کہ' ننگا پربت کے پاس جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں' نیچے ہوئے' جہاز سے نیچے گئے' ننگا پربت تک پہنچے اور پھر ادھر ایک اور سرگوشی اور سرسراہٹ پھیلی جو کہتی تھی کہ تم آؤ گے۔ اور نیچے ننگا پربت کے دامن میں' برچ کے سفید درختوں کا جو جنگل تھا' اور اس جنگل کے نیچے فرش پر سٹرابیری کے سفید پھول بچھے تھے اور چشمے جو ان میں چلتے تھے' ان چھوٹی لڑکیوں کے لرزتے بدنوں کی طرح' اور جڑی بوٹیوں کی تیز خوشبو' جو انسانوں کو اور جانوروں کو دیوانگی تک لے جاتی تھی' اور رائے کوٹ گلیشیئر کے نیچے چلنے والے دریا کا شور' اور اسے روک دینے والی برف کی دیوار' اور گلیشیئر کے کنارے کھڑی چٹانوں سے نکلتے جامنی رنگ کے الپائن پھول جو سرد ہوا میں تھے' اور ان پر روزانہ پچھلے پہر ایک ہلکی پھوار پڑتی تھی' اور کبھی یہ پھوار برف میں بدلتی اور پھر ننگا پربت کے سفید سینے سے اترنے والے دھند آلود برف کے تودے۔۔۔ اور برچ کے سفید درختوں کے پاس پریوں کی چراگاہ میں بلند ترین جگہ کی گھاس یہ کہتی تھی کہ تم آؤ گے اور میں تمہارے خیمے اور بوجھ سے دبوں گی۔



لیکن میں نے یہ سرگوشی اور یہ سرسراہٹ نہ سنی کہ میں تو دیوسائی کے پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر پھیلے میدانوں کو عبور کرنے کے لیے سکردو کی جانب پرواز میں تھا اور ننگا پربت کے پاس جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اور اس سفر پر میرے ساتھی نظامی صاحب اور مطیع الرحمٰن خان تھے۔

مطیع ان مولوی صاحب کا بیٹا تھا' جنہوں نے مجھے مسجد میں پہلا لفظ الف سکھایا اور اسی الف کے سہارے میں یہاں تک پہنچا۔ مطیع ایک بے چین اور گم شدہ روح ہے۔ وہ ہر چیز' ہر شے' ہر شخص' ہر کتاب اور ہر مشغلے میں دلچسپی لیتا ہے' ان کے راستے پر چلتا ہے اور پھر اکتا جاتا ہے۔ وہ ایک منتشر شخص ہے جو عبور حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن گہرائی تک پہنچنے سے پہلے ہمت ہار جاتا ہے' چنانچہ اس کے پاس دنیا جہان کے موضوعات کے بارے میں سرسری علم موجود ہے۔ وہ بہت اچھی رفاقت ہے اور اسی لئے میں نے اسے اس سفر دیوسائی پر مائل کیا۔ اور ہاں وہ ایک کامیاب انشورنس مین ہے۔

نظامی صاحب سے میری آشنائی مطیع اور اپنے ایک مشترک دوست نذیر کے حوالے سے ہے۔ وہ گجرات کے ایک کالج میں بقول کسے نوجوان نسل کو خراب کرتے ہیں' انہیں صراط مستقیم سے بھٹکاتے ہیں' طبقاتی کشمکش پر لیکچر دینے کے بعد وہ دریائے چناب میں ڈبکیاں لگاتے ہیں اور گرمیوں میں تربوز ان کا پسندیدہ پھل ہے' "اندازہ کرو" ان کا تکیہ کلام۔ ان کی بیویوں کے بارے میں خلق خدا نے بڑی کہانیاں بیان کی ہیں' ان دنوں پھر فارغ ہیں' لیکن شنید ہے کہ تین چار خواتین "ہنٹرا" چکے ہیں۔ مکروہات دنیا کے بہت قریب ہیں اور بیوقوفی سے اتنی ہی دور ہیں۔۔۔ جہاں مطیع مجھ سے کچھ برس چھوٹا ہے اتنے ہی برس نظامی صاحب مجھ سے سینئر ہیں۔ قد میں نظامی صاحب بس نکلتے ہوئے رہ گئے ہیں۔

"اندازہ کرو" نظامی صاحب مجھے کہنی مار کر بولے "میم ننگا پربت دیکھنے کو کہہ رہی تھی"

"نظامی صاحب آپ نے ایک شادی انگلستان میں بھی تو کی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"اہم۔۔۔" نظامی صاحب فوراً سنجیدہ ہو گئے۔ "یہ میرا پرائیویٹ معاملہ ہے تارڑ صاحب۔۔۔"

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



"سوری۔" میں نے فوراً معذرت کر دی۔

"اندازہ کرو' ابھی سفر شروع ہوا ہے اور یہ ذاتی معاملات پر ....." وہ بڑبڑائے۔

میں نے ایک مرتبہ پھر ایک اور معذرت بھری "سوری" پیش کی اور تب وہ ہلکے سے مسکرائے اور کہنے لگے "آپ تو وہاں ولایت میں عاشقی معشوقی کرتے رہے لیکن کی تھی شادی ہم نے ..... پوچھو کیا پوچھنا ہے"۔

"کچھ نہیں....." میں نے جھلا کر کہا۔

"اندازہ کرو" وہ پھر بولے۔

"کیا اندازہ کروں؟"

"ایئرہوسٹس کی عمر کتنی ہو گی؟" ..... اور ایئرہوسٹس ناشتے کی ٹرے ہر مسافر کے آگے رکھتی چلی آتی تھی۔ ناشتے میں سینڈوچز اور کافی شامل تھے۔

مطیع اور نظامی نے میری جانب دیکھا۔

"میں نے تو عرض کیا تھا"۔ میں نے کندھے سکیڑ کر فرانسیسی انداز میں کہا اور گرم کافی کی ایک چسکی لی۔

اور عرض میں نے ان دونوں کی خدمت میں آج صبح راولپنڈی میں کیا تھا۔

سکردو کے لیے فلائٹ کا وقت ساڑھے چھ بجے صبح تھا۔ ہمیں پانچ بجے ایئرپورٹ پر حاضر ہونا تھا۔ ساڑھے چار بجے جب ہم بیدار ہو کر تیار ہوئے اور عازم ایئرپورٹ ہونے کو تھے کہ نظامی صاحب نے پوائنٹ آف آرڈر اٹھایا۔ "میں نے کہا تارڑ صاحب" انہوں نے اپنے پیٹ پر بھوکے فقیر کی طرح ہتھیلی تھپ تھپ کرتے ہوئے کہا "باوشاہو' ناشتے کے بغیر سکردو لے جاتے ہو۔ ادھر خیر سے راجہ بازار میں حلوہ پوڑی بڑی اعلیٰ ملتی ہے' وہ ذرا پہلے نوش کر لیں"

میں نے سراسیمہ ہو کر گھڑی پر نگاہ ڈالی "ہمیں پانچ بجے ایئرپورٹ پہنچنا ہے اور ....."

"ناشتے کے بغیر؟ ..... نہ جی ..... یہ نہیں ہو سکتا"

"ناشتہ شاید ہمیں جہاز پر بھی دیا جائے اور ....."

"شاید والی بات ہے ناں" نظامی صاحب نے فیصلہ دے دیا۔ "مجھے تو آپ یہیں پنڈی میں چھوڑ جائیں' اگر آپ نے بعد میں بھی کھانے پینے پر اعتراض کرنا ہے تو۔ آپ چلے جاؤ سکردو"

چنانچہ ہم اپنے اصل راستے سے الگ ہو کر پوڑیاں کھانے کے لیے چلے گئے



اور تمام عرصہ میری نظریں گھڑی پر لگی رہیں۔ ہم نے آج صبح کی نشستیں بڑی مشکل اور بڑی سفارشوں سے حاصل کی تھیں اور میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ یہ شخص سکردو فلائٹ کے مقابلے میں تین پوڑیوں اور حلوے کی پلیٹ کو زیادہ اہمیت دے رہا ہے۔ بہرحال ناشتے سے فارغ ہوئے تو مطیع نے پوائنٹ آف آرڈر اٹھا دیا "سکردو میں تربوز ہوتے ہیں؟"

"پتا نہیں۔" میں نے بے صبری سے کہا۔ "ہمیں اب ایئرپورٹ ....."

"یہ تربوزوں والا آئیڈیا بھی اچھا ہے" نظامی صاحب فوراً بولے "مطیع ٹھیک کہتا ہے"

"حرج ہی کیا ہے" نظامی صاحب لاپروائی سے بولے۔

"ویسے بلتستان کی خوبانیاں اور سیب بہت مشہور ہیں اور ....."

"تربوز' تربوز ہوتا ہے باوشاہو' اور خوبانی کے ساتھ اس کا کیا مقابلہ ..... تربوز ہو درمیانے سائز کا' مدینے والا' اور چناب دریا میں صرف دس منٹ تک اسے ڈبوئے رکھو اور پھر کھاؤ تو باوشاہو جنت کا میوہ ہے۔"

"آپ تو جنت پر یقین نہیں رکھتے"

"پر میں جنت کے میووں پر تو یقین رکھتا ہوں تارڑ صاحب"

میں نے سوچا اگر یہی حالات رہے تو ہمارا دیوسائی ایڈونچر یہیں پنڈی کی صبح میں ساڑھے پانچ بجے ہی فزل آؤٹ ہو جائے گا' اس لیے اب یا کبھی نہیں والا فیصلہ کر لینا چاہیے۔

"حضرات چونکہ میں نے اپنے آپ کو اس مہم کا لیڈر مقرر کر لیا ہے۔ اس لیے میرا فیصلہ یہ ہے کہ فی الحال نو تربوز..... اور فی الحال ایئرپورٹ"

"سکردو میں آم ہوتے ہیں؟" مطیع پھر بولا۔

"بالکل ہوتے ہیں تم چلو تو سہی" میں نے اسے تسلی دی اور یوں ہم عین وقت پر ایئرپورٹ پہنچے اور سکردو فلائٹ کے مسافر ہوئے۔

"میں نے تو عرض کیا تھا"۔ میں نے کندھے سکیڑ کر فرانسیسی انداز میں کہا اور گرم کافی کی ایک چسکی لی "کہ ناشتہ ہمیں شاید جہاز پر بھی دیا جائے"۔

یہ ایک عجیب کیف آور احساس تھا جو سرایت کرتا تھا بدن کے پوروں میں اور ان حصوں میں جو خاص کیفیتوں میں زندہ ہوتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ زندگی کی پھونک

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



کتنی بڑی نعمت ہے' اور خاص طور پر اس لمحے جب .... نیچے ایک برف کدہ ہو .... ایک ویرانی ہو اور وہ بلندیوں پر ہو اور ان سے بلند وہ جہاز ہو جس میں آپ کندھے سکیڑ کر کافی کی ایک چسکی لیتے ہوں۔ نیچے وادیاں تھیں' برف کی ایک خاموش دنیا تھی جو گزرتی جاتی تھی' اور ان میں ایک بلند چوٹی تھی اور وہاں تھوڑی سی جگہ تھی' اور مجھے خیال آیا کہ شاید یہاں کوئی نہ آیا ہو' کبھی بھی وہاں کسی نے قدم نہ رکھا ہو اور میں نے خواہش کی کہ آئندہ بھی وہاں کوئی بشر نہ پہنچے.... کچھ چوٹیاں انسانوں کے قدموں کے بغیر رہنی چاہئیں .... اس زمانے میں دنیا کا مشہور کوہ پیما میسنر ہے جس کا تعلق اطالیہ سے ہے۔ یہ شخص کوہ پیمائی کا ایک معجزہ ہے' ایک عجوبہ ہے۔ ایک تو وہ تن تنہا چوٹی تک پہنچتا ہے یعنی وہ خود ہی پوری مہم ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ بلند ترین چوٹی ایورسٹ پر بھی وہ آکسیجن کے بغیر جاتا ہے کیونکہ اس کے پھیپھڑوں میں قدرت کی طرف سے ایسی گنجائش رکھی گئی ہے کہ وہ بلندی پر بھی کام کرتے رہتے ہیں اور عام لوگوں کی طرح منہدم ہو کر موت کا باعث نہیں بنتے۔ میسنر نے دنیا کی تقریباً تمام بلند ترین چوٹیوں کو اپنے قدموں تلے روندا ہے۔ پچھلے دنوں یہ مہم جو چین کے ہولناک صحرا تکلا مکان میں تنہا چلا گیا تھا۔ اسی میسنر کو میں نے پاکستان ٹیلی ویژن پر دیکھا اور وہ کہہ رہا تھا کہ میں ایک بہادر کوہ پیما نہیں ہوں کیونکہ پہاڑوں میں بہادری دکھانے والا کوہ پیما ایک مردہ کوہ پیما ہو سکتا ہے' اسے ایک احتیاط پسند شخص ہونا چاہئے اور اس نے یہ بیان دیا کہ پاکستان کے شمالی علاقے میرے پسندیدہ ترین ہیں اگر میرے بس میں ہوتا تو میں ان تمام علاقوں کو محفوظ شدہ علاقے قرار دے دیتا' اور ان کے اندر جدید طرز زندگی کو سرایت نہ کرنے دیتا' صرف اس لئے کہ اگر آج سے سینکڑوں برس بعد جب دنیا فیکٹریوں کے دھوئیں کی لپیٹ میں ہوگی اور انسان مکمل طور پر مشینیں بن چکے ہوں گے' تب اگر کوئی بچہ اپنے باپ سے یہ کہے کہ ابو جب اللہ تعالی نے یہ دنیا تخلیق کی تھی تو یہ کیسی تھی؟ تو وہ باپ بیٹے کی انگلی تھام کر اسے پاکستان کے ان شاندار علاقوں میں لے آئے اور کہے "بیٹا جب اللہ تعالی نے یہ دنیا بنائی تو ایسی تھی"

اور جہاز کے نیچے جو ویران برف زار تھے' اور ان میں جو خاموشی تھی وہ بھی یہی کہتی تھی کہ ہاں ہم ابھی تخلیق ہوئے ہیں....

اور ہم دیوسائی میدان کو ہی عبور کرنے کے ارادے سے کیوں گھر سے نکلے



تھے' اور سکردو جا رہے تھے؟

اس میدان کے بارے میں مجھے پہلی بار ثروت علی نے بتایا اور اس نے اسے جیپ میں عبور کیا تھا' پھر اس میدان کے حیرت انگیز قصے کئی کوہ پیماؤں نے سنائے۔ راجہ چنگیز سلطان نے مجھے اس کی بلندی پر واقع ایک جھیل کی تصویر دکھائی جس کے پانیوں پر "اللہ" کا لفظ لکھا دکھائی دے رہا تھا' یقیناً یہ اس کے گہرے پانیوں کی سیاہی کا کرشمہ تھا لیکن دل میں خواہش تو اٹھتی ہے اسے دیکھنے کے لیے' پندرہ سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر دیوسائی میدان میں پھول ہیں جو کم لوگوں نے دیکھے ہوں گے' اور ریچھ ہیں جو مچھلیوں کا شکار کرتے ہیں اور وہاں تیز اور سرد ہوائیں چلتی ہیں' اور گرمیوں میں بھی رات کو درجہ حرارت نقطۂ انجماد تک گر جاتا ہے' البتہ اسے عبور کرنے کے لیے مشقت اور دل پر جبر لازمی تھا کیونکہ راستے میں مشکلیں بہت تھیں' اور وہ آسان نہیں ہو سکتی تھیں۔ یہ میدان ہمیشہ برف سے ڈھکا رہتا ہے' اور سال میں صرف دو ڈھائی مہینے ایسے ہوتے ہیں جن میں اسے عبور کیا جا سکتا ہے اور کیسے پتا چلتا ہے کہ دیوسائی کی برفیں پگھل چکی ہیں اور اسے عبور کیا جا سکتا ہے.... اس کے بارے میں بڑی خوبصورت حکایت ہے۔ صدیوں سے بکروال یا چرواہے اس میدان میں نشوونما پانے والی لمبی گھاس اور ہریاول کے لیے اپنے جانوروں کے ہمراہ ادھر آتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ آگے برف ہے تو وہ برف کی حد پر قیام کرتے ہیں پھر جوں جوں برف پگھلتی ہے اور پیچھے ہٹتی ہے وہ اس کے ساتھ ساتھ حرکت کرتے رہتے ہیں اور پھر ایک روز وہ جھیل صدپارہ کے قریب اتر کر سکردو میں پہنچ جاتے ہیں' اور ان کو دیکھتے ہی لوگ جان جاتے ہیں کہ دیوسائی میدان میں برف پگھل چکی ہے۔

ہمارے جہاز کی زیادہ تر آبادی غیر ملکی تھی بلکہ یہ جہاز تقریباً ان لوگوں نے ریزرو کروا رکھا تھا اور ہم تین سکیٹیرز کو تو صرف سفارش کی وجہ سے جگہ مل سکی تھی۔ کسی سفری ادارے نے "ہمالین مراتھن" کے نام سے ایک دوڑ کا انتظام کر رکھا تھا جو سکردو سے شروع ہو کر "کے ٹو" جانے والے راستے پر واقع کسی قصبے تک اختتام کو پہنچتی تھی' اور اسی سلسلے میں سولہ سے ستر سال تک کی میمیں اور صاحب نیکریں اور بنیانیں زیب تن کئے تیار بیٹھے تھے اور ان کی بنیانوں پر "ہمالین مراتھن" سرخ روشنائی سے لکھا تھا اور چمکتا تھا۔ یہ کوئی سچ مچ سنجیدہ قسم کی دوڑ نہیں تھی بلکہ ذرا شغل میلہ تھا تاکہ ان علاقوں کی جانب دنیا کی توجہ مبذول کرائی جائے۔ میں نے

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں اپنے بے ہنگم جسم اور بے ربط سانس سمیت اس دوڑ میں شامل ہوں گا اور ایک عدد تصویر کے اترنے کے بعد دوڑ سے ریٹائر ہو جاؤں گا' بعد میں یہ تصویر میری خودنوشت میں چھپے گی' اور اس کے نیچے لکھی ہوئی عبارت کچھ یوں ہو گی "مصنف دنیا کی دشوار ترین دوڑ ہمالین مراتھن میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے' دائیں جانب بی بی سی لنڈن کا کیمرہ مین ان کے فاتحانہ انداز کو قلم بند کر رہا ہے۔" اور یہ تھا بھی درست کہ بی بی سی ٹیلیویژن کی ٹیم اس دوڑ کو کور کرنے کے لیے سکردو پہنچ رہی تھی۔ چنانچہ یہ طے تھا کہ میں اس دوڑ میں بہرصورت شامل ہو رہا تھا۔ اگر نانگا پربت والی ستر سالہ مائی اس میں حصہ لے سکتی تھی تو اس کی نسبت ابھی تو میں جوان تھا۔

سکردو اور بلتستان کو میں بہت اچھی طرح نہیں جانتا تھا کیونکہ اس علاقے کے بارے میں کوئی داستان یا متھ نہ تھی۔ کتابیں کم تھیں۔ جو کوئی بھی شمال کی بات کرتا' صرف ہنزہ اور گلگت کا تذکرہ کرتا۔ سکردو کو ایک غریب رشتے دار کی طرح بھلا دیا جاتا۔ اس میں کچھ قصور یہاں کے باشندوں کا بھی تھا کہ وہ اتنے دھیمے اور شریف الطبع ہیں کہ اپنے علاقے کے بارے میں کچھ کہنے سے ہچکچاتے ہیں ذرا شرمیلے ہیں کہ اپنے وطن کی اپنے منہ سے کوئی کیا تعریف کرے۔

سکردو میں میں قیام کے دوران ایک بلتی دوست کہنے لگا۔ "تارڑ صاحب ہماری غلطی صرف یہ ہے کہ ہم نے ہنزہ کے باشندوں کی طرح اپنے علاقے کے بارے میں غیر حقیقی داستانیں نہیں بنائیں۔۔۔ ہمیں اشتہار بازی کا فن نہیں آتا۔ ہم نے غیر ملکیوں سے تعلقات اچھے نہیں رکھے اور ہم مار کھا گئے۔ آپ یہ بتایئے ہنزہ میں ہے کیا؟ کیا ہنزہ ایک متھ نہیں ہے۔۔۔؟ کیا وہاں غیر ملکیوں کے علاوہ مقامی سیاحوں کو اچھوت نہیں سمجھا جاتا؟ ہنزہ میں سے کریم آباد کے پرانے قلعے کے ایک منظر کو نکال دیجئے تو باقی کیا بچتا ہے۔ راکاپوشی بھی ریاست نگر میں ہے۔ شمال تو بلتستان ہے۔ کے ٹو کی چوٹی کدھر ہے اور مشہ بروم کہاں ہے اور سیاچین کس علاقے میں ہے۔ آپ نے بھی کتاب لکھی تو ہنزہ کے بارے میں ہی لکھی"

میرا خیال ہے کہ بلتی دوست قدرے جذباتی ہو رہا تھا لیکن اس کے جذبات کی گرمی کو منفی کرنے کے بعد بھی بہرطور کچھ حقائق باقی رہ جاتے تھے۔ بلتستان بے توجہی کا شکار ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قراقرم ہائی وے' اُدھر گلگت سے اُدھر ہنزہ اور اُدھر ہی سے درہ خنجراب' اِدھر نہیں آتی اور اگر کوئی آئے تو خاص طور پر آئے۔ اور آئے تب اگر اسے کوئی بتائے کہ بلتستان بھی ہے عالم میں انتخاب۔۔۔۔ اور کوئی اسے بتاتا نہیں' سب لوگ ہنزہ اور خنجراب کا ہی تذکرہ کرتے ہیں۔



ایک زمانے میں جب میں اپنی بچوں کی دکان پر بیٹھا کرتا تھا تو بریگیڈیئر اسلم خان ہمارے ہاں آیا کرتے تھے' وہ بتایا کرتے تھے سکردو میں' میں نے ایک جھیل کنارا خریدا ہے اور میں وہاں پھول اگانا چاہتا ہوں اور اگر ہو سکے تو جھیل میں سنگھاڑے کاشت کرنا چاہتا ہوں اور جھیل کے کنارے میں نے ایک ڈکوٹا جہاز کا ڈھانچہ ایستادہ کر رکھا ہے اور وہاں میری رہائش ہوتی ہے۔ بہت بعد میں جب میں شمال میں گیا تو معلوم ہوا کہ بریگیڈیئر اسلم خان ان علاقوں میں بہت جانے جاتے ہیں' اور وہ ایک ایسی شخصیت ہیں' جن کے بارے میں ہر قسم کی گفتگو ہوتی ہے۔ سکردو کا شنگریلا ٹورسٹ ریسارٹ ان ہی کی ملکیت ہے۔ بلتستان سے ہی عبدالکریم بلغاری آیا کرتے تھے' اور ہمیشہ کہتے تھے تارڑ صاحب آپ دنیا دیکھ آئے' سکردو کیوں نہیں دیکھتے' میرا خیال تھا کہ لغاری کی طرح بلغاری بھی کوئی ذات ہے لیکن بعد میں کھلا کہ وادی خپلو کے راستے میں ایک کوہستانی گاؤں بلغار نام کا ہے اور وہاں کے باشندے اپنے آپ کو بلغاری لکھتے ہیں۔

کسی سے پوچھا کہ بلتستان ہے کیا؟ جواب ملا' پانچ وادیاں' ۔۔۔۔ شگر' سکردو' روندو' خپلو اور خرمنگ۔

کسی نے کہا کہ بلتستان تو دراصل تین چیزوں کا نام ہے۔ کے ٹو کا پہاڑ' سیاچین کا گلیشیئر اور دریائے سندھ کا راستہ۔

اور ایک صاحب مسکرائے اور کہنے لگے کہ پریاں اور نمکین چائے بلتستان ہے۔

جہاز کو ایک دھچکا سا لگا۔۔۔۔

"جل تو جلال تو۔۔۔۔" نظامی صاحب جو اس دوران اونگھ چکے تھے فوراً بیدار ہو گئے "اندازہ کرو' یہ جہاز چلانے کا طریقہ ہے"

"میرا خیال ہے کہ ہم اترنے والے ہیں اور پائلٹ نے پہیئے نکالے ہیں"

برف کدہ اب وہاں نہیں تھا۔ اب وہاں ایک وسیع وادی دکھائی دیتی تھی' ویران اور ریتلی۔

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



ایک واقف کار نے سکردو سے واپسی پر بتایا کہ گورنمنٹ کالج سکردو کے پرنسپل خواجہ مرداد نے لائبریری میں تمہاری کتابوں کا ایک خصوصی سیکشن بنا رکھا ہے۔ تمہارا ذکر بہت کرتے ہیں چنانچہ میں نے ایک سرسری سا نامہ ان کے نام لاہور سے بھیج دیا کہ شاید یہ خاکسار ان تاریخوں کے آس پاس سکردو آئے تو آپ سے ملاقات کرے۔

جہاز کو ایک اور دھچکا لگا۔

"اس پائلٹ کو سمجھاؤ یار یہ کیا کر رہا ہے؟" نظامی صاحب نے مجھے ڈانٹا۔

"پائلٹ اس وقت لینڈ کر رہا ہے' میں اسے اس وقت نہیں سمجھا سکتا"

کھڑکی میں سے نیلگوں پہاڑوں کا ایک سلسلہ گزرتا تھا' اور ان کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔

جہاز رکا اور مسافر اترنے لگے۔

باہر ایک وسیع وادی تھی' اور دور اس کے ریتلے اور ویران میدانوں سے پرے پہاڑ بلند ہوتے تھے اور ان پر سفیدی تھی جو آسمان کی نیلاہٹ میں گھلتی جاتی تھی' اور ہوا تیز تھی اور جب میں نے اسے اپنے بدن میں اتارا تو یہ بہت مختلف تھی' یہ سرد اور فرش پر گرنے والے خالی کٹورے کی طرح کھنکتی تھی۔ اس میں ایک دھلی ہوئی ٹھنڈک تھی' یا شاید خنک ٹھنڈک تھی' بس ایسے تھی جیسے صحرا کی سرد رات کا آغاز ہوتا ہے۔ سکردو آتے ہوئے لامحالہ گلگت ذہن میں تھا لیکن یہ جگہ اور تھی' اس کی آب و ہوا اور اس کی بناوٹ اور اس کا پھیلاؤ مختلف تھا۔ گلگت تنگ تھا' چٹانوں میں گھرا ہوا اور اس کے موسم سخت تھے' اور سکردو میں وسعت تھی اور اس کی ہوا کسی برفانی ندی میں نہائے ہوئے بدن کے لمس کی طرح زندگی دیتی تھی۔ میں نے منہ کھول کر ایک گہرا سانس لیا۔

نظامی صاحب میرے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے' انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا' "آپ کو دمے کی تکلیف ہے تارڑ صاحب؟"

"نہیں تو۔۔۔"

"تو پھر منہ کھول کر ہانپتے ہوئے سانس کیوں لے رہے ہو' نیچے اترو سیڑھی سے' پیچھے میمیں آ رہی ہیں۔"

"اور مطیع کہاں ہے؟"



مطیع کا ایک شوق دست شناسی بھی ہے اور اس نے باقاعدہ اس کی تعلیم حاصل کی تھی' اس کا اپنا بیان ہے کہ اسے دست شناسی میں بہت بلند مقام حاصل ہے۔ کل کلاں اگر انشورنس کا کاروبار ٹھپ ہوجائے تو وہ پروفیسر مطیع الرحمن خان عامل نجومی کا بورڈ لگا کر با آسانی اپنی روزی کما سکتا ہے۔ اس کا یہ شوق اتنا شدید ہے کہ وہ کہیں بھی کسی بھی جگہ' صرف اپنے ہاتھوں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا اور اسے ان ہاتھوں میں کسی اور کا ہاتھ چاہئے۔۔۔ چنانچہ وہ زبردستی ہاتھ دیکھنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

اور مطیع جہاز کی سیڑھی سے یوں اترتا آ رہا تھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں ایک موٹی جرمن خاتون کا ہاتھ تھا جو وہ شاید چھڑانا چاہتی تھی اور وہ اپنی عینک درست کرتا اس پر جھکا مسکرا رہا تھا۔

"اندازہ کرو" نظامی صاحب نے سر ہلایا۔

سکردو ایئرپورٹ کی عمارت اتنی مختصر تھی کہ اگر آپ اپنے دھیان میں جہاز کی سیڑھی سے اتریں اور میری طرح بوتھی اٹھائے لمبے لمبے سانس لینے لگیں تو اتنی دیر میں آپ ایئرپورٹ سے باہر سڑک پر نظر آ جائیں گے۔ کسی برانچ لائن پر پڑے ہوئے ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کی طرح فلائٹ آ جانے پر یہ ایئرپورٹ وقتی طور پر آباد ہوتا تھا اور پھر اس پر تیز ریتلی ہوائیں چلنے لگتی تھیں۔ ایئرپورٹ کے ہال کمرے میں مسافر اپنا اپنا سامان تلاش کر رہے تھے۔ ایک تیز اور تیکھے نین نقش والے گورے چٹے اور قد میں نکلتے ہوئے نوجوان نے مجھے غور سے دیکھا اور کہنے لگا۔ "تارڑ صاحب۔۔۔ آیئے۔۔۔"

میں اس نوجوان کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ "کہاں آیئے؟"

"خواجہ مرداد۔۔۔" اس نے کہا۔

"اچھا اچھا" میں نے اس کے کندھے پر ایک بزرگی سے بھرپور تھپکی دی۔ "آپ کو خواجہ صاحب نے بھیجا ہے۔"

"میں اپنے آپ کو خود کیسے بھیج سکتا ہوں۔" نوجوان مسکرایا۔ "میرا نام خواجہ مرداد ہے۔"

میں نے فوری طور پر اپنے بے تکلفانہ رویے کی معذرت کی اور پھر مطیع اور نظامی صاحب کا تعارف کروایا۔

ہم ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر آ گئے۔

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



"خواجہ صاحب ہم بنیادی طور پر دیوسائی میدان دیکھنے کے لیے گھر سے نکلے ہیں فی الحال کسی مناسب ہوٹل کا پتا دیجئے' اور یہ فرمائیں کہ ملاقات کب ہو گی؟"

"تارڑ صاحب ہم ایک دوسرے سے بچھڑیں گے تو ملاقات ہو گی ناں" انہوں نے میرا بازو پکڑ کر کہا۔ "اب آپ ہمارے قبضہ قدرت میں ہیں' آیئے۔"

مجھ میں ایک جھجک تھی "لیکن.... میرا مطلب ہے...."

"تکلف بعد میں کر لیجئے گا فی الحال اس جیپ میں تشریف رکھیے تاکہ ہم سکردو جا سکیں۔"

"تو کیا ہم سکردو میں نہیں ہیں"؟ نظامی صاحب نے ذرا فکرمند ہو کر پوچھا۔ "کہیں اور تو نہیں اتر گئے؟"

"شہر یہاں سے کچھ فاصلے پر ہے۔" خواجہ صاحب نے ڈرائیور کو اشارہ کیا' اور ہم ایئرپورٹ سے نکل کر ایک ہموار راستے پر آ گئے' جس کے ایک جانب وہی نیلگوں بلندیاں تھیں جو ہم نے جہاز سے دیکھی تھیں اور دوسری جانب ایک نیم صحرائی لینڈ سکیپ سے بہت پرے دریائے سندھ پھیلا ہوا تھا' اور اس منظر کا پھیلاؤ مجھے حیران کرتا تھا۔ یہاں ایک ایسی بیابان وحشت تھی جو کہتی تھی کہ میں آبادی کے لیے نہیں ہوں اور اس کے باوجود یہاں انسان آباد تھا لیکن ذرا جھک کر رہتا تھا' ان پہاڑوں کی رفعت و عظمت کے سامنے۔ شاید اسی لیے بیشتر عمارتیں یک منزلہ تھیں زمین کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ وہ قدرت کے اس وسیع منظر میں مخل نہیں ہو رہی تھیں' دستک نہیں دیتی تھیں بلکہ اس کی خاموشی میں شامل ہوتی تھیں۔

ایک خنک اور درختوں سے گھری چار دیواری کے اندر جیپ داخل ہوئی۔ ایک صاف ستھرے برآمدے میں بہت سارے لوگ کھڑے ہوئے تھے۔

"میرا سٹاف آپ سے ملاقات کی خواہش رکھتا ہے۔" خواجہ صاحب نے لاپروائی سے کہا "پہلے آپ ہمارے ساتھ چائے پئیں گے پھر آپ وہاں جائیں گے' جہاں آپ کی رہائش کا بندوبست ہے۔"

نظامی صاحب میرے قریب ہوئے "تارڑ صاحب میری ایک عادت ہے اور میں آپ جو کچھ کر لیں اس عادت سے باز نہیں آ سکتا"

اب میں ذرا ہراساں ہو گیا کہ نظامی صاحب کی وہ عادت پتا نہیں کس نوعیت کی ہے....



"عادت میری یہ ہے" وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ سے تھپ تھپ کرتے ہوئے بولے۔ "کہ میں بادشاہو نہانے کا بڑا شوقین ہوں اور نہانے کے بغیر رہ نہیں سکتا اس لئے...." انہوں نے دونوں ہاتھ ہوا میں پرندوں کی طرح پھڑپھڑائے.... "میں تاری لگانا چاہتا ہوں"۔

"بعد میں نہیں لگ سکتی؟"

"بالکل نہیں"

میں نے شرمندہ ہو کر خواجہ صاحب سے بات کی۔ انہوں نے کندھے سکیڑ کر کہا' "نو پرابلم" اور اپنے ایک جونیئر لیکچرر کو اشارہ کیا کہ نظامی صاحب کو نہلا لاؤ۔ نظامی صاحب نے اس نوجوان کو غور سے دیکھا اور کہنے لگے۔ "برخوردار تم یہاں لیکچرر ہو ناں؟" نوجوان نے اثبات میں سر ہلایا تو نظامی صاحب بولے' "میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوں' چلو کدھر ہے غسل خانہ"

خواجہ صاحب ہمیں لائبریری میں لے گئے اور ایک کونے کی طرف اشارہ کر کے بولے۔ "وہ چند کتابیں دیکھ رہے ہیں آپ۔ بس ان کی وجہ سے ہم آپ کی عزت کرتے ہیں ورنہ آپ ہیں کیا؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے بے اختیار مسکراتے ہوئے کہا۔ "ویسے آپ کیسے جان گئے تھے کہ میں آج ہی سکردو آ رہا ہوں' میرے خط میں تاریخ تو درج نہیں تھی۔"

"بس میں روزانہ ایئرپورٹ جا کر جہاز میں سے اترنے والوں کو دیکھ لیتا تھا کہ ان میں کوئی اندلس میں اجنبی یا خانہ بدوش ہے' تو ہمارے ساتھ آ جائے"

خواجہ مہرداد کچھ زیادہ ہی مہربان تھے۔ اس دوران نظامی صاحب تاری لگا کر واپس آ چکے تھے' انہوں نے میز پر سجے چائے کے تکلفات کو ایک نظر دیکھا اور کہنے لگے۔ "یار اندازہ کرو۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ابھی صبح پانچ بجے ہم راولپنڈی میں حلوہ پوڑی کا ناشتہ کر رہے تھے۔ پھر چھبیس ہزار فٹ کی بلندی پر ناشتہ کر رہے تھے ساڑھے چھ بجے' اور اب ساڑھے آٹھ بجے یہاں سکردو میں تیسرا ناشتہ"

اس تیسرے ناشتے کے بعد ہمیں کالج کا میوزیم دکھایا گیا جس میں بلتستان کے تاریخی ہتھیار' ظروف' زیور اور ملبوسات سجے تھے۔ خواجہ صاحب نے بتایا کہ دور دراز کی وادیوں سے آنے والے طالب علم اس میوزیم کے قیام میں بے حد معاون ثابت

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



ہوئے کیونکہ وہ پہاڑی قصبوں اور دور افتادہ آبادیوں سے ایسی چیزیں لے آتے ہیں جو بلتستان کے ثقافتی ورثے کی نمائندگی کرتی ہیں۔

"یہ کیا ہے؟" نظامی صاحب نے بڑے بڑے سفید پھندنوں والی ایک سرخ ٹوپی سر پر جماتے ہوئے دریافت کیا۔

"بلتی دولہا اسے دلہن کے گھر جاتے وقت پہنتے ہیں۔۔۔" ترشنگ کے رہنے والے کریم صاحب نے بتایا۔ "اور یہ ٹوپی جو چاندی کی جھانجھروں سے سجی ہوئی ہے دلہن پہنتی ہے۔"

"اچھا؟" نظامی صاحب بے حد محظوظ ہوئے۔ "ہماری بھی تو کوئی دلہن شلمن ہونی چاہیے۔۔۔ مطیع الرحمٰن ذرا ادھر آ کر یہ ٹوپی تو پہن کر دکھاؤ"

مطیع جو ایک کونے میں کھڑا ایک قدیم بندوق کو غور سے دیکھ رہا تھا ہماری جانب آ گیا اور نظامی صاحب نے جھانجھروں والی ٹوپی اسے پہنا دی۔ اسے کچھ علم نہ تھا کہ اس ٹوپی کی نوعیت کیا ہے چنانچہ وہ ٹوپی پہن کر مسکرانے لگا۔

"تارڑ صاحب" نظامی صاحب نے سر ہلایا تو ان کی ٹوپی کے سفید پھندنے ٹیبل ٹینس کی گیندوں کی طرح اچھلے۔ "ذرا میری دلہن تو ملاحظہ کریں عینک والی اور مونچھوں والی۔ تصویر اتارو جی"

اور یہ تصویر آج بھی اس لمحے کی یاد دلاتی ہے۔ نظامی صاحب دولہا کی ٹوپی اوڑھے ہوئے اور مطیع دلہن کی ٹوپی میں اپنی مونچھوں سمیت۔

"اب آپ دونوں اپنے ہنی مون پر جائیں گے"۔ خواجہ صاحب ہنستے ہوئے کہنے لگے۔۔۔ "گیسٹ ہاؤس میں آپ کے لیے بکنگ ہو چکی ہے۔ آپ آرام کیجیے اور ٹھیک بارہ بجے ہم آپ کو پک کر لیں گے اور پھر لے چلیں گے۔"

"کہاں؟"

"جہاں ہماری مرضی ہوگی"



# صد پارہ گولڈ

دھوپ میں تیزی تھی۔ کالج کے کمپاؤنڈ میں سفیدے کے چند درخت ابھی حال ہی میں لگائے گئے تھے اور ان کے سوا ہر سو ریت تھی جو اب تکلنی تھی۔ سکردو بازار خاصا طویل تھا۔ بائیں ہاتھ پر ایک بنجر پہاڑی کے اوپر سکردو کے قلعے کی دیوار دکھائی دے رہی تھی۔ بازار میں ہمیں ہمالین مراتھن میں حصہ لینے والی چند میمیں دکھائی دیں تو نظامی صاحب نے جیپ ڈرائیور کی طرف دیکھ کہا "اندازہ کرو" اور وہ غریب کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اخلاقاً مسکرا دیا۔

سکردو کے سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں ایک پر فضا اور رشک چمن قسم کا کمرہ ہمارا منتظر تھا۔ رشک چمن اس لیے کہ اس کے چھوٹے سے باغ میں سیبوں اور خوبانیوں کے درخت تھے اور ان میں سے سیب کے درخت کی ایک ٹہنی کھڑکی کھولنے سے کمرے کے اندر آ جاتی تھی۔

"واہ جی تارڑ صاحب سبحان اللہ کیا پر بہار جگہ ہے۔ کمرے کے اندر سیب کی شاخ الجھی ہوئی لٹ کی طرح پریشان ہوتی ہے" مطیع کا موڈ شاعرانہ ہو گیا۔

"اندازہ کرو تارڑ صاحب خوبانی کی شاخ کو سیب کی شاخ کہہ رہا ہے" ایک چوڑی مسکراہٹ نظامی صاحب کی چہرے پر سجی تھی۔

"خوبانی؟" مطیع کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے عینک اتار کر شیشے صاف کیے اور پھر غور سے شاخ کو دیکھا "نہیں جی' سیب ہے"

"میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ خوبانی ہے" نظامی صاحب نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے قدرے سنجیدگی سے کہا "یہ دیکھو خوبانیاں ساتھ لگی ہیں"

"یہ سیب ہیں جو ابھی کچے ہیں" مطیع نے ایک مصنوعی حقارت سے کہا "آپ تربوز کھانے والے ہیں آپ کو کیا پتا کہ سیب کی ٹہنی کیسی ہوتی ہے۔ ہم مانسہرہ کے

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



رہنے والوں سے پوچھئے۔۔۔"

اس تبادلۂ خیال کے بعد ہمارے سفر کا پہلا جھگڑا ہوا۔۔۔ اور یہ آخری نہیں تھا ۔۔۔ سفر ایک ایسی چھلنی ہوتی ہے جس پر انسان کی تمام تر کمینگی اوپر آ جاتی ہے۔ اس کے تمام خول اتر جاتے ہیں اور وہ قدرے اوریجنل ہو جاتا ہے۔۔۔ اس سفر کے دوران ہم تینوں ایک دوسرے کے ساتھ کسی نہ کسی فضول اور بے مقصد مسئلے پر الجھ جاتے۔۔۔

مطیع اور نظامی صاحب تقریباً پانچ منٹ تک ایک دوسرے کو گھورتے رہے اور لگتا تھا کہ ان کے نتھنوں سے دھواں نکل رہا ہے اور پھر نظامی صاحب مسکرا کر کہنے لگے "یار تو ٹھیک کہتا ہے یہ سیب کی ٹہنی ہے"

مطیع نے اٹھ کر نظامی صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ہنستے ہوئے کہنے لگا "نہیں میرا خیال ہے یہ خوبانی ہی ہے"

"نظامی صاحب اٹھے اور پہلی بار کمرے کا تفصیلی معائنہ کیا۔ غسل خانے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو خوش ہو گئے" "میں ایک اور تاری نہ لگا لوں؟"

"نہیں!"

"چلو نہ سہی" نظامی صاحب فوراً مان گئے حالانکہ میرا خیال تھا وہ کہیں گے "میں مر جاؤں گا لیکن ایک اور تاری ضرور لگاؤں گا۔"

"تارڑ صاحب یہ تو ہو گیا سکردو۔" نظامی صاحب اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر کسی بانکی نار کی طرح کھڑے ہو گئے۔۔۔ ایک ایسی بانکی نار جو قدرے فربہ ہو چکی ہو "آپ کدھر لے کر جانا ہے ہمیں؟"

"ہاں جی سفر کی منصوبہ بندی ہونی چاہئے۔۔۔" مطیع بھی قریب آ گیا "پہلے ہم جائیں گے دیوسائی میدان ۔۔۔ اسے عبور کر کے استور اور وہاں سے وادیٔ روپل کے راستے نانگا پربت کے بیس کیمپ' کیوں تارڑ صاحب؟"

"منصوبہ تو یہی ہے۔۔۔ ابھی خواجہ صاحب تشریف لائیں گے تو ان سے درخواست کریں گے کہ ہمیں کل صبح جھیل صدپارہ کے پہلو میں سے اٹھتے ہوئے اس کچے راستے پر چھوڑ آئیں جو دیوسائی کو جاتا ہے۔۔۔"

"ویسے کیا واقعی وہاں ریچھ ہوتے ہیں؟" نظامی نے پوچھا۔

"نظامی صاحب" مطیع نے ان کے کندھے پر ایک زوردار دھپ لگائی "آپ کے ہوتے ہوئے ریچھوں کی مجال ہے کہ ہمارے قریب بھی آئیں"



نظامی صاحب نے سر ہلایا۔ "اندازہ کرو بزرگوں سے مذاق کرتا ہے۔۔۔"

پورے بارہ بجے خواجہ صاحب جیپ کے ساتھ نازل ہو گئے۔ "چلیں جی؟"

"کہاں؟"

"جہاں ہم لے چلیں"

سکردو کی دھوپ اثر کرتی تھی۔ جیپ پاپلر کے درختوں کے نیچے سے گزرتی تو ہوا خنک ہو جاتی اور کپکپی سی آتی۔ مجھے سکردو کے پھیلاؤ نے متاثر کیا۔ سندھ شہر سے ذرا ہٹ کر تھا اور کتنے اطمینان اور ٹھہراؤ سے ایک وسیع رقبے میں پھیلتا تھا۔ تیز ہوا اس کے کناروں کی ریت پر سرسراتی تھی اور اس کے پانیوں پر تیزی سے تیرتی تھی۔ ایک چھوٹا سا راستہ الگ ہو کر اوپر جاتا تھا اور اس کے آغاز پر "کے ٹو موٹل" کا بورڈ آویزاں تھا۔ میرا چھوٹا بھائی لیفٹیننٹ کرنل مبشر بھی ایک آوارہ گرد اور کوہ پیما ہے' وہ اب تک ایک امریکی اور ایک اطالوی کوہ پیما ٹیم کے ساتھ رابطہ افسر کے طور پر کے ٹو اور ترچ میر کے بیس کیمپ تک جا چکا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ بھائی جان سکردو میں کے ٹو موٹل کی فضا آوارہ گرد لوگوں کے لیے باقاعدہ ہیجان خیز ہے۔ کوہ پیمائی اور مہم جوئی کے جو کردار اس موٹل میں ملتے ہیں' کہیں اور نہیں ملتے' وہاں کی ہوا میں ایڈونچر ہے' وہاں جھانک ضرور لیجئے گا۔

"کیا ہم تھوڑی دیر کے لیے کے ٹو موٹل میں جھانک سکتے ہیں؟" میں نے خواجہ صاحب کے کان میں سرگوشی کی۔

"کیوں کیا وہاں حسینائیں رہتی ہیں؟" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔۔۔ "کیوں نہیں جھانک سکتے ۔۔۔" انہوں نے ڈرائیور کو اوپر جانے کا اشارہ کیا۔

کچھ برس پیشتر ایک واقف کار رات کے وقت سکردو کے "کے ٹو موٹل" میں پہنچے۔ معلوم ہوا کہ موٹل کے برآمدوں میں بھی جگہ نہیں ہے۔ اب اس وقت کہاں مارے مارے پھرتے اور اگر پھرتے بھی تو سکردو جیسے شہر میں قیام گاہیں ذرا کم ہی ہیں۔ ان کے پاس خیمہ تھا' منیجر سے پوچھا کہ کیا موٹل کے مختصر باغیچے میں خیمہ لگایا جا سکتا ہے۔ انہیں اس شرط پر اجازت ملی کہ وہ موٹل کے غسل خانے استعمال نہیں کریں گے کیونکہ ان کے سامنے پیٹ پر ہاتھ رکھے ان کوہ پیماؤں کی قطاریں لگی رہتی تھیں جنہیں سکردو پہنچتے ہی ڈائریا لاحق ہو چکا تھا۔ ان واقف کار کو بتایا گیا تھا کہ دریائے سندھ "کے ٹو موٹل" کے ساتھ ہی بہتا ہے۔ انہوں نے سوچا ٹھیک ہے' کوئی غسل خانہ نہ سہی' دریائے سندھ جو ساتھ ہے اور جس کی آواز انہیں تاریکی میں آ رہی تھی

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



چنانچہ وہ خیمہ زن ہو گئے۔ اگلی سویر بیدار ہوئے' منہ ہاتھ دھونے اور دیگر ضروریات سے فارغ ہونے کے لیے کندھے پر تولیہ ڈالے ہاتھ میں دانتوں کا برش تھامے خیمے سے باہر نکلے اور پوچھا دریائے سندھ کہاں ہے؟ بتایا گیا کہ ذرا ادھر جھانک کر دیکھئے انہوں نے جھانکا تو ایک گہری کھڈ کے نیچے بہت نیچے دریائے سندھ اطمینان سے بہتا تھا۔ اور وہاں تک پہنچنے کے لیے نائیلون کا ایک رسہ' چٹانوں میں گاڑنے والی میخیں اور ایک بہت بڑا حوصلہ درکار تھا۔ چنانچہ انہوں نے دانت صاف کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

کے ٹو موٹل واقعی وہی کچھ تھا جو مشرف نے بتایا تھا۔ وہاں جتنے مسافر تھے وہ آس پاس نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ ان کی نگاہیں ان چوٹیوں پر تھیں جنہیں سر کرنے کی خواہش میں وہ گھروں سے نکلے تھے۔ ان کے لباس اور حلیے مختلف تھے' جیسے وہ کسی اور سیارے کی مخلوق ہوں' زمین کے نہ ہوں' اور یہ حقیقت ہے کہ آوارہ گرد اور کوہ پیما اس سیارے کی مخلوق نہیں ہوتے۔ کیونکہ زمینی مخلوق کی طرح ان کی زندگی کا جواز مالی منفعت کے پیمانے میں تولا نہیں جا سکتا.... ان کے پاس اپنی اس "بے مصرف" زندگی کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔ موٹل کے باغیچے میں بھی خیمے لگے ہوئے تھے اور دریائے سندھ واقعی نیچے تھا' بہت نیچے اور وہاں جھانکنا بھی خطرناک تھا۔ مہم جوئی کی اس رونق میں سب سے زیادہ بھاگ دوڑ وہ پورٹر اور گائیڈ کر رہے تھے جو کسی نہ کسی مہم کے ساتھ وابستہ ہونے کی خواہش میں یہاں آئے تھے۔ سردیوں میں شمال سرد ہوتا ہے اور یہاں کے باشندے سر نیچا کر کے وہ موسم گزارتے ہیں۔ ٹیلیویژن پر ایک ڈرائیور نے ایک روز مجھ سے کہا کہ میں اس کے صاحب سے سفارش کر دوں کہ اسے دس روز کی چھٹی دے دی جائے کیونکہ اسے سکردو کے قریب ایک پہاڑی قصبے میں جا کر اپنے گھر والوں کے ہمراہ سردیوں کے لیے لکڑیوں کا بندوبست کرنا ہے اور اگر وہ بروقت پورے موسم کے لیے لکڑیاں جمع نہ کر سکا تو یقیناً اس کے خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد شدید موسم کا شکار ہو جائے گا.... سردیوں کے بعد جب موسم کھلتا ہے تو ان علاقوں میں کوہ پیمائی اور ٹریکنگ کے لیے سیاح آنے لگتے ہیں اور انہیں سامان اٹھانے کے لیے پورٹر اور راستہ دکھانے کے لیے گائیڈ' اور کھانا پکانے کے لیے باورچی درکار ہوتے ہیں اور اکثر بلتی ان تینوں کاموں کے ایکسپرٹ ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ گائیڈ کا کام صرف چند لوگ ہی سرانجام دیں بلکہ بے شمار طالب علم اور اساتذہ بھی بڑی خوشی سے اور بڑی چاہت سے اس قسم کے کام تلاش کرتے ہیں'



مفت کی سیر اور مناسب روزی کا بھی بندوبست .... ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ چونکہ ہنزہ اور نگر کی نسبت بلند ترین پہاڑ اور گلیشیر بلتستان میں زیادہ ہیں اس لیے کوہ پیماؤں کا رخ بھی ادھر ہی کو ہوتا ہے۔ یوں ہنزہ اور نگر کے پورٹر اور گائیڈ بھی موسم کے آغاز میں سکردو پر نظر رکھنے لگتے ہیں۔ موٹل کے باغیچے میں چند کوہ پیما ایک ایسے شخص سے محو گفتگو تھے جس کی شکل مجھے جانی پہچانی لگی.... دو برس پیشتر گلگت سے ہنزہ جاتے ہوئے ویگن میں اس کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی اور پھر اس نے مجھے اور سلجوق کو پسو کے گاؤں میں ایک شب اپنے گھر چائے کے لیے مدعو کیا تھا اور اس شب پسو گلیشیر سے آتی ہوئی ہوا میں ایک وحشت ناک تندی تھی جو دل کو ڈراتی تھی اور ہم گیس کی روشنی میں اس کے کوہ پیمائی کے تجربوں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے تھے۔ وہ ایک پورٹر اور کک تھا اور اس کا نام ہنر بیگ تھا۔

"ہنر بیگ" میں نے ایک پرمسرت آواز میں اسے پکارا۔ وہ چونکا' میری جانب آیا اور اس کے لکڑی ایسے بے تاثر چہرے پر کچھ نہ تھا اور پھر یکدم جیسے وہ چہرہ اس کی مسکراہٹ سے موم ہونے لگا۔ "صاحب .... آپ؟ آپ سکردو میں" وہ بے یقینی سے سر جھٹکتا تھا اور کہتا تھا "صاحب آپ یہاں سکردو میں...."

"جس طرح تم یہاں سکردو میں اسی طرح ہم یہاں سکردو میں ...." میں نے کہا۔

"میں تو صاحب روزگار کی تلاش میں آیا ہوں۔ اس ایکسپی ڈیشن والوں سے بات ہو رہی ہے شاید روزی کا کوئی بندوبست ہو جائے.... ہاں سلجوق کہاں ہے؟" اس نے یکدم چونک کر کہا۔

"وہ نہیں آیا ———"

"صاحب اس کو میرا سلام بولنا .... اور ادھر ہماری طرف پسو میں آؤ تو ضرور ملنا صاحب...."

ہنر بیگ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہنے لگا۔ "اور صاحب شمشال کب چلنا ہے؟ آپ میرے ساتھ جاؤ گے؟"

"شمشال بہت مشکل ہے ہنر بیگ اور صاحب ذرا اب بوڑھا ہو رہا ہے"

"نہیں صاحب" اس نے پھر سر جھٹکا۔

"ہاں صاحب" میں نے کہا اور پھر اس سے اجازت چاہی' اس وعدے کے ساتھ کہ کبھی نہ کبھی ہم دونوں وادئ شمشال کو جائیں گے۔

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



مطیع نے اس دوران ایک کوہ پیما کو قابو کر لیا تھا اور اس کا ہاتھ دیکھ رہا تھا' کوہ پیما نہایت انہماک سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

چند کوہ پیما خواتین قدرے مختصر لباس میں ہوٹل کے اندر سے آئیں۔ نظامی صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور خواجہ صاحب سے کہنے لگے۔ "بادشاہو ہمیں کہاں ٹھہرا دیا ہے سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں وہاں تو کمرے کے اندر صرف سیبوں کی ایک ٹہنی آتی ہے یہاں تو پورے کے پورے درخت ہیں ـــــ"

"اندازہ کرو" خواجہ صاحب نے نہایت سرسری انداز میں کہا۔ اس پر نظامی صاحب نے انہیں گھورا کیونکہ ان کا تکیہ کلام انہی پر استعمال ہو گیا تھا۔

ہوٹل کے ڈائننگ روم میں بھی وہی کیفیت تھی۔ کونوں میں رک سیک اور کوہ پیمائی کا سامان رکھا ہوا تھا اور سیاح میزوں پر نقشے پھیلائے ان پر جھکے ہوئے تھے۔ اور ان کی خوراک ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ مطیع ہمیں تلاش کرتا ہوا اندر آ گیا' وہ پریشان دکھائی دیتا تھا۔

"خواجہ صاحب ڈرائیور سے کہئے کہ مجھے تھوڑی دیر کے لیے گیسٹ ہاؤس لے چلے....."

"کیوں خیریت؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے آج صبح شوگر کا انجکشن نہیں لگایا تھا اس لیے طبیعت بے حد خراب ہو رہی ہے۔ "شوگر کا انجکشن؟" نظامی صاحب فکرمند ہو گئے "خود لگاتے ہو؟"

"ہاں...." مطیع کہنے لگا۔ "آج صبح سکردو آنے کی ایکسائٹ منٹ میں بھول گیا اور اب طبیعت کچھ خراب ہے"

خواجہ صاحب نے ڈرائیور کو ہدایات دیں اور مطیع گیسٹ ہاؤس چلا گیا۔

"اندازہ کرو۔ اسے شوگر کا مرض ہے۔ روز ٹیکا لگا کر چلتا پھرتا ہے اور ہمارے ساتھ کوہ پیمائی کرنے آ گیا ہے"

"نظامی صاحب ....یہ تو سارا پروگرام اپ سیٹ ہو جائے گا۔ پہاڑوں کی بلندیوں کے لیے صحت مند ہونا شرط اول ہے۔ یہ اگر لاہور سے روانگی کے وقت بتا دیتا تو ہم اسے ساتھ ہی نہ لاتے...."

مطیع جب واپس آیا تو وہ ہشاش بشاش تھا۔ "لاہور سے روانگی کے وقت بتا دیتا کہ میں انجکشن کے بغیر ایک دن نہیں نکال سکتا تو آپ مجھے ساتھ ہی نہ لاتے' اس لیے میں نے اپنے مرض کو ذرا خفیہ رکھا.... ویسے فکرمندی کی کوئی بات نہیں ٹیکے



میرے پاس ہیں اور سرنجیں بھی' ان کی موجودگی میں' میں آپ کی طرح صحت مند ہوں۔"

"تو آئیے اب چلتے ہیں" خواجہ صاحب بولے۔

"کدھر؟"

"جدھر ہماری مرضی"

ہم ایک مرتبہ پھر سکردو سے باہر نکل کر ائیرپورٹ کی جانب رواں تھے... پھر ایک سنگ میل پر "گلگت" لکھا نظر آیا۔

"ہم گلگت جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اسی طرف جا رہے ہیں" خواجہ صاحب نے پھر خفیہ انداز میں کہا۔

راستہ دور تک ہموار تھا اور آس پاس سفیدے کے درخت اس جہاں سے اٹھتے تھے۔ دائیں جانب درختوں کے بیچ میں سے ریت کے ٹیلے اور خشک پہاڑ نظر آتے تھے اور بائیں طرف کہیں کہیں مکان تھے اور برفلی چوٹیوں پر تھے۔ ان مکانوں کے قریب مجھے ایک خستہ حویلی نظر آئی جس کے چوبی اور منقش دروازے گرنے کو تھے اور کچی دیواریں ڈھے رہی تھیں۔ پھر راستہ ذرا اوپر ہونے لگا۔ ہم پکی سڑک چھوڑ کر ایک ذیلی راستے پر مڑ گئے۔ ایک چھوٹی سی ندی پیچھے آ رہی تھی۔ ایک چینی طرز کا آرائشی دروازہ نظر آیا جس پر "شنگریلا" لکھا تھا اور اس کے اندر جھیل کچورا قید تھی۔ ہم خصوصی اجازت سے اندر گئے کیونکہ ادھر صرف ان لوگوں کا داخلہ ہو سکتا تھا جو جھیل کچورا کے کنارے آباد اس چھوٹے سے قصبے میں قیام کرتے تھے جسے شنگریلا ٹورسٹ ریسارٹ کہا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ شنگریلا والوں نے اس جھیل کو پورے پاکستان میں روشناس کیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے اس جھیل کو صرف اپنے گاہکوں کے لیے قید کر لیا۔ چنانچہ ہم اپنے ہی وطن کے اس حصے میں قدرے خوفزدہ اور مجرم ہو کر چلتے تھے کیونکہ ہماری جانب ہوٹل کے ملازمین شک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور گاہک حضرات ذرا ایک بلند سطح سے ہماری جانب حقارت سے نظر کرتے تھے کہ یہ کون ہیں جو ہماری اس جنت میں یوں دندناتے پھرتے ہیں۔ میں جب اسی روز جھیل صد پارہ گیا تو میں نے بہت بہتر اور آزاد محسوس کیا۔ خدا کرے وہ جھیل ہمیشہ آزاد رہے۔

جھیل کچورا نے مجھے ذرا حیران بھی کیا۔ میں نے اس کی جو تصاویر دیکھی تھیں

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



ان میں وہ کچھ تو دکھائی نہ دیا جو یہاں میرے سامنے آیا۔ ایک تو یہاں کا موسم تھا اور کیا گل و گلزار موسم تھا۔ اور دوسرے اس کے پانی تھے جو اتنے صاف تھے کہ کنارے سے اندر تک' بہت دور تک جھیل کی تہہ نظر آتی تھی۔ کئی بڑے پتھر جھیل میں یوں دکھائی دیتے تھے جیسے ان کے آس پاس شیشہ منجمد ہو گیا ہو۔ اور یہ پانی یوں شفاف تھے کہ جھیل کچورا تازہ پانیوں کی جھیل ہے۔ اس کی تہہ سے چشمے پھوٹتے ہیں اور یہ بارش یا گلیشیئر کے پانی کی محتاج نہیں۔ اور ذرا غور سے دیکھئے تو جھیل کے اندر وہ چشمے چلتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

"چلیں؟" خواجہ صاحب نے پھر پوچھا

"کہاں؟"

"جہاں ہم لے چلیں"

وہ ہمیں جھیل کچورا کے دوسرے کنارے پر لے گئے۔ یہاں "تبت موٹل" کی عمارت تھی۔ ڈائننگ روم میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ بے شمار نوجوان چہرے ہماری طرف دیکھتے تھے۔ ان میں سے ایک باریش صاحب آگے آئے۔ "میرا نام یوسف حسین آبادی ہے۔ محکمہ تعلیم میں ہوں اور یہ میرے اساتذہ اور طالب علم ہیں"

یوسف صاحب کے نام سے میں اچھی طرح آگاہ تھا۔ وہ بلتستان کے معروف دانشور اور ماہر تعلیم ہیں۔ انہوں نے ہمارے لیے لنچ کا انتظام کر رکھا تھا۔ یہیں پر عباس کاظمی سے بھی ملاقات ہوئی۔ کاظمی "بلتستان کاز" کے بہت بڑے مبلغ ہیں۔ اپنے خطے کی تاریخ اور جغرافیائی اہمیت کو دوسروں تک پہنچانا ان کا مقصد حیات ہے۔ ان کے بلتی لوک گیتوں کا اردو ترجمہ کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

"تبت موٹل" کے لان سے جھیل اور دوسرے کنارے پر واقع "شنگریلا" بے حد دیدہ زیب لگتے ہیں اور یہاں جو گلاب تھے اگرچہ پنجاب سے گئے تھے لیکن ان کا سائز اتنا بڑا تھا کہ شاخوں سے وہ سنبھلتے نہ تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم جھیل کچورا کے کناروں سے اوپر کو جانے والے کچے راستے پر چلنے لگے۔ ایک پر شور اور وحشت ناک پانیوں والی ندی کے پار' بلندی پر کچورا کا گاؤں تھا اور کچورا جھیل کا منظر یہاں سے بھی دل فریب تھا اور اس کے پس منظر میں وادی سکردو کی وسعت اور برف پوش پہاڑ تھے۔ ایک مکان کے برآمدے میں دو بوڑھے رسے بن رہے تھے۔ مجھے دیکھ



کر وہ مسکرائے اور میں رک گیا۔ وہ اردو بہت کم سمجھتے تھے۔

"آپ اوپر جھیل جاتا صاحب۔۔۔" ان میں سے ایک جو بالکل بے دانت تھا پوپلے منہ سے سوال کرتا تھا۔

"اوپر بھی جھیل ہے؟"

"ہاں۔۔۔" دوسرے نے سر ہلایا "چھوٹا کچورا اوپر ۔۔۔۔۔۔"

"اور ادھر سے دیوسائی کو بھی راستہ جاتا ہے؟"

"ہاں۔۔۔دیوسائی بہت سردی۔۔۔برف۔۔۔ریچھ۔۔۔ آپ جاتا؟"

"ہاں ۔۔۔ میں اور یہ۔۔۔" میں نے نظامی اور مطیع کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "میرا دوست جاتا"

وہ دونوں ہنسنے لگے اور نظامی کو دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگے "یہ نہیں جاتا یہ ۔۔۔" انہوں نے بازو پھیلا کر بتایا کہ یہ بہت موٹا ہے

ہم واپس نیچے آئے تو میں نے دیکھا کہ تبت موٹل کے ساتھ چند خیمے استادہ ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ خیمے بھی کرائے پر اٹھائے جاتے ہیں اور بہت جی چاہا کہ ہم بھی انہی میں اٹھ جائیں۔

"آپ تو بتا دیجئے کہ ہم کدھر جائیں گے وارڈن صاحب؟" میں نے خواجہ صاحب سے پوچھا۔

"جھیل صدپارہ ۔۔۔ سکردو کے دوسری جانب ۔۔۔ آپ کے دیوسائی کے دامن میں"

اور اسی لمحے سامنے وادی سکردو میں بگولے اٹھے اور تیز ہوا چلنے لگی اور یہ ہوا ہم تک دیکھتے دیکھتے آ گئی اور اس کی ریت آلود شدت ہماری آنکھوں میں چبھنے لگی۔

خواجہ صاحب نے اپنا لمبا بازو اٹھا کر انگلی سیدھی کی۔ "آپ دریائے سندھ کے بیچ ابھرنے والے ریتلے ٹاپوؤں کو دیکھ رہے ہیں"۔

"جی ہاں۔۔۔" میں نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔

"دوپہر کے وقت گرمی کی شدت سے ریت تپتی ہے۔ ہوا کا دباؤ کم ہو جاتا ہے اور پھر آپ کے دیوسائی سے خنک ہوا اترتی ہے اور یوں بگولے اٹھنے لگتے ہیں"

خواجہ صاحب نے جب بھی دیوسائی کہا تو "آپ کا دیوسائی" کہا اور واقعی اس ریتلی ہوا میں ٹھنڈک گھلی ہوئی تھی۔

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



ہم کچورا گاؤں سے نیچے اترے' جھیل کنارے ایک نیم دائرے کی صورت ہماری جیپ دھول اڑاتی چلی اور پھر سکردو جانے والی سڑک پر ہموار ہو گئی۔ دور سے سفیدے کے درختوں کے سائے میں وہ خستہ حویلی پھر نظر آئی جس کی کچی دیواریں ڈھے جانے کو تھیں۔ خواجہ صاحب نے اشارہ کیا اور جیپ رک گئی۔

ایک کچے بلند پلیٹ فارم پر ایک خستہ حال عمارت اپنے آخری دنوں میں تھی۔ اس کا عالی شان منقش دروازہ مقفل تھا۔ اس دروازے کے نقش اور اوپر کی پرپیچ جالیاں کسی قدیم ہاتھ نے عقیدت سے تراشی تھیں۔ کھڑکیاں ٹوٹ کر گرنے کو تھیں اور کھلی تھیں۔ مقفل دروازے کو دیکھنے سے اندر کا منظر ایک لکیر کی صورت دکھائی دیا۔ وہاں نیم تاریکی تھی اور جہاں جہاں سے کھڑکیاں اور روشندان ٹوٹ چکے تھے' وہاں سے دھوپ کی تیزی اندر آ کر اس عبادت گاہ کے آخری لمحوں میں مخل ہوتی تھی۔ گیلریاں اور ساری چھت لکڑی کی تھی۔ درجنوں بلند ستون اس خانقاہ کی چھت کے بوجھ تلے جھکے جاتے تھے۔ فرش پر چند چٹائیاں تھیں اور طاقوں میں بجھے ہوئے دیئے اور ان کی سیاہی تھی۔ یہ ایک عظیم اور شاندار ورثہ تھا جو مٹی ہو رہا تھا۔ بلتستان کے مختلف قصبوں میں بے شمار ایسی خانقاہیں ہیں جو بے توجگی کا شکار ہیں۔ ان کا طرز تعمیر اور خصوصی طور پر لکڑی کا کام بے مثال ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کی اندر ایک ایسا ماحول ہے' روشنی کے ایسے زاویے ہیں جو بنائے نہ بنیں۔ "ایسی پرکشش اور شاندار یادگار کو تباہ ہونے کے لیے کیوں چھوڑ دیا گیا ہے.... اس کی مرمت کیوں نہیں کی جاتی؟"

"یہی باتیں غور کرنے کی ہیں" ریڈیو کے کشفی صاحب بولے "یہاں کوئی ادارہ کوئی محکمہ ایسا نہیں جو ان عمارتوں کو بحال کرے اور ان کی عظمت رفتہ کی جھلک واپس لے آئے.... یہ بلتستان کے طرز تعمیر اور ثقافت کی نمائندہ ہیں اور ان کے خاتمے پر ہمارے ہاں کچھ بھی باقی نہ بچے گا"

"کبھی کبھار خانقاہ کا دروازہ ہوا کے زور سے پھولتا تھا' اس کے کواڑ جدا ہوتے تھے اور اندر کی ٹھنڈک باہر کو آتی تھی۔

جب ہماری جیپ سکردو کے بازار میں سے گزری تو دھوپ صرف قلعے کی خشک پہاڑی کو روشن کرتی تھی اور شہر سائے میں تھا اور کسی دور کی وادی سے آیا ہوا ایک لداخی خدوخال کا خاندان ایک دوکان سے اشیائے خوردنی خریدنے کے دوران اس



جیپ کو دیکھتا تھا جو بازار میں سے گزر رہی تھی اور جس میں تین سیاح اور ان کے دوست جھیل صدپارہ کو جاتے تھے۔

سکردو کی آبادی یک لخت ختم ہو گئی اور سڑک نے پہاڑوں کے اندر جانے کا قصد کیا۔ دور ایک نالہ بہتا تھا اور خواجہ صاحب نے اس طرف اشارہ کر کے بتایا کہ ادھر وہ مشہور چٹان ہے جس پر درجنوں مہاتما بدھ کندہ ہیں اور ہم ان کی زیارت واپسی پر کریں گے۔ تھوڑی دیر بعد ہم پہاڑوں کے اندر تھے اور اب اس نالے کے ساتھ اوپر جاتے تھے جو اتنا تیز اور اتنا سفید اور پرشور اور چھینٹے اڑانے والا تھا جیسے شیکر کے اندر ملک شیک تیز اور چھینٹے اڑانے والا ہوتا ہے۔ اور شور میں بات بھی سنائی کم ہی دیتی تھی اور اسی لیے خواجہ صاحب نے قدرے بلند آواز میں کہا اور مجھے چھیڑتے ہوئے کہا کہ یہ نالہ آپ کے دیوسائی سے آ رہا ہے۔

اور جب انہوں نے یہ کہا کہ یہ نالہ آپ کے دیوسائی سے آ رہا ہے تب میں نے اس کے بے چین' نیلے اور سفید پانیوں میں پورے دیوسائی کو نیچے اترتے دیکھا' ان میں گھلتے دیکھا اور وہ بلندی اور ٹھنڈک میرے اندر گئی' جہاں سے یہ آتا تھا اور کہتا تھا کہ اے گندمی رنگ والے درمیانی عمر کے ست پڑتے اور جسمانی طور پر بدنما ہوتے سیاح' میں ادھر سے آیا ہوں جدھر تو جانے کی خواہش رکھتا ہے۔ تجھ میں لالچ بہت ہے' تو اپنے اختیار سے باہر ہو کر وہ کچھ دیکھنا چاہتا ہے جو تو دیکھ نہیں سکتا۔ تیری آنکھوں میں پہاڑوں جھیلوں اور بلند میدانوں کی ہوس ہے جو پوری نہیں ہو گی اور تو اس دنیا سے چلا جائے گا اور یہ ہوس باقی رہ جائے گی.... میں اسی دیوسائی سے آ رہا ہوں' جہاں تو جانے کی خواہش رکھتا ہے۔

پتہ نہیں کب نالہ ذرا پرے ہوا اور ہم اور ہماری جیپ اس خاموشی میں آ گئے جو صدپارہ کے آس پاس ٹھہری ہوئی تھی۔ جیپ رکی تو ہمارے بدن اور سوچ کا تسلسل سب کچھ ایک دھچکے کے ساتھ ختم ہو گیا اور خاموشی کی سائیں سائیں کانوں میں چلنے لگی۔

"پہلے ادھر...." خواجہ صاحب نے راستے سے نیچے اترتے ہوئے کہا۔ وہاں پتھروں کے نیچے سے پانی آ رہا تھا اور گھنی گھاس اور ریت میں سے بہتا ہوا ایک پتھر میں روپوش ہو جاتا تھا....

خواجہ صاحب نے پہلے آسمان کو دیکھا پھر پانی کو دیکھا پھر کھڑے ہو گئے' پھر

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



بیٹھ گئے اور بالآخر کبڑے سے ہو کر کہنے لگے۔ "اس زاویے سے ادھر دیکھیں ہم بھی اسی طرح ذرا کبڑے ہو کر جھکے تو چشمے کے پانی کے نیچے کی ریت ایک کیش والے دوپٹے کی طرح چم چم چمک رہی تھی۔

"صد پارہ گولڈ" خواجہ صاحب نے ڈرامائی انداز میں کہا "اس پانی میں سونے کی آمیزش ہے۔ جی بھر کے پیجئے کیونکہ یہ اپنے اندر بہت ساری سنہری خصوصیات رکھتا ہے ... ہر شے کو ہضم کر دیتا ہے اور بے شک سات آٹھ گلاس پی جائیے۔ طبیعت بوجھل نہیں ہو گی... اور یہ لیجئے گلاس "انہوں نے اپنے تھیلے میں سے ایک گلاس نکال کر مجھے تھما دیا جو وہ خصوصی طور پر ساتھ لائے تھے۔

سونے کا طلسم اور لالچ ہم سب میں موجود ہے اور ہمارے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہوئی اور ہم جھک جھک کر اس ریت کو مختلف زاویوں سے دیکھتے تھے جو کبھی تو ایسے لگتی جیسے کسی مزار کی چادر در موم بتیوں کی جھلملاہٹ میں رہ رہ کر چمکتی ہو اور کبھی دھوپ کی آخری کرنیں ان ذروں میں منتقل ہوتی جاتیں جو لالچ اور طلسم تھے۔ ہم نے یہ گولڈ واٹر پیا اور جی بھر کر اور گلاس بھر بھر کے پیا اور یہ حقیقت ہے کہ اس میں کچھ سنہری تاثیر تھی۔

نظامی صاحب کمر پر ہاتھ رکھ کر پانی کو ملاحظہ کر رہے تھے۔ وہ پانچ چھ گلاس پی چکے تھے اور اب مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ "میں تاں اس میں تاری لگانا چاہتا ہوں لیکن پانی کم ہے... بادشاہو ــــ اندازہ کرو سونے کے پانی میں نہانا بڑی بات ہے..."

جیپ سے اترتے ہوئے مطیع ذرا ایک پتھر کی طرف گیا تھا اور ہم سے الگ ہو گیا تھا اور اب پتلون کی بیلٹ پر ہاتھ رکھے خوش و خرم واپس آ رہا تھا "ہاں جی السلام علیکم! کیا ہو رہا ہے؟ آپ کیسے ہیں؟ بال بچوں کا کیا حال ہے؟..." مطیع کی یہ عادت ہے کہ وہ کسی بھی محفل میں یا گھر میں داخل ہو تو مسکراتا ہوا یہ فقرے سبق کی طرح فر فر سنا دیتا ہے۔

"وعلیکم السلام ..." نظامی صاحب نے اپنی سفید مونچھوں کو تاؤ دیا۔ "ہو یہ رہا ہے بادشاہو کہ اس پانی میں سونا ہے سونا ... ابھی ابھی تارڑ صاحب کو ایک ڈلی ملی ہے کوئی پانچ تولے اور چھ ماشے کی ..."

"نہیں..." مطیع کی بے یقینی کی مسکراہٹ پھیلی اور پھیلتی گئی۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور اس کے ہاتھ پاؤں کچھ عجیب طریقے سے ہلنے لگے۔ مجھے شائبہ ہوا کہ



اس پر شوگر کا حملہ ہو گیا ہے لیکن یہ سونے کا حملہ تھا۔

"ہاں جی..." خواجہ صاحب مطیع کے ردعمل سے لطف اندوز ہوتے ہوئے شرارت سے بولے۔ "یہ صد پارہ گولڈ ہے اور ذرا پانی تو دیکھئے"

مطیع نے جب جھک کر پانی کی تہہ کو دیکھا۔ پھر چلو میں پانی لے کر اس میں تیرتے سنہری ذروں کو دیکھا تو وہ ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا۔ وہ ہم سے الگ ہو کر اب ایک ایسی وادی میں تھا' جہاں سنہری ندیاں تھیں اور سونے کی ڈلیاں پانی میں بہتی ہوئی اس کے قدموں میں آ کر ڈھیر ہوتی تھیں۔ "خواجہ صاحب یہ پانی کہاں سے آتا ہے؟ ادھر چٹان کے نیچے سے؟ تو یقیناً چٹان کے اندر کہیں سونے کی کوئی بہت بڑی کان ہو گی۔ شاید پورا پہاڑ ہو۔ ادھر اگر کھدائی کی جائے یا پانی جدھر سے آ رہا ہے ادھر کسی شخص کو بھیجا جائے جو ریکتا ہوا..."

"یہ اب فضول ہو گیا ہے ہمارے کام کا نہیں رہا۔" نظامی صاحب افسوسناک لہجے میں سر جھٹک کر بولے۔

مطیع کو کچھ پرواہ نہ تھی کہ کون کیا کہہ رہا ہے' وہ اپنی سنہری دنیا میں گم تھا۔ "اس پانی کا تجزیہ ہونا چاہئے کہ اس میں کتنا سونا ہے۔ کسی کے پاس بوتل ہے؟ میں اس پانی کو ساتھ لے جاؤں گا... نہیں تو کوئی پلاسٹک کا لفافہ ہے یہ ریت تو ضرور لے جاؤں گا..."

"جھیل دیکھ لیں؟" میں نے پوچھا۔

"آپ لوگ چلیں میں آتا ہوں" اس کی آنکھیں سونے کے پانی پر رکھی ہوئی تھیں۔ ہم چشمے سے واپس سڑک پر آئے اور پھر جھیل کی جانب اترنے لگے۔ ٹورزم والوں کا ہوٹل ابھی ویران پڑا تھا۔ کمروں میں قالین بچھے تھے لیکن بستر ناپید تھے۔

اور جب ہم نے صد پارہ کو دیکھا تو دھوپ اٹھ کر ان چوٹیوں پر ٹھہرتی تھی جن کے اوپر دیوسائی کا میدان تھا۔ جھیل کے کنارے کے ساتھ وہ راستہ دکھائی دے رہا تھا جو ادھر کو جاتا تھا جدھر ہم نے جانا تھا۔ شام کی ٹھنڈک اب بدن میں اترتی تھی اور پوری جھیل سائے میں تھی۔ اس جھیل میں ایک خوف تھا' کسی اور دنیا کی جھلک تھی۔ اس کے پانی وحشی ایسے تھے کہ جیسے بندھے ہوئے ہوں لیکن پھنکارتے ہوں۔

جھیل کنارے ایک چوکیدار نے ایک خیمہ نصب کر کے سیاحوں کے لیے مناسب چائے پانی کا بندوبست کر رکھا تھا۔ ہم چائے پینے کے لیے گھاس پر بیٹھ گئے۔

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



مطیع آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی۔

"چائے پیو۔" نظامی نے کہا۔

"میں پانی پی کر آیا ہوں۔ سونے کا پانی" مطیع نے دیکھا کہ ہم زیر لب مسکرا رہے ہیں۔ "مجھے معلوم ہے کہ آپ میری حرکات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں لیکن میں کیا کروں.... میں نے زندگی میں پہلی بار سونا دیکھا ہے.... اور جناب ایک مرتبہ آسٹریلیا میں ایک شخص اپنی بگھی پر جا رہا تھا اور گھوڑے کے پاؤں کے نیچے سونے کی ڈلی...." اس کے بعد مطیع نے ہمیں متعدد سنہری کہانیاں سنائیں کہ کس طرح ہم جیسے سیاحوں کو بے دھیانی میں یونہی بیٹھے بٹھائے سونا مل گیا اور وہ دولت مند ہو گئے۔ مطیع کا سنہری موڈ ہم پر بھی اثر انداز ہوا اور ہم بھی جھیل صدپارہ کے کنارے سنہری خواب دیکھنے لگے۔ میری سامنے جو پتھر ہیں شاید ان کے نیچے وہی چٹان ہو ——— سونے کی چٹان ———

جھیل کے پانیوں کی چھپاک چھپاک کے ساتھ ٹھنڈک بڑھتی گئی اور سایہ گہرا ہونے لگا.... دھوپ چوٹیوں سے رخصت ہو رہی تھی۔ خنکی نے ہمیں سنہری خوابوں سے بیدار کر دیا۔

صد پارہ کے اوپر دیوسائی کو چڑھتے راستے کے ساتھ پتھروں کے کچھ ڈھیر اور ایک دیوار نظر آتی تھی۔ صد پارہ سے مراد فصیل یا حفاظتی دیوار ہے اور یہاں قدیم راجے اپنی ریاست کی سرحد کی نشاندہی کے لیے دیوار یا فصیل بنواتے تھے۔ ۱۸۷۶ء میں راجاؤں نے آب پاشی کے لیے ایک چھوٹا سا بند تعمیر کروایا تھا جو ایک کہاوت کی مطابق انڈے کی سفیدی اور خاص قسم کی چکنی مٹی کو گوندھ کر بنایا گیا تھا اور اب تک قائم ہے۔

صد پارہ میں ہمیں شام ہو رہی تھی اور اس کے پانیوں کے اندر جیسے بے شمار قدیم واہمے اور خوف تھے جو کہتے تھے کہ کسی مسافر کو صدپارہ میں شام نہیں ہونی چاہیے ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بہتر یہی ہے کہ آپ ہمیں یہیں چھوڑ جائیں تاکہ ہم کل سویرے سویرے جھیل کے اوپر اس راستے پر چلنے لگیں جو دیوسائی کو جا رہا ہے۔" میں نے جیپ میں سوار ہوتے ہوئے خواجہ صاحب سے کہا اور اس امید سے کہا کہ وہ ہمیں یہاں ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔ چوکیدار جیپ تک ہمارے ساتھ آیا تھا اور وہ دیوسائی کا نام سن کر



میرے قریب آگیا۔ "صاحب دیوسائی تو بند ہے آپ تو وہاں نہیں جا سکتے۔"

"کیوں؟"

"ابھی برف نہیں پگھلی اور سردی بہت ہے۔ آج صبح تین لڑکے اوپر گئے تھے لیکن وہ واپس آئیں گے۔"

"خواجہ صاحب ——" میرا حلق سوکھنے لگا.... "کیا واقعی برف نہیں پگھلی؟ اب تو جولائی کے آخری دن ہیں۔"

خواجہ صاحب کے چہرے پر پہلی بار میں نے شرمندگی کے آثار دیکھے۔ "میں آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ واقعی آپ دیوسائی نہیں جا سکتے"

میں نے صدپارہ کی طرف دیکھا جیسے یہ ان تاریک پانیوں کا قصور ہو اور پھر اس راستے کی طرف دیکھا جو دیوسائی کو اٹھ رہا تھا۔ "لیکن کیوں نہیں جا سکتے؟"

"وہاں ابھی گہری دلدل ہے' کچھ ندیاں ناقابل عبور ہیں اور موسم بھی خراب ہے...."

"آپ مجھے اطلاع کر دیتے تو میں سکردو نہ آتا"

"اسی لیے تو اطلاع نہیں کی"

نیچے سے ایک تیز رفتار جیپ اوپر آئی۔ ہمارے قریب آکر رکی۔ اس میں سے حسن صدپارہ باہر آگئے اور ہم سب کو نظر انداز کرتے ہوئے خواجہ صاحب سے بغل گیر ہو گئے.... خواجہ صاحب نے انہیں میری جانب متوجہ کیا اور اپنی زبان میں کچھ کہا۔

"نہ جی آپ دیوسائی نہیں جا سکتے۔" وہ فوراً بولے۔ "میں اس سڑک کو تعمیر کر رہا ہوں جو اوپر دیوسائی تک جا رہی ہے۔ اور ادھر سخت سردی ہے اور برف ہے"

"کیا یہ ممکن ہے کہ ہم ٹاپ تک چلے جائیں اور اس میدان کو ایک نظر دیکھ کر واپس آجائیں؟"

"ممکن تو ہے جناب۔ میں کوشش کر سکتا ہوں لیکن .... وہاں جا کر آپ کو شدید سر درد ہو گا کیونکہ بلندی ہے اور پھر اسی وقت واپسی .... اور وہاں دیکھنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ تین چار ہفتوں تک برف پگھل جائے گی۔ پھر...."

"پھر میں یہاں نہیں ہوں گا...." میں نے حسن صد پارہ کا شکریہ ادا کیا اور پھر اس راستے کو دیکھا.... اوپر دیوسائی کا میدان تھا اور میں اس کی خواہش لے کر آیا

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



تھا۔

"تارڑ صاحب آپ فکر نہ کریں" خواجہ صاحب نے مجھے تسلی دی اور مجھے اس لمحے کی تسلی کی شدید ضرورت تھی" ہم آپ کو ایک ایسی وادی میں بھجوا رہے ہیں جو دیوسائی سے زیادہ خوبصورت ہو گی۔ کل صبح کی ویگن میں آپ کی نشستیں بک ہو چکی ہیں اور وہاں آپ کی رہائش کا بندوبست بھی ہو چکا ہے"

"آپ کس وادی کی بات کر رہے ہیں؟" میں نے بجھے ہوئے دل سے پوچھا

"وادی خپلو...."

ہم سکردو واپسی پر اس مقام سے گزرے جس کے قریب نالے کے کنارے وہ قدیم چٹان تھی جس پر گندھارا عہد کے بدھ مجسمے تراشے ہوئے تھے.... تاریکی جیسے دیوسائی کی بلندیوں سے نیچے آئی' ہمارے پیچھے پیچھے آئی اور پھر ہم سے آگے نکل کر وادی سکردو میں پھیل گئی۔

"آپ فکر نہ کریں تارڑ صاحب" خواجہ صاحب نے پھر تسلی دی۔ "آپ خپلو دیکھ آیئے۔ ہم آپ کی واپسی پر آپ کو دیوسائی بھجوانے کی کوشش پھر کر دیکھیں گے۔"

"نہیں خواجہ صاحب...." میں نے سر ہلایا "دیو سائی کی برف اس برس نہیں پگھلے گی"



# سکردو سے خپلو

.... اور ویگن جو سکردو سے ایک سو تین کلومیٹر کے فاصلے پر واقع وادی خپلو کی جانب رواں ہے' اور سفر کرتی ہے اندر پہاڑوں کے اندر جہاں ایک وسیع اور عظیم تنہائی ہے اور ہم تینوں اس تنہائی میں تحلیل ہونے کے لیے جا رہے ہیں۔ وادی خپلو کو جو لداخ کی قربت میں ہے اور جہاں مشہ بروم کی چوٹی ہے' دریائے شیوک اور اس کے معاون دریا سلتورو اور ہوشے کے کنارے پھیلی ہوئی ہے.... تو ہم تینوں ویگن میں سوار وادی خپلو کی جانب سفر کرتے تھے.... اور خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں....

"نہیں خواجہ صاحب".... میں نے سر ہلا کر خواجہ مہرداد سے کہا تھا "دیوسائی کی برف اس برس نہیں پگھلے گی.... اگلے برس پھر آئیں گے"

اور خواجہ صاحب نے فوری طور پر خپلو کے اسسٹنٹ کمشنر سے فون پر رابطہ قائم کیا تھا اور ریسٹ ہاؤس میں جو وی آئی پی کمرہ تھا ہمارے لیے بک کروا دیا تھا اور کہا تھا "اگر ایک در بند ہو تو واپس نہیں چلے جایا کرتے بلکہ کسی اور در پر جا کر دستک دیتے ہیں...." خپلو کا دروازہ کھلے گا تو اس کے اندر جھانکنے گا اور وہاں وہ سب کچھ ہو گا جس کی تلاش میں آپ گھر سے نکلتے ہیں"

ویگن سکردو سے نکل کر حسین آباد کے قریب ہوئی تو قصبے کے باہر ایک بورڈ نظر آیا۔ "حسین آباد کی حدود میں خلاف شرع افعال خصوصاً موسیقی بجانا منع ہے"

"نظامی صاحب ...." میں نے اگلی نشست سے مڑ کر ویگن کے پچھلے حصے میں ٹمن بند اور ایئر ٹائٹ مسافروں کی جانب دیکھا اور ان میں کہیں میرے ہم سفر نظامی اور مطیع براجمان تھے .... بلکہ مدغم تھے....

"اندازہ کرو...." نظامی صاحب کہیں سے بولے "بزرگوں کو ڈربے میں بند کر

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



دیا ہے.... اوئے مطیع تم کدھر ہو یار؟"

"میں ادھر ہوں" مطیع نے کہیں سے سر نکال کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور ادھر تم کیا کر رہے ہو؟" نظامی صاحب نے پوچھا۔

"ایک گورا قابو آگیا ہے اس کا ہاتھ دیکھ رہا ہوں"

"بادشاہو اس کا ہاتھ ہی دیکھ رہے ہو نا.... اندازہ کرو۔"

"نظامی صاحب' حسین آباد کی حدود میں داخل ہوتے ہوئے آپ نے وہ بورڈ نہیں پڑھا جس پر غیر شرعی افعال کی ممانعت کی گئی ہے...." میں نے انہیں بورڈ کی عبارت سے آگاہ کیا...

"بادشاہو یہ ہمیں کہاں لے آئے ہو؟" نظامی صاحب کا قہقہہ پوری ویگن میں انجن کے شور سے بلند ہو کر گونجا "شکر ہے حسین آباد میں ویگن روک کر ہماری چیکنگ نہیں کی گئی ورنہ ہمیں بھی غیر شرعی قرار دے کر روک دیا جاتا"

حسین آباد سے آگے ایک راستہ الگ ہو کر وادیٔ شگر کو چلا گیا۔ کے ٹو اور کنکورڈیا کو جانے والی کوہ پیما ٹیمیں اسی راستے پر جاتی ہیں.... داسو' اشکولے' دریائے برالدو اور للی گو کے راستے دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو کی جانب جو یہاں سے چودہ روز کی پیدل مسافت پر واقع ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسافر حضرات کی شکلیں واضح ہونے لگیں اور حلیے دکھائی دینے لگے' میرے پیچھے سعودی عرب میں ملازم ایک ایسا بلتی تھا جو اپنی بوڑھی اماں جان کی آنکھوں کا چیک اپ کرانے کے لیے سکردو گیا تھا اور اب اپنے قصبے کو لوٹ رہا تھا۔ اماں جان کی شکل لداخی تھی اور وہ اپنے روایتی چوغے اور ٹوپی میں ملبوس تھیں۔ ان کی درجنوں مینڈھیاں کندھوں پر لٹکتی تھیں۔ چاندی کا زیور اور بھاری جھمکے جن کی وجہ سے ان کے کان مہاتما بدھ کی طرح لانبے ہو چکے تھے.... ان کے چہرے پر پہاڑوں کی زندگی کی تمام تر مشقت کھدی ہوئی تھی اور ان کی آنکھیں خالی تھیں.... وہ بالکل نہیں دیکھ سکتی تھیں.... سکردو کی ٹاؤن کمیٹی کا ایک کلرک بھی اس ویگن میں سوار اپنے گاؤں کو جا رہا تھا۔ اس کی انتہائی کوشش تھی کہ وہ ہمارے ساتھ کسی نہ کسی طرح گفتگو شروع کر دے....

ویگن "گول" کے قصبے میں پہلی بار رکی اور چائے کے لیے رکی۔

باہر نکلے تو تیز ہوا سے سفیدے کے درخت دوہرے ہوئے جاتے تھے اور راستے کی ریت بلند ہو کر ہر شے کو دھندلاتی تھی۔ قریب ہی ایک دیدہ زیب پرانی مسجد تھی



اور اس کے صحن میں ایک چشمہ بہتا تھا۔ ہم نے وہاں منہ ہاتھ دھویا اور پھر گول کے واحد ہوٹل کے اندر چلے گئے اور اندر ایک سکون اور خاموشی تھی جو باہر کے شور کے بعد قدرے حیران کرتی تھی۔ گرم چائے کے ساتھ زرکون نے بہت لطف دیا۔ یہاں دو کمرے تھے۔ ایک میں گاہک بیٹھ کر چائے اور زرکون نوش کرتے اور دوسرے کمرے کا کچا فرش ذرا اونچا تھا اور اس پر درجن بھر بستر لپٹے پڑے تھے جو یہاں رات گزارنے والے مسافروں کو کرائے پر دیئے جاتے تھے۔

یہاں اُس گورے سے بھی ملاقات ہوئی جو ہماری ہی ویگن میں کہیں روپوش تھا اور جس کا ہاتھ مطیع صاحب کے ہاتھ میں بتایا جاتا تھا۔

"بادشاہو اس کا نام کرس ہے".... نظامی صاحب نے متعارف کروایا "بڑا سمجھ دار اور نیک قسم کا گورا ہے.... اور حیرت کی بات ہے کہ پڑھا لکھا ہے ابھی ابھی میں نے ذرا رعب ڈالنے کے لیے شیکسپیئر کے ڈرامے "ٹو تھ نائٹ" کا ذکر کیا تو اس نے آدھا ڈرامہ سنا دیا.... شاعر بھی ہے...."

میں نے کرس سے ایک عدد ہاؤ ڈو یو ڈو کیا اور ہاتھ ملایا .... اور تب مجھے ایک شدید دھچکا لگا.... اس شخص کو میں جانتا تھا میری پسندیدہ فلم "چلڈرن آف اے لیسر گاڈ" اور "کس آف دی سپائیڈر وومن" کا باکمال اداکار ولیم ہرٹ۔

"کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ تم کرس ہو؟"

"میں انگلینڈ سے چلا تھا تو کرس تھا اب بھی اصولی طور پر مجھے کرس ہی ہونا چاہئے...." اس نے اپنے سنہرے بالوں کو فراخ پیشانی سے لپیٹا اور ہنسنے لگا....

یقیناً وہ اپنی شہرت کو چھپا رہا تھا اور سب کی نظروں سے دور ہو کر الگ ہو کر سفر کر رہا تھا....

"اور تم کہاں جا رہے ہو کرس؟"

"فی الحال خپلو.... اور پھر واپس سکردو۔ گلگت' خنجراب اور چین.... میری منزل ماؤنٹ ایورسٹ کا وہ بیس کیمپ ہے جو چین میں ہے.... مجھے وہاں پہنچنے کے لیے ایک وسیع صحرا عبور کرنا ہو گا"

مطیع میرے قریب ہوا۔ "میں نے اس سے پوچھا ہے کہ یہ خپلو میں کہاں قیام کرے گا اور اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ کہاں ٹھہرے گا تو اسے اپنے کمرے میں سلا لیں گے"

"پتا نہیں کیسا شخص ہے.... اور یہ بھی پتا نہیں کہ وہاں جو کمرہ ملے گا اتنا بڑا ہو

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



گا کہ ہم چاروں اس میں سما جائیں ۔۔۔۔"

"بادشاہو وی آئی پی روم بک کروایا ہے خواجہ صاحب نے ۔۔۔ یہ سنگل روم میں سو جائے گا صوفے پر ۔۔۔ ویسے کھچڑ گورا ہے اس کے حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔۔۔"

جب ہم اس کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے تو وہ ماتھے پر ایک سلوٹ ڈالے ایک شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں دیکھتا جا رہا تھا۔

کول کے بعد وادی وسیع ہوتی گئی دریا کے پار بلندی پر سرسبز قطعات دکھائی دیتے تھے جو چھوٹے چھوٹے دیہات تھے' یہ نارتھاں کا علاقہ تھا۔ ڈرائیور نے بتایا کہ ابھی پچھلے دنوں یہاں کے باسیوں نے ایک سنو ٹائیگر کو پکڑا تھا۔۔۔ اور یہ سنو ٹائیگر یا برفانی شیر بھی ایک عجیب مخلوق ہے۔ ایک پرکشش جانور ۔۔۔۔ ایسا ہے کہ کئی غیر ملکی سیاح مقامی گائیڈز کے ہمراہ مہینوں قراقرم کی بلندیوں اور برفوں میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں تاکہ اس سفید شیر کا صرف دیدار کر سکیں یا ایک عدد تصویر اتار سکیں۔ ایک ایسی میم صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جنہوں نے عمر عزیز کا بیشتر حصہ سنو ٹائیگر دیکھنے کی آرزو میں پہاڑوں میں بسر کیا اور وہ اس بات پر نازاں تھیں کہ انہوں نے ایک مرتبہ اس کی دم دیکھی تھی ۔۔۔۔ بقیہ شیر چٹان کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔

ویگن ایک ہموار' کچے اور قدرے پتھریلے راستے پر چلی جا رہی تھی لیکن یہ راستہ بلند پہاڑوں کے بیچ میں ایک میدان نما علاقے میں واقع تھا۔

"وہ جو بڑا پتھر دکھائی دیتا ہے۔ صاحب تو اس پر پرانا تصویر ہے۔۔۔ ٹورسٹ لوگ دیکھتا ہے" ڈرائیور نے لحہ بہ لحہ قریب آتے ایک جہازی سائز کے پتھر کی جانب اشارہ کیا جو راستے کے کنارے پر ایک عظیم کھنڈر کی طرح پڑا تھا۔

"ہم بھی دیکھتا ہے۔۔۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "ویگن روکنا"

"دفع کرو صاحب کافر لوگ کا تصویر ہے آپ تو ماشاء اللہ مسلمان ہو" اس نے ویگن اور تیز کر دی۔

"اندازہ کرو" نظامی صاحب کی ہنسی کی آواز مجھ تک آئی۔

ایک چٹان دکھائی دی تو ڈرائیور نے پھر اطلاع کی کہ صاحب ادھر بھی کافر لوگ کی تصویر بنی ہے اور ٹورسٹ دیکھتا ہے۔ اس بار میں نے اس کا بازو پکڑ کر ذرا رعب سے کہا کہ بھائی جان آپ ویگن روک لو اور میری مسلمانی کو اتنا کمزور نہ جانو کہ چند تصویریں دیکھنے سے خطرہ میں پڑ جائے گی۔



یہ ایک بہت بڑی سرخ چٹان تھی جس پر زمانہ قبل از تاریخ کے انسانوں نے اپنی خواہشوں کا اظہار کیا تھا۔ بارہ سنگھے۔ تیر کمان ۔۔۔ درخت۔ شکاری اور ان کے علاوہ اس زمانے کے بعد بدھ کے پجاریوں کے بنائے ہوئے پگوڈے اور بدھ کی شکلیں۔۔۔ ایک عظیم اور کھلی وسعت میں ایک ویگن جس کے مسافر ادھر ادھر بکھر چکے تھے۔ ایک چٹان اور اس پر ان مصوروں کا اظہار فن جو کبھی ان خطوں میں آباد تھے۔ شاید انہوں نے بھی کبھی اپنی بستی کے باہر حسین آباد کی طرح کوئی بورڈ لگایا ہو گا کہ خبردار اس بستی میں خلاف بدھ تعلیمات ۔۔۔

سفر دوبارہ شروع ہوا تو ویگن میں پریاں آ گئیں ۔۔۔ بلتستان اور ہمارے بقیہ شمال میں پری ایک خیال نہیں بلکہ حقیقت کے آس پاس ہے۔ ان میں مخبل پری پریاں یعنی چڑیلیں بھی ہوتی ہیں۔ بوڑھی اماں جان کے لبوں پر بھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور ویگن کے مقامی مسافر ہمیں پریوں کے قصے سنا رہے تھے۔ ان میں ایک مولوی صاحب البتہ قدرے خشمگیں ہوتے تھے لیکن وہ بھی کھل کر پریوں کے خلاف کچھ نہیں کہتے تھے ۔۔۔۔

سکردو ٹاؤن کمیٹی کا کلرک تو پری سپیشلسٹ تھا اور بقیہ مسافر سر ہلا ہلا کر اس کی باتوں کی تائید کرتے جاتے تھے۔

"پری سے ملاقات کرنے کا کوئی آسان طریقہ تو بتا دیجئے" مطیع نے عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے نہایت بردباری سے دریافت کیا۔

"صاحب بہت اچھا لباس پہنو خوشبو لگاؤ اور آدھی رات کے وقت گاؤں سے باہر کسی بلند مقام پر چلے جاؤ"

"آدھی رات سے پہلے نہیں آ سکتی پری" نظامی صاحب نے نہایت دلچسپی سے دریافت کیا۔

"نہیں صاحب ۔۔۔ اندھیرا ہونا چاہئے"

"تو آپ پری کے چاؤ میں وہاں جاؤ اور اندھیرے میں آ جائے چڑیل تو پھر ۔۔۔" نظامی صاحب پھر بولے۔

"تو یہ چڑیل کی بدقسمتی ہو گی ناں" مطیع نے فقرہ کسا اور نظامی صاحب نے صرف "اندازہ کرو" کہنے پر اکتفا کیا۔

"تو جناب بلند مقام پر چلے جاؤ آدھی رات کے وقت ۔۔۔ اور پھر ہلکی سی خوشبو پہلے آئے گی پھر ہوا چلے گی اور پری آ جائے گی اور اگر وہ آپ کو پسند کرے تو آپ کو

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



اس سے شادی کرنی پڑے گی"

"سبحان اللہ" نظامی صاحب نے جھوم کر کہا۔

"پری سے شادی کس طرح ہو سکتی ہے؟"

"صاحب ہمارے گاؤں میں ایسے لوگ ہیں جن کی بیویاں پریاں ہیں ------ اور وہ دوسرے لوگوں کو نظر تو نہیں آتیں لیکن میں آپ کو پریوں کے بچے دکھا سکتا ہوں"

"پریاں نہ سہی پریوں کے بچے ہی سہی"

"یار نظامی آپ ذرا بات سننے دو" مطیع نے جھنجلا کر کہا.... "جی تو پریوں کے بچوں کے بارے میں بات ہو رہی تھی"

"جی صاحب۔ ہمارے گاؤں میں ہیں"

"صاحب یہ بالکل ٹھیک کہتا ہے.... " بڑی اماں جان کے بیٹے نے سر ہلایا "ہمارے گاؤں میں بھی پریوں کے بچے ہیں"

جو بات ایک ہلکے پھلکے اور نیم سنجیدہ انداز میں شروع ہوئی تھی۔ ان لوگوں کے مکمل یقین کی وجہ سے ہم پر اثر کرنے لگی.... کیا پتہ یہ سچ کہتے ہوں اور ہم ہی لاعلم ہوں...

"میری شادی پری سے ہو سکتی ہے ------ " مطیع نے پوچھا۔

"اندازہ کرو تارڑ صاحب.... " نظامی صاحب ہنسنے لگے۔

"اس میں ہنسنے کی کونسی بات ہے۔ اگر پریاں ان لوگوں کے ساتھ شادی کر سکتی ہیں تو میرے ساتھ کیوں نہیں کر سکتیں " مطیع مسکراتے ہوئے بولا

"اس لیے کہ پری آخر پری ہوتی ہے اس کا کچھ تو ذوق ہو گا ------" جواب آیا

وادی کی وسعت سکڑنے لگی۔ پہاڑ قریب ہوئے۔ ہم ایک ایسے مقام تک آ گئے جہاں سندھ ہم سے جدا ہو رہا تھا۔ دریائے سندھ ادھر لداخ کی جانب سے آ رہا تھا اور ہم اسے عبور کر کے دریائے شیوک کے کنارے سفر کرنے لگے۔ یہ وہ مقام تھا جہاں سندھ اور شیوک آپس میں ملتے تھے۔ یہاں شیوک ایک عظیم پانیوں والا دریا تھا اور سندھ نسبتاً چھوٹا تھا لیکن ملاپ کے بعد یہ شیوک کی قسمت کہ اس کا نام سندھ ہو جاتا تھا.... اور یہیں سے گندم اور جو کے سنہرے تختے دھوپ میں ایسے چمکتے تھے جیسے ایک ایک بوٹے اور خوشے کو سونے کے پانی سے پینٹ کیا گیا ہو۔ کٹائیاں شروع تھیں اور ان علاقوں کے کسان کھیتوں میں تھے۔ ان کی عورتیں اور بچے بھی ان کے



کام میں برابر کے شریک تھے ..... یہاں یاک اور گائے کے اختلاط سے پیدا کردہ جانور زوہ کھیتوں میں چلتا نظر آیا۔ سیاہ لمبے لمبے بالوں اور موٹی دم والا زوہ جو یاک اور گائے کے درمیان ایک سمجھوتہ ہے..... یاک کے لیے یہ بلندی کم ہے اور گائے یا بیل کے لیے اتنی بلندی بہت زیادہ ہے.... دونوں اس موسم میں زندہ نہیں رہ سکتے بلکہ کام نہیں کر سکتے..... اس لیے دونوں کا آدھا آدھا.... یعنی زوہ.....

"صاحب دیکھیں ادھر یوگو کے قصبے میں کٹائی ہو رہی ہے" ڈرائیور نے ویگن ذرا آہستہ کی۔ یوگو کے باشندے جو اور گندم کے گٹھے سنبھال رہے تھے اور ان میں سے بیشتر کے کانوں میں یا ٹوپیوں پر پھول سجے تھے۔ بلتی پھولوں کے بے حد شوقین ہیں۔ کچی کوٹھڑی کی چھت پر ٹین کے گملوں میں پھول اور بیلیں بہار دیتی ہیں

"براہ" میں سعودی عرب میں کام کرنے والا شخص اپنی نابینا اماں کے ساتھ اترا اور اس نے ہمیں ایک ایسی دعوت دی جو اگر میں اکیلا ہوتا تو ضرور قبول کر لیتا..... کشمیری طرز کا لکڑی کا بنا ہوا مکان ایک درے کے پتھروں کے قریب ایک سرسبز کھیت کے سامنے اور وہ اس کا گھر تھا اور وہ چاہتا تھا کہ ہم ایک شب کے لیے اس کے مہمان بن جائیں۔ وہ بہت دیر ویگن کے باہر اپنی اندھی اماں جان کے ساتھ کھڑا ہمارے جواب کا انتظار کرتا رہا لیکن یہ بہت بوجھ ہوتا اور ہم نے بوجھل دل سے انکار کر دیا۔

نپلو کے راستے میں ایک ایسا ٹھہراؤ بھی تھا جہاں خوبانیوں کے باغوں میں چشمے بہتے تھے۔ ایک نہایت سویٹ قسم کا بوڑھا بلتی بابا آٹا پیسنے والی چکی کے اندر آٹے کی سفیدی میں نظر ہی نہیں آتا تھا اور مجھے دیکھ کر وہ آٹے سے بنے ہوئے ایک پیارے بھوت کی طرح نمودار ہوا اور پوپلے منہ سے مسکرانے لگا۔ میں اسے چکی کے اندھیرے سے باہر لایا تاکہ ایک تصویر اتار سکوں تو وہ سورج کی روشنی سے جھینپ اور چھوٹا ہو گیا۔

تصویر کھنچوانے کے بعد وہ فوراً چکی کے اندر گھس گیا.... شاید وہ وہیں اس کچی کوٹھڑی کے اندر آٹے سے بنے ہوئے اندھیرے میں پیدا ہو کر جوان ہوا تھا اور بوڑھا ہوا تھا۔ اس ٹھہراؤ کے بعد ہماری ویگن ایک ایسے راستے پر سے گزری جس کے دونوں جانب خوبانیوں کے باغ تھے اور انکی شاخیں راستے پر جھکی سورج کو روکتی تھیں اور یہ راستہ تمام کا تمام زرد رنگ کا تھا اور روشن تھا کہ اس پر درختوں سے

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



گرنے والی بے انت خوبانیاں تہہ در تہہ بچھی ہوئی تھیں اور ان پر ہماری ویگن کے ٹائر کچر کچر کی آوازیں نکالتے چلتے تھے ...... اور ہم پیچھے دیکھتے تھے تو زرد راستے میں دو سیاہ لکیریں نظر آتیں تھیں جو ہمارے ٹائروں کے نشان تھے۔

شام ہو رہی تھی اور کھیت مزید سنہرے ہو رہے تھے۔

ویگن کچھ دیر کے لیے غواڑی کے خوبصورت قصبے میں بھی رکی....

اب ہم دریائے شیوک کے اوپر معلق چٹان میں بنی ہوئی تنگ اور نیم پختہ سڑک پر تھے اور چٹان کا سایہ دریا کے پار تک پھیلتا جاتا تھا اور اترتی شام کے ان خاموش لمحوں میں اور اس لینڈ سکیپ میں جو لاہور سے بہت دور لداخ کی بلندیوں کے آس پاس دریائے شیوک کے کنارے پر تھی' میں نے ویگن کی کھڑکی سے باہر دیکھا جہاں تک صرف ایک عقاب پرواز کر سکتا ہے اور وہاں ایک وادی تھی کوئی درہ تھا اور ایک چھوٹی سی سفیدی تھی جو ایک خوابناک اور دھیمی آبشار تھی جو بہت بلندی سے نیچے گر رہی تھی۔ فاصلے کی وجہ سے آبشار ایک تصویر کی طرح ساکت تھی اور کبھی واہمہ ہوتا کہ نہیں یہ پانی ہے اور تب یہ تصویر آہستہ سے حرکت میں آ جاتی ...... یہ ایک اور خواہش تھی .... جو بہت فاصلے پر تھی اور بس سے باہر تھی۔

شام گہری ہو چکی تھی جب ہم دریائے شیوک کے کنارے پہنچے جہاں اوپر بلندی پر وادیٔ خپلو کو راستہ جاتا تھا۔ نیم تاریکی میں ایک تیز نالے کا شور ابھرا۔ ویگن رکی اور پھر گیئر بدل کر اس ندی میں اتر گئی جو کہیں اوپر سے آ رہی تھی اور دریائے شیوک میں شامل ہوتی تھی۔ ہم سڑک چھوڑ کر ندی میں اس لیے اترے کہ ندی کے پانیوں نے اس جگہ کو چھوڑ دیا تھا جہاں پل بنایا گیا تھا اور اب ایک نئے راستے پر چلتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ پانیوں کی تیزی ہمیں شیوک میں لے جائے گی اور میں پہلی دفعہ خوفزدہ ہوا۔ ندی سے نکلے تو سڑک پر پانی بہتا تھا جس میں ہم بلکہ ویگن تیرتی چلی گئی .... اور پھر ایک درخت کے قریب رک گئی۔

"ریسٹ ہاؤس آگیا ہے صاحب ..." ڈرائیور اپنی نشست سے اٹھ کر اتر گیا۔ کنڈکٹر ہمارے رک سیک اتارنے لگا .... تاریکی پہلے سے کم ہو چکی تھی کیونکہ کہیں پہاڑ کی اوٹ میں چاند اونچا ہو رہا تھا۔ ہم نے سامان اٹھایا اور ریسٹ ہاؤس کی جانب چلنے لگے .... انگریز سیاح کرس اس تاریکی میں دریائے شیوک کے کنارے اپنا رک سیک اٹھائے کھڑا تھا اور ہمیں ریسٹ ہاؤس کی آسائش کی جانب بڑھتا ہوا حسرت سے



دیکھتا تھا۔

"کم آن کرس ..." میں نے اندھیرے میں پکارا۔

"تھینک یو ..." وہ ہمارے پیچھے چلنے لگا۔

خپلو کی رات میں اس مختصر ریسٹ ہاؤس میں وہی پراسراریت تھی جو ہر تھکے ہوئے مسافر کو ایک اجنبی مقام میں اور رات کے اندھیرے میں پہنچنے پر کسی نامعلوم رہائش گاہ کو دیکھ کر بدن میں پھیلتی ہے۔ ہم نے اپنا سامان برآمدے میں رکھا اور ادھر ادھر تانک جھانک کرنے لگے۔ ایک کمرے میں ڈائننگ ٹیبل پر دو سفید فام سیاح سر جھکائے بیٹھے تھے اور کچھ کھا رہے تھے۔ ان کے سامنے ایک دروازہ کھلا اور ایک جھکا ہوا شخص ایک چپاتی کو چٹکی میں دبائے ہوئے باہر آیا۔ اس نے ہماری طرف دیکھا اور صرف دیکھا اور پھر چپاتی سیاح جوڑے کے سامنے رکھ کر چلا گیا۔

"ایکسکیوز می ..." نظامی صاحب نے مجھے دھکیل کر پیچھے کیا اور ان سے براہ راست مخاطب ہو گئے۔

"چوکیدار کہاں ہے؟"

وہ جوڑا اتنا بوڑھا نہیں تھا جتنا بے زار تھا۔ ہم تینوں کو دیکھ کر وہ کچھ خوش نہ تھے ... شاید ہم انکی مکمل تنہائی میں مخل ہوئے تھے۔ مرد نے سر اٹھایا۔ اس کے سامنے اس کا ہاتھ تھا جس میں ایک کانٹا تھا جس پر چنے کی دال کے چند دانے لرز رہے تھے۔ "چاپاٹی" اس نے کہا اور پھر دال نوش کرنے لگا۔ چوکیدار پانچ منٹ بعد چاپاٹی لے کر آیا تو ہم نے کھانس کر اسے اپنی موجودگی کی اطلاع دی اور پھر ریزرویشن سلپ اس کے سامنے پیش کی جس پر وی آئی پی روم ہمارے نام بک تھا۔ اس نے سلپ دیکھی اور سر ہلایا۔

"آؤ صاحب ...." وہ باہر آیا اور برآمدے میں رکھے ہمارے سامان پر ایک نظر ڈال کر ایک دروازہ کھول دیا۔ خپلو کے مطابق یہ یقیناً نہایت آرام دہ رہائش تھی لیکن نظامی صاحب قدرے مایوس ہوئے "بادشاہو یہ وی آئی پی روم ہے تو عام روم کا کیا حال ہوگا...."

"عام روم میں کرسی نہیں ہے صاحب" چوکیدار بولا۔ "اور قالین بھی نہیں ہے"

تب ہم نے غور کیا کہ واقعی وہاں دو کرسیاں بھی تھیں اور فرش پر کچھ بچھا ہوا

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



بھی تھا۔

"کھانا ملے گا؟" مطیع نے دریافت کیا۔

"کھانا ختم ہے صاحب ....." چوکیدار نے جواب دیا

"نہ نہ بزرگو ......" نظامی صاحب نے آگے بڑھ کر چوکیدار کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگا کر منت سماجت شروع کر دی "پردیسی آدمی ہیں۔ مسافر ہیں ..... کچھ بندوبست کر دو..... بازار سے کچھ لے آؤ"

"بازار تو اوپر ہے صاحب اور بند ہو چکا ہوگا۔ ویسے بھی اس وقت نالہ زور پر ہوتا ہے ہم اس کے پار نہیں جا سکتے"

"یعنی رات کے وقت ریسٹ ہاؤس اور خپلو کے درمیان ندی نالے منہ زور ہو جاتے ہیں؟"

"جی صاحب..... اچھا صاحب میں انڈا دیکھتا ہوں ....."

"اللہ تیرا بھلا کرے ......" نظامی صاحب نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔ "جا' جا کر انڈا دیکھ۔ ایک نہیں جتنے دیکھ سکتا ہے دیکھ اور پھر ان کا بنا آملیٹ اور کھلا مسافروں کو....."

چوکیدار نے نظامی صاحب کو شک کی نگاہ سے دیکھا اور پھر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر واپس آیا "صاحب خپلو کے اے۔ سی صاحب کا فون آیا تھا کہ مہمانوں کو بتا دو کہ وہ صبح نو بجے آئیں گے اور پھر آپ کو خپلو کی سیر کرائیں گے اور صاحب انڈا نہیں ملا"

"او تیرا بیڑا غرق ......" نظامی صاحب نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہا "اب کیا ہوگا؟"

"صاحب انڈا نہیں ملا لیکن مرغی مل گئی ہے۔ وہ بنا لوں؟"

"تیرے بچے جئیں ......" نظامی صاحب بستر سے اٹھے اور چوکیدار کے گال پر ایک واجبی سا بوسہ دیا۔ چوکیدار نے اب ذرا زیادہ شک کی نظروں سے نظامی صاحب کو دیکھا اور چلا گیا۔ کرس نے اپنا سلیپنگ بیگ نکالا اور فرش پر بچھا کر اس میں گھس گیا۔ مطیع کے حصے میں قالین والا حصہ آیا اور وہ اپنا سلیپنگ بیگ اس پر بچھا کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ میں اور نظامی صاحب دونوں بستروں پر قابض ہو گئے۔

"اوہ مجھے خپلو پسند آگیا" کرس نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔



"تم نے خپلو میں دیکھا کیا ہے برخوردار جو ابھی سے پسند آگیا ہے" نظامی صاحب نے کمبل میں سے سر نکال کر پوچھا۔

"یہ ہرگز ضروری نہیں کہ انسان کچھ دیکھ کر ہی اسے پسند کرے ...... یہ سب کچھ ہوا میں ہوتا ہے' ماحول میں ہوتا ہے۔ میں نے ایک گہرا سانس اس کمرے میں لیا ہے تو میں جان گیا ہوں کہ خپلو مجھے پسند آئے گا" کرس نے متانت سے تقریر کی۔

"بادشاہو یہ ہاں دانشور گورا ...... کیسی الٹ پلٹ باتیں کرتا ہے جو سمجھ میں نہیں آتیں" نظامی صاحب بھی کمبل سے باہر ہو گئے۔

"میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے اتنے پڑھے لکھے پاکستانیوں کے ساتھ سفر کرنے اور رات گزارنے کا موقع مل رہا ہے"

اس بیان پر سب حضرات نے سینے پھلا کر کرس کی تائید کی۔

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ دنیا کی قومیں اگر ....." کرس اپنی ہتھیلی پھیلا کر پھر تقریر شروع کرنے کو تھا کہ مطیع نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا "آہا..... واہ..... کیا ہاتھ ہے" مطیع نے جھوم کر کہا۔

"یہ میرا ہاتھ ہے" کرس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن مطیع دست شناس کم اور دست گیر زیادہ تھا۔ اس پر کرس نے اسے شک کی انہی نظروں سے دیکھا جن نظروں سے چوکیدار نے چومے جانے پر نظامی صاحب کو دیکھا تھا کہ یہ سعنک انشورنس والا میرا ہاتھ کیوں اتنی محبت سے تھامے ہوئے ہے۔

"واہ..." مطیع نے زبان سے ایک پٹاخہ سا چلایا "یہ تو نپولین کا ہاتھ ہے۔"

"نپولین کا..." کرس چوکنا ہو گیا اور پھر خوشدلی سے بولا "اس کا مطلب ہے کہ گھر سے چلتے ہوئے میں اپنے ہاتھ کی بجائے نپولین کا ہاتھ ساتھ لے آیا ہوں"

"میں جھوٹ نہیں کہہ رہا" مطیع نے باقاعدہ وجد میں آکر کہا۔ "تمہارے ہاتھ کی یہ انگلی..." اس نے کرس کی چھنگلی کو ایک بھنڈی توری کی طرح چٹکی میں لیتے ہوئے سہلایا۔ "سو فیصد نپولین کی ہے اور تمہاری شادی ایک ایسی خاتون کے ساتھ ہو گی جو ایک جگہ گھر بنا کر نہیں رہے گی"

کرس کی مسکراہٹ یکدم سمٹ گئی "کرائسٹ ...... میری منگیتر وزارت خارجہ میں کام کرتی ہے اور ان دنوں ہالینڈ میں پوسٹڈ ہے..... گاڈ...... تم نے یہ کیسے

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



جان لیا؟"

"میں ہاتھ پڑھ سکتا ہوں ---" مطیع نے عینک اتار کر اس کے شیشے چمکائے اور اسے دوبارہ پہنتے ہوئے دانت نکال دیئے۔

"مجھے کچھ اور بتاؤ---" کرس نے انتہائی لجاجت سے درخواست کی اور اپنی ہتھیلی مطیع کی عینک کے نیچے کھول دی۔

"اندازہ کرو------" نظامی صاحب نے بیزار ہو کر میری طرف دیکھا "یہ یہاں خپلو دیکھنے آیا ہے کہ ہاتھ دکھانے"

ادھر کرس مطیع کے ہر فقرے پر بڑی سعادت مندی سے سر ہلا رہا تھا اور اس کے کان صرف اس کی آواز پر لگے ہوئے تھے "بچپن میں تم ایک بار مرتے مرتے بچے تھے! تمہارے دل میں محبت کے لیے بہت جگہ ہے لیکن لوگ تمہاری محبت کا جواب نفرت سے دیتے ہیں۔ تم بے حد حساس ہو۔ تم دل کے بہت سادہ ہو اس لیے دوست دھوکا دے جاتے ہیں۔ تم لوگوں پر آسانی سے اعتماد کر لیتے ہو لیکن دل کے امیر ہو۔ اگلے سے اگلے برس تمہاری زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی آئے گی۔ تم دولتمند بن جاؤ گے--- تم ایک ملنسار شخص ہو لیکن ....." اور کرس مطیع کے ہر فقرے پر سعادت مندی سے سر ہلا رہا تھا۔

"کرس جب تم اپنے مستقبل کی خبروں سے فارغ ہو جاؤ گے تو میں تمہیں چار برطانوی خواتین کے بارے میں چار نہایت ناقابل بیان لطیفے سناؤں گا---" نظامی نے اپنے گھنے اور سفید بالوں میں ہاتھ پھیرا اور شرارت ان کے چہرے پر جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی تھی۔

"کیا واقعی؟" کرس فوراً متوجہ ہو گیا "میں ہمہ تن گوش ہوں۔ سنایئے"

"میں نے کہا تھا ناں کہ لطیفے ناقابل بیان ہیں تو میں ایک شریف آدمی کی حیثیت سے ایسے لطیفے کیسے سنا سکتا ہوں ---" نظامی نے ایک پر شور قہقہہ لگایا .... اور اسی لمحے ہمیں احساس ہوا کہ ہم ایک دور دراز کی وادی میں ایک چھوٹے سے ریسٹ ہاؤس کے کمرے میں بیٹھے ہیں اور باہر رات ہے اور خاموشی ہے اور اس خاموشی میں صرف ہماری باتیں ہیں اور نظامی کا قہقہہ ہے جو ابھی ابھی گونجا ہے۔

"باہر چلیں ------"

"لیٹے رہو بادشاہو۔ آرام کرو۔ بہت سفر کیا ہے اور باہر جانا کدھر ہے؟ دریائے



شیوک میں؟" نظامی کہنے لگے۔

"ہم پرسوں واپس سکردو چلے جائیں گے --- آج کی رات اور کل کی رات --- تو آج کی رات ------" میں نے ابھی فقرہ مکمل نہیں کیا تھا کہ نظامی صاحب نے ایک دلدوز "ہائے ہائے" کی اور بستر پر کھڑے ہو کر کہنے لگے "ہائے ہائے آج کی رات ساز دل پر درد نہ چھیڑ.... غالبو نوری نے کیا گانا گایا تھا"

"عرض میں یہ کر رہا تھا کہ ذرا باہر چل کر دیکھتے ہیں کہ وادی خپلو کی رات کیسی ہوتی ہے..."

"ہائے ہائے آج کی رات --" نظامی صاحب سر ہلاتے ہوئے بستر سے نیچے آ گئے۔ کرس کو معلوم نہیں تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے اور کیوں ہے لیکن وہ بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔

کمرے سے نکلے۔ برآمدے سے پرے صرف اندھیرا تھا اور اس اندھیرے میں سے کہیں کہیں ہلکی روشنی آتی تھی۔

"ہاں جی کدھر چلیں.... دائیں کہ بائیں؟" نظامی صاحب نے پوچھا۔

"آپ تو ہمیشہ بائیں چلتے ہیں۔ اس لیے بائیں"

ایک راستہ نیچے جاتا تھا جس پر ہم چل کر آئے تھے۔ یہ اب دکھائی تو نہیں دیتا تھا لیکن ہم جانتے تھے کہ یہ وہاں ہے پھر اس پر شور نالے کی موجودگی کا احساس ہوا اور وہ قریب آ گیا۔ ہم سب ایک ہی لمحے میں ایک کیفیت سے دوچار ہوئے کہ ہمارے شوز بھیگ چکے ہیں، اور ہم پانی میں چل رہے ہیں۔ ہم نے اپنے آپ کو بچانے کی خاطر ادھر ادھر پاؤں رکھنے کی کوشش کی لیکن اندھیرے میں صرف پانی تھا اور پاؤں پانی ہی میں پڑتے۔ یہ وہ راستہ تھا جس پر نالے کا پانی کناروں سے نکل کر بہہ رہا تھا۔ اس راستے کے اختتام پر ہمیں روشنی دکھائی دی اور یہاں وہ نالہ دریائے شیوک میں شامل ہو رہا تھا۔ جہاں سے ہم آئے تھے وہاں گھنے درخت تھے اور اس لیے تاریکی تھی اور یہاں دریائے شیوک کے کنارے اور پورے دریا پر اور دوسرے کنارے پر جو بہت دور تھا اور جہاں چٹانیں بلند ہوتی تھیں وہاں ہر جگہ روشنی تھی، ہلکی چاندنی تھی۔ ہم اب دیکھ کر چل سکتے تھے اور ہم پھدکتے ہوئے، چھوٹی چھوٹی نالیوں کو پھلانگتے ہوئے دریا کے کنارے تک چلے گئے جہاں پانی کی سفید چادر بے چینی سے ایک گرم بدن کی طرح کسمساتی تھی۔

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



"اندازہ کرو" نظامی صاحب نے کہا۔ "باہر یہ عالم ہے اور ہم کمرے میں بند بیٹھے تھے"

اور واقعی باہر وادیٔ خپلو کی چاندنی رات میں ایک عجیب عالم تھا ۔۔۔ اور اس عالم میں صرف ہم تھے جو غیر ضروری تھے۔ دریائے شیوک ایک وسیع ریگستان کی طرح چاندنی میں لو دیتا تھا۔ ہم پتھروں پر بیٹھ گئے۔ ہمیں مہتاب کا انتظار نہیں کرنا پڑا تھا لیکن ۔۔۔ ہر سائے تلے اس کا عکس جھلکتا تھا ۔۔۔ اس کا عکس جس کا وجود دور ہو جاتا ہے لیکن وہ موجود رہتا ہے۔ ساتھ ساتھ چلتا ہے اور آپ اس سے باتیں کرتے ہیں اور جب کبھی کوئی ایسا منظر سامنے آتا ہے۔ جب کبھی آپ کسی عالم میں جاتے ہیں تو پھر اس کی کسک اٹھتی ہے کہ وہ یہاں ہو اور تب اس کا عکس ہر سائے تلے جھلکتا ہے ۔۔۔ ہر شخص کے پاس اپنا ایک عکس ہوتا ہے اور جس کے پاس نہ ہو اس کی زندگی رائیگاں گئی۔

"کرس اگر تم زیادہ خاموش رہے تو میں چار انگریز خواتین کے بارے میں بہت ہی نازیبا قسم کے لطیفے سناؤں گا"

کرس نے جواب نہیں دیا۔ ماتھے پر آئے بالوں کو ایک جھٹکے سے پیچھے کیا اور چپ رہا۔

"کرس ہم تمہاری شاعری سنیں گے" مطیع نے فرمائش کی۔

"نہیں" کرس لڑکیوں کی طرح شرمایا۔

"تمہیں اس سے بہتر سامعین تو مل سکتے ہیں لیکن اس سے زیادہ خوبصورت ماحول نہیں ملے گا۔ سنا دو"

"میرے پاس کتاب نہیں ہے۔" وہ ابھی شرما رہا تھا "لیکن میں کچھ پاکستانی شاعری سننا پسند کروں گا"

"چل بھئی مطیع شروع ہو جا" نظامی صاحب نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "ہمارا یہ شیر اسکول کے مباحثے میں ہمیشہ اول آیا کرتا تھا۔ اور اسے بڑا بڑا شعر یاد ہے ۔۔۔"

"بہت ہی دلچسپ" کرس نے سر ہلایا "تو آپ لوگوں کو شعر پڑھنے کے لیے کتاب کی ضرورت نہیں پڑتی"

"چل بھئی اسے سنا وہ والا ۔۔۔ کہ لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" نظامی



صاحب شاید دریا کی قربت کی وجہ سے موج میں تھے۔

"غالب کا شعر سنا دوں؟" مطیع نے کھانس کر پوچھا۔

"مسٹر کرس اب آپ کو مطیع صاحب ہمارے ایک گریٹ پوئٹ غالب کا شعر سنائیں گے۔ سناؤ بھئی ۔۔۔"

مطیع نے کھانس کر شروع کیا "دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے۔"

نظامی صاحب فوراً دخل انداز ہو گئے۔ "اوئے انگریزی میں ترجمہ کر کے سناؤ"

چنانچہ مطیع صاحب نے پٹڑی بدل لی۔ "دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے ۔۔۔ او سٹوپڈ ہارٹ وہاٹ ہیز ہیپنڈ ٹو یو۔ اور آخر اس درد کی دوا کیا ہے۔ ایٹ لاسٹ وہاٹ از دی میڈیسن آف دس پین"

کرس یہ شعر سن کر بہت دیر تک عالم استغراق میں رہا۔ پھر باہر آیا تو سر اٹھایا اور کہنے لگا "کیا واقعی یہ کسی گریٹ پوئٹ کا شعر ہے ۔۔۔ اگر ہے تو وہ گریٹ نہیں سٹوپڈ پوئٹ ہے"

"مروا دیا ہے ناں غالب کو" نظامی صاحب مطیع پر برس پڑے "یہ ترجمہ ہے؟"

"چلیے نظامی صاحب آپ انگریزی پڑھاتے ہیں تو آپ اس سے بہتر ترجمہ کر دیں" مطیع ناراض ہو کر کہنے لگا۔

"ہماری شاعری کا ترجمہ نہیں ہو سکتا کرس ۔۔۔ اور شاید کسی بھی زبان کی شاعری کا ترجمہ نہیں ہو سکتا اس لیے ہم تمہیں تمہاری شاعری سناتے ہیں"

پہلے نظامی صاحب نے پیراڈائز لاسٹ کے کچھ حصے سنائے۔ پھر میں نے بائرن اور ایلیٹ کی چند سطریں دہرائیں اور آخر میں مطیع نے انگریزی کے چند ایسے شعر سنائے جو بہت اچھے تھے لیکن کسی نامعلوم شاعر کے تھے۔ بعد میں اس نے ہمیں بتایا کہ وہ نامعلوم شاعر وہ خود تھا اور اگر وہ اس وقت یہ بتا دیتا تو نظامی صاحب ہرگز اتنی داد نہ دیتے جتنی کہ انہوں نے دی۔

خنکی زیادہ ہو کر سردی ہو گئی تھی۔ ہمارے آس پاس چھوٹی چھوٹی نالیاں بہتی تھیں اور ان میں کہیں کہیں وہ چاند بہتا تھا جو دریائے شیوک کے پھیلاؤ کو روشن کرتا تھا اور اس لمحے ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اپنی اپنی دنیاؤں میں چلے گئے۔ ہم خاموش تھے کیونکہ ہمارے پاس کہنے کو کوئی ایسی چیز نہ تھی جو خاموشی سے زیادہ خوبصورت ہوتی۔۔۔

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



# وادی خپلو

میں سانس سنبھالتا ہوا سر جھکائے ہولے ہولے قدم اٹھا رہا تھا اور میں خاصا تھک چکا تھا۔ میرا شہری بے ڈول جسم اس چڑھائی کے قابل نہ تھا لیکن اس میں جو خانہ بدوشوں والی ڈھٹائی تھی اس کے سہارے وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ چونکہ میں سامنے دیکھ نہیں رہا تھا۔ سر جھکائے ہوئے تھا' اس لیے صرف سن رہا تھا یا محسوس کر رہا تھا اور مجھے پانی کے چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بہت دور کہیں چند خوش نوا پرندے چہکتے تھے اور ان میں سے ایک پرندہ ساتھیوں کے چپ ہو جانے کے بعد ایک لمبی "ہو ہو" کرتا تھا۔ ہوا جو پسینے سے بھیگتے چہرے کو چھوتی تھی سرد تھی۔ اور آس پاس جنگلی پھولوں کی مہک تیرتی پھرتی تھی۔

چند قدم آگے مطیع اکرس اور فدا حسین تھے۔

مجھ سے پیچھے نظامی صاحب کمر پر ہاتھ رکھے نظارے دیکھنے کے بہانے بار بار رکتے تھے اور ہونکتے تھے "کتنی دور رہ گئی ہے یہ چن جی مسجد؟"

"چن جی نہیں" میں بھی بہانہ پر کر رک گیا "چقچن مسجد..... بلکہ خانقاہ صوفیہ چقچن۔ انگریز مورخ جان بارلے کے مطابق یہ اپنے منفرد طرز تعمیر کی وجہ سے ایشیا کی سب سے خوبصورت خانقاہ ہے۔ اس کی بنیاد حضرت میر سید علی ہمدانی نے رکھی اور اسے میر شمس الدین محمد عراقی نے پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ تقریباً چھ سو برس قدیم ہے....."

"چن جی میں نے صرف یہ پوچھا ہے کہ یہاں سے یہ مسجد کتنی دور رہ گئی ہے اس کی وہ تاریخ نہیں پوچھی جو آپ نے کسی گائیڈ بک میں پڑھ کر رٹ لی ہے"

"ابھی بہت دور ہے" میں نے بیزار ہو کر کہا

"یار ضروری ہے اس مسجد کو دیکھنا؟" نظامی صاحب بمشکل مجھ تک آئے۔



"بہت ضروری ہے"

نظامی صاحب نے اوپر دیکھا جہاں کچھ دھند تھی اور کچھ برف تھی اور ہمیں وہاں تک جانا تھا۔

آج پورے نو بجے جب ہم ناشتے سے فارغ ہو کر ریسٹ ہاؤس کے چھوٹے سے لان میں واقع ایک بہت بڑے اخروٹ کے درخت کے نیچے بیٹھے وادی خپلو کی ہوا میں لمبے لمبے سانس لے رہے تھے تو فدا حسین صاحب آ گئے..... دونوں بازو سینے پر رکھے شلوار قمیض اور جرسی میں ملبوس دبلے اور لداخی نین نقش والے فدا صاحب خپلو کے اسسٹنٹ کمشنر تھے اور ظاہر ہے مہرداد صاحب کے شاگرد تھے اور اپنے استاد کی ہدایت کے مطابق ہم مسافروں کو خپلو دکھانے اور ہمارے آرام و آسائش کا ذاتی جائزہ لینے کے لیے بنفس نفیس پہنچ چکے تھے۔

"کمال ہے بھئی....." نظامی نے میرے کان میں کہا "بندہ اے سی ہے اور کوئی پھوں پھاں اور پھنکار وغیرہ نہیں ہے۔ کتنا سادہ آدمی ہے"

فدا صاحب نے خپلو کی سیر کا لائحہ عمل تیار کر رکھا تھا اور اب ہم پروگرام کے پہلے مرحلے میں تھے یعنی خانقاہ چقچن کی جانب رواں تھے بلکہ رواں تو خیر کیا تھے اٹک اٹک کر چڑھتے جاتے تھے۔ آس پاس کھیت بہت تھے۔ ان میں جو کی فصل سنہری ہو رہی تھی۔ یہاں بھی ہل کے آگے بیلوں کی بجائے سیاہ ذوہ زور لگا رہے تھے۔ ہم جیسے جیسے دریائے شیوک سے بلند ہوتے تھے آس پاس کا منظر وسیع ہوتا چلا جاتا تھا۔ ہمارا راستہ ایک کچے گھروندے کے جنگلی باغ کے اوپر سے گزرا تو بہت ساری تیز مہک نے مجھے رکنے پر مجبور کر دیا۔ یہ چھوٹا سا باغ کسی کے شوق نظر اور حسن جمال کی ایک صد رنگ تصویر تھا کچے گھروندے کے اندر سے ایک بیچارگی کی مسکراہٹ والا شخص باہر آیا..... اس نے بڑے فخر سے مجھے پھولوں کے نام بتائے۔

"یہ پھول یقیناً وادی خپلو میں ہی پائے جاتے ہوں گے؟" میں نے پوچھا۔

"صاحب میں تو ان کا بیج لاہور سے لایا ہوں۔ ادھر ہم ایک باورچی ہے صاحب....." وہ میری جانب منہ اٹھائے کھڑا تھا۔ "آپ گھر میں آؤ صاحب چائے پیو"

میں اس چھوٹی سی ارضی جنت میں کچھ دیر ٹھہرنا چاہتا تھا لیکن میرے ساتھی بہت آگے جا چکے تھے۔ یہاں تک کہ نظامی صاحب بھی ابھی ابھی ہانپتے ہوئے گزر گئے تھے۔ میں نے لاہور کے باورچی سے معذرت کی اور چڑھائی چڑھنے لگا..... پانی کی آواز اب زیادہ گونجتی تھی۔ بلندی پر ایک وسیع تالاب میں چھوٹے چھوٹے بچے نہا رہے

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



تھے۔ انھیں اس یخ پانی میں نہاتے دیکھ کر کپکپی سی چڑھتی تھی۔ تالاب کے پس منظر میں برف پوش پہاڑوں کی خاموشی تھی۔۔۔ اور ہاں مجھے یہ کہنے دیجئے کہ وادی خپلو اور آس پاس کے خطّے شدید خاموشی میں ہوتے ہیں۔ یہاں سوائے پانی کی آواز کے اور کچھ سنائی نہیں دیتا اور اس کے پہاڑوں میں گہری موت ایسی اداسی جیسے کہیں سے آکر اترتی رہتی ہے۔۔۔ اور منظر میں جذب ہوتی رہتی ہے۔

اب راستے کے آس پاس آبادی نظر آنے لگی۔۔۔ لیکن بہت کم۔۔۔ پانی کی نالیاں گھروں میں سے گزر کر کھیتوں میں جا رہی تھیں۔ یہاں بھی آب پاشی کا وہی نظام رائج تھا جو وادی ہنزہ کی ہریالی کا باعث ہے۔ گلیشیئر میں سے آنے والے پانیوں کو چھوٹی چھوٹی نہروں میں تقسیم کرکے گھریلو اور زرعی ضرورت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔۔۔ بس یہی راستہ تھا اور پانی کے تسلسل کی یہی موسیقی تھی اور اوپر جہاں چقچن مسجد تھی ابھی دھند تیرتی تھی اور ہوا میں تیز سردی گھلی ہوئی تھی اور میں ایک چھوٹی نہر کے کنارے چلتا تھا جب مجھے اس بات کا ثبوت ملا کہ ان علاقوں میں واقعی پریاں ہوتی ہیں۔ وہ چہرے جن پر وادی خپلو کے باغوں اور چناروں کی سرخی تھی اور ان کا حسن زمین کا نہ تھا کسی بلندی کا تھا تو ایسے چہرے مٹی کی دیواروں کے اوپر سے کبھی کبھار ظاہر ہوتے اور پھر چھپ جاتے۔ میں ان کی جانب دیکھتا نہ تھا کہ یہ معیوب بات ہوتی لیکن ان کی موجودگی میں ایسی شدت تھی کہ میں پھر بھی انھیں دیکھتا تھا۔۔۔ ان میں سے ایک نے دونوں کانوں میں جنگلی پھول اڑس رکھے تھے۔ ایک کی صرف آنکھیں کچی دیوار پر جیسے دو نیلی دنیاؤں کی طرح رکھی تھیں اور مجھے دیکھتی تھیں۔۔۔ میں اپنے ساتھیوں سے بہت پیچھے رہ گیا تھا اور پیچھے رہنے والے ہمیشہ گم ہو جاتے ہیں۔۔۔ میں بھی گم تھا ان آبی گزرگاہوں کے شور میں اور اس لداخ کے آس پاس کے موسم میں' اس بلندی میں جہاں آسمان نیچے آتا جاتا تھا اور ان شکلوں میں جنھیں میں پہلی اور آخری مرتبہ دیکھتا تھا اور صرف ایک ناکافی جھلک دیکھتا تھا۔

وہ سب ایک پن چکی کے شور کے قریب میرے منتظر تھے۔۔۔ ہم اکٹھے اوپر چڑھنے لگے۔ دھند کے اندر ایک دروازہ آیا جس کے ماتھے پر مندرجہ ذیل عبارت درج تھی۔

خانقاہ چقچن

معماران میر سید علی ہمدانی ۷۸۳ھ: میر سید محمد نور بخش۔ میر شمس الدین عراقی





ہم جوتے اتار کر اندر داخل ہوئے تو سامنے دو بوڑھے چلے آ رہے تھے جو ہمیں دیکھ کر رک گئے۔ انھوں نے سلام میں پہل کی۔ "آپ کہاں سے آئے ہو صاحب؟"

اس کا جواب فدا صاحب نے اپنی زبان میں دیا اور جب بھی لاہور کا ذکر آتا تو ہم سب مسکرا کر سر ہلا دیتے۔ یہ بوڑھے انتہائی مزیدار تھے۔ یوں تو بوڑھے بہت کچھ ہو سکتے ہیں۔ یعنی سنکی' بد مزاج' خوش مزاج' پیارے یا خوفناک لیکن ان دو بابوں کے لیے میرے پاس صرف مزیدار کا لفظ ہی ہے۔ وہ ان چھوٹے بچوں کی طرح تھے جو اسکول کے فینسی ڈریس کے لیے بابے بن کر آ گئے تھے اور اب ان کی مسکراہٹ ان کے قابو میں نہ تھی۔ وہ ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ پہلی منزل پر اعتکاف کے لئے کوٹھڑیاں تھیں۔ ان میں بمشکل داخل ہوا جا سکتا تھا' اور اندر سے ان کی چھت نیچی تھی اور کل رقبہ اتنا تھا کہ عبادت گزار اگر انگڑائی لینا چاہے تو ہاتھ چھت یا دیوار سے جا لگیں۔ فرش پر ایک خاص قسم کی گھاس بچھی تھی جو اتنی نرم اور لچکیلی تھی کہ اس کی موجودگی میں کسی بستر یا بچھونے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس گھاس میں بھی ایک مخصوص مہک تھی۔ ان کوٹھڑیوں میں پچھلے کئی سو برسوں کی عبادت کی پاکیزگی محسوس ہوتی تھی۔ لکڑی کی سیڑھیوں پر احتیاط سے قدم رکھتے ہوئے ہم اوپر گئے۔

خانقاہ چقچن تمام کی تمام لکڑی سے بنی تھی۔ یہ اتنی بڑی نہ تھی کہ لاہور کی شاہی مسجد دیکھنے والی آنکھ کو بڑی لگے لیکن یہ اتنی بڑی ضرور تھی کہ کسی گلیشیئر کے دامن میں واقع دس جھونپڑوں پر مشتمل گاؤں کے کسی باسی کو حیرت زدہ کر دے۔ اس کی وسیع بالکونی اندرون لاہور کے کسی قدیم مکان کی بالکونی سے مشابہ تھی۔ فرش پر دریاں بچھی تھیں۔ ہم سب ان پر بیٹھ گئے۔

"گاڈ از گریٹ" نظامی صاحب نے دعا کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"نو از" کرس نے خانقاہ کے ماحول سے متاثر ہو کر ہم سب کی طرف دیکھا۔

"چقچن کے معنی کیا ہیں؟" کسی نے پوچھا۔

"اگر اجازت ہو تو میں بتاؤں؟" فدا صاحب جو بلتی شرافت کا نمونہ تھے کھانس کر بولے "کہا جاتا ہے کہ چقچن کا مطلب ہے لوہے کی چیز۔ یہاں ایک ستون ہے جس کے ساتھ ایک زنجیر ہوتی تھی اور مقامی آبادی کا یقین تھا کہ یہ زنجیر ایک زمانے میں

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



آسمان سے ملی ہوئی تھی جس کے ساتھ زیادتی ہوتی تھی تو وہ اس زنجیر کو ہلا دیتا تھا"

"واہ" مطیع نے سر ہلایا "یہ تو ڈائریکٹ ڈائلنگ والی بات ہے"

"یقیناً" فدا صاحب مسکرائے "اس کے علاوہ اس مسجد کو شیاخ چن بھی کہتے ہیں اور اس کا مطلب ہے انصاف کی مسجد اور ہمارا عقیدہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص اس مسجد کے اندر بیٹھ کر جھوٹی قسم کھائے تو وہ مر جاتا ہے"

"خیریت اسی میں ہے کہ یہاں سے جلد از جلد روانگی کر لی جائے" نظامی صاحب دھیرے دھیرے لیٹ گئے اور اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگے "ورنہ فوتیدگی کا خطرہ ہے"

بالکونی سے دھند اندر آتی تھی اور اوپر کہیں دھند دھوپ میں آتی تھی تو اتنا منظر چمکنے لگتا تھا۔ خانقاہ چقچن ان دنوں پینٹ کی جا رہی تھی اور اس کے سینکڑوں برس پرانے نقش و نگار پر سبز رنگ تھوپا جا رہا تھا۔ اور جہاں جہاں رنگ کیا گیا تھا وہ حصہ کیمیائی اجزا کی کاٹ کی وجہ سے اپنی نشست چھوڑنے پر آمادہ تھا۔ میں نے فدا صاحب سے گزارش کی کہ وہ اپنی افسری دکھائیں اور اس خانقاہ کو سبز رنگ کے پینٹ سے بچائیں۔

ہم خانقاہ سے باہر آئے تو کچھ اور دھند چٹانوں کے آس پاس سے اتری اور اس کی بالکونیوں کے راستے اندر جانے لگی۔ شاید اس دھند میں کچھ پانی بھی تھا جو ٹپکنے لگا اور ہم بھیگتے ہوئے نیچے اترنے لگے۔

دوپہر کے کھانے کا بندوبست فدا صاحب کی رہائش گاہ پر تھا۔ ہم ایک مختصر سی بیٹھک میں دبکے بیٹھے تھے کیونکہ باہر تیز جھکڑ چل رہے تھے جن سے وادی خپلو کی ڈھلوانوں پر کھڑے پاپلو کے درخت دوہرے ہوئے جاتے تھے۔ کھڑکیاں بند تھیں لیکن ہوا ان کے کواڑوں کو دھکیلتی تھی۔ بیٹھک بالکل سادہ اور بنیادی ضرورتوں سے مزین تھی۔

"تنخواہ میں آپ کا گزارہ ہو جاتا ہے فدا صاحب؟" نظامی صاحب نے پوچھا۔

فدا صاحب کہنے لگے "میری تو آدھی تنخواہ بچ جاتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے پیسوں کا کروں کیا؟ گھر سرکاری ہے۔ صرف کھانے کا خرچ ہے تو وہ اس وادی میں کتنا ہو جائے گا"

یہ ذرا قابل حیرت بات تھی کہ اسلام آباد کے قیام کے دوران میں نے وہاں ایک بھی مطمئن سرکاری افسر نہیں دیکھا تھا۔ ہر افسر کے پاس کم پلاٹ تھے کم بیڈ روم



آپریشن فلاں امریکی سرجن کی بجائے فلاں برطانوی ڈاکٹر سے کروا رہا تھا۔ کیونکہ وہ بے چارہ فلاں امریکی سرجن کو افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔

اس دوپہر کا کھانا ان خطوں کی وہ مخصوص خوراک تھی جو اہل خپلو اپنے معزز مہمانوں کو پیش کرتے ہیں۔ چاہے یہ مہمان ہم جیسے ہی کیوں نہ ہوں۔۔۔ ابلے ہوئے چاول۔ گوشت اور مقامی ساگ۔۔۔ ہم نے جی بھر کر کھایا اور غنودگی ایک خوبصورت پسندیدگی کی صورت ہمارے بدن پر حاوی ہونے لگی۔ نظامی صاحب قریبی پلنگ پوش تک رینگتے ہوئے گئے اور دراز ہو گئے' مطیع عینک اتار کر آنکھیں جھپکنے لگا۔ میرے لبوں پر بھی ایک احمقانہ سوئی سوئی سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اور کرس ہم سب کی طرف دیکھتا تھا' اور اپنے سنہری بالوں کو اپنے ماتھے سے سمیٹتا تھا۔

"آپ غالباً کچھ دیر کے لیے سستانا پسند فرمائیں گے" فدا صاحب کچھ سرکاری کام نپٹا کر واپس آ گئے۔

"اگر ہم سستانا پسند نہ کریں تو کیا ہو سکتا ہے؟"

"آج چار بجے خپلو کے راجہ کے محل میں آپ چائے پر مدعو ہیں۔۔۔ ابھی ڈیڑھ بجا ہے۔ ہم اس دوران سورمو کے پل تک جا سکتے ہیں جو سیاچن گلیشیئر کے راستے میں ہے اور مشہ برم کی چوٹی بھی دیکھ سکتے ہیں"

"مشہ برم کی چوٹی تو دیکھنا چاہیے" میں نے ذرا بیدار ہو کر کہا "نظامی صاحب دیکھی ہے مشہ برم کی چوٹی؟"

"بادشاہو سو جاؤ" وہ بمشکل بولے۔ "چوٹیاں ساری ایک جیسی ہوتی ہیں اور یہ تجربے کی بات بتا رہا ہوں۔ کل دیکھ لیں گے"

"لیکن کل تو ہم چلے جائیں گے"

"ضرور دیکھنی ہے مشہ برم کی چوٹی؟"

"ہاں ضرور دیکھنی ہے"

فدا صاحب کی سرکاری جیپ بڑی آہستگی سے نیچے آنے لگی اور اس کا انجن بند تھا۔ انجن کے شور کے بغیر اس میں سواری ایک اڑن کھٹولے کی طرح تھی۔ نیچے دریائے شیوک کے کنارے پہنچ کر ڈرائیور نے انجن سٹارٹ کیا اور ہم سورمو کی جانب سفر کرنے لگے۔ ریسٹ ہاؤس کے قریب سے گزر کر جب ہم ذرا آگے گئے تو جہاں دریا کا پاٹ چوڑا تھا وہاں پھولے ہوئے مشکیزوں سے بنی ہوئی ایک کشتی مسافروں کی

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



تھے اس کے بچے اتنی بڑی یونیورسٹی میں نہیں پڑھتے تھے۔ وہ اپنے دل کا باقی پاس منتظر تھی۔ کشتی کا مالک ہاتھ میں ایک لمبا سا بانس لیے کھڑا تھا۔ وہ اسسٹنٹ کمشنر کی جیپ دیکھ کر کمر تک جھک گیا۔ منگیروں کی یہ کشتی ازمنہ قدیم سے ان علاقوں میں دریا عبور کرنے کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہے۔ اور اب بھی اگر آپ کو خپلو کے نواح میں دریا کے پار جانا ہے تو بس یہی طریقہ ہے۔ مقامی مسافر کے لیے دو روپے اور "انگریز" یعنی سیاح حضرات کے لیے بیس روپے... اس کشتی کو "انڈس رافٹ" بھی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ اسے یہاں تو شیوک رافٹ کہنا چاہیے۔

خپلو سے آگے سڑک چٹان کے ساتھ چپٹ گئی اور چٹان بلند ہوتی چلی گئی اور یہاں سڑک کے ساتھ عمودی گہرائی تھی۔ نیچے بہت نیچے شیوک کا پاٹ تھا اور اس میں پانی کہیں دور تھا۔ بلکہ پانی تو کہیں نظر ہی نہیں آتا تھا۔ ایک وسیع اور ویران صحرا نظر آتا تھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی ریت ہی ریت تھی اور یہ صحرا تقریباً ایک کلومیٹر نیچے تھا۔

نظامی صاحب چپ بیٹھے تھے۔

مطیع، کرس کا ہاتھ دیکھ رہا تھا۔ فدا صاحب کے ساتھ ان کا گول مٹول بچہ کرامت حسین تھا، جو ان کی گود میں بیٹھا ہمیں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ہم سورمو کے چھوٹے سے گاؤں کی خاموشی میں سے گزر کر آگے چلے گئے۔ گاؤں کے داخلے پر ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ اسے ایک لداخی سرائے کہا جائے تو شاید اس کی تصویر زیادہ واضح طور پر سامنے آئے۔ راستے کے ایک جانب ایک چھوٹا سا کچا کمرہ جہاں چائے اور خوراک تیار کی جاتی ہے، اس کمرہ میں چند بستر اور راستے کے پار ذرا بلندی پر انگور کی بیلوں کے نیچے چند چارپائیاں جہاں آپ آرام سے چائے پی سکتے ہیں۔ ان علاقوں میں بہت کم لوگ آتے ہیں اور اسی لیے یہ سرائیں مسافروں کی راہ تکتی رہتی ہیں۔ یہاں مقامی لوگ بھی آتے ہیں جو پیدل راستوں سے کسی دور کی وادی سے خپلو پہنچتے ہیں اور پھر وہ سکردو تک چلے جاتے ہیں اور سکردو ان کے لیے تہذیب کی آخری چوکی ہوتی ہے۔

ڈرائیور نے جیپ روک دی اور یکدم اس کے ساتھ ہی شیشے کی طرح نازک لیکن بالکل ٹھہری ہوئی و منجمد خاموشی میں ہم سب کان لگائے کچھ نہ سنتے تھے۔ فدا صاحب جیپ سے اترے۔ "یہ سامنے دریائے شیوک کے صحرا کے پار ان پہاڑوں میں جو چوٹی جھانکتی ہے وہ مشہ برم ہے"



میں ذرا آگے ہوا تو فدا صاحب نے میرا کاندھا پکڑ لیا "احتیاط... آگے کچھ نہیں ہے"

نظامی صاحب نے مایوسی سے سر جھٹکا۔ "بادشاہو یہ تو بڑی شرمیلی چوٹی ہے... سامنے ہی نہیں آتی اور اس کے لیے آپ نے ہمیں سونے ہی نہیں دیا"

مشہ برم کی اس جھلک کے بعد ہم سورمو کے پل تک گئے۔ پل کے پار ایک ویران راستہ اوپر سیاچن گلیشیر تک جاتا تھا جو ان دنوں دنیا کا بلند ترین محاذ جنگ تھا۔ واپسی پر سورمو کے گاؤں کے آغاز پر ایک مقامی شاعر تہور علی خاں اور ایک مقامی مولانا ہمارے منتظر تھے۔

"آپ ہمارے ساتھ چائے ضرور پیجئے..." انہوں نے ہمیں دعوت دی۔

اخروٹ کے ایک تناور درخت کی چھاؤں میں ایک ہی قالین بچھا تھا، گھاس میں خنکی تھی۔ ہم سب ایک دائرے کی صورت میں بیٹھ گئے۔ مولانا صاحب سیاہ پگڑی اور سیاہ کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ نہایت پڑھے لکھے اور خوشگوار طبیعت کے تھے اور پریوں پر یقین رکھتے تھے۔ بلکہ انہوں نے ہمیں متعدد ایسے قصے سنائے جن میں انہوں نے پریوں کو مار بھگایا تھا۔ شاعر جو، کاچو تہور حسین کہلاتے تھے ذرا شرمیلے اور ذرا گہرے تھے۔ وہ سنتے زیادہ تھے اور بولتے کم تھے۔ پہلے ہمارے سامنے شہتوتوں سے لبریز تھال رکھے گئے۔ میں پھل زیادہ شوق سے نہیں کھاتا لیکن سورمو کے شہتوت ایسے تھے کہ آپ آخری شہتوت تک تھال اور منہ کے درمیان ایک تانتا باندھے رکھیں گے۔ یہ اتنے شہد میٹھے اور منہ میں گھل کر فرحت دینے والے تھے کہ ہم اپنے میزبانوں سے غافل ہو گئے۔ اس دوران میٹھے کیک اور کسیر روٹی کے ہمراہ چائے آ گئی.... ہوا آہستہ تھی مگر شہتوت اور خوبانیوں کے درختوں میں سے آتی تھی اور اس میں مشہ برم کی قربت کی ٹھنڈک تھی۔ ہم اس تناور اخروٹ کے سائے میں بیٹھے تھے اور یہ ایک عجب سمرقندی قسم کا ماحول تھا جس میں ہم سانس لیتے تھے۔

یہاں سے لداخ تک کا فاصلہ تیس میل کے قریب تھا۔

چند عورتیں اور بچے شہتوت اتار کر گھروں کو لوٹ رہے تھے اور عورتوں کے کانوں میں پھول اڑسے ہوئے تھے۔

"کیا یہاں اس زمانے کی کوئی عمارت یا یادگار بھی موجود ہے جب ان خطوں میں مہاتما بدھ کے پیروکار بستے تھے؟"

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



ہمارے میزبان سوچ میں پڑ گئے پھر مولانا نے سر اٹھا کر کہا "یہاں کچھ گھر ایسے ہیں جن میں چبوترے سے بنے ہوئے ہیں اور ان پر بیٹھ کر بدھ راہب شراب پیا کرتے تھے"

"سبحان اللہ" نظامی صاحب چہکے۔

"کیا مطلب" مولانا نے انہیں گھورا۔

"میرا مطلب ہے لاحول ولا..." نظامی صاحب مسکرائے۔

سورمو ہمارے سفر کی آخری حد تھا یہاں سکردو بہت دور لگتا تھا اور لاہور تو تب دور لگے جب انسان سکردو میں ہو۔ ہمیں اب واپس جانا تھا۔

سورمو سے باہر میں نے اس سورمو سرائے کو حسرت سے دیکھا' جس میں قیام ایک خواہش تھا اور سرائے میں کون ہے جو زیادہ ٹھہرنا نہیں چاہتا لیکن ٹھہر نہیں سکتا اور میں بھی ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ ہم خپلو واپس آئے تو سنگریزوں کی کشتی شیوک کے عین درمیان میں تھی اور پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کدھر کو جا رہی ہے یا شاید ادھر کو آ رہی ہے۔ یہاں سے سڑک اوپر اٹھی اور ہم تھوڑی دیر کے بعد پہلی بار خپلو کے بازار میں سے گزر رہے تھے۔

"کمال ہے اصل خپلو تو یہاں ہے اور ہم اس کے دامن میں ہی گھومتے رہے" مطیع کہنے لگا۔ یہاں ایک بڑے قصبے کی تمام تر سہولتیں دکھائی دے رہی تھیں اور بازار خاصا بارونق تھا۔ راجہ کے محل کے راستے میں ہمیں دو تین نہایت عالی شان اور قدیم مکان نظر آئے جو غالباً راجہ کے خاندان کے تھے۔ ایک تنگ سی گلی میں گھس کر جیپ رک گئی۔ ایک پھاٹک کے قریب جا کر فدا صاحب کہنے لگے "یہ وہ حصہ ہے جہاں اصطبل ہوا کرتا تھا۔ یہی محل میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔"

ہم اس راستے سے اندر گئے تو ہمارے سامنے ایک وسیع چبوترے پر ایک ایسی عمارت کھڑی تھی جو یہاں کی نہیں لگتی تھی۔ شاید تبت یا منگولیا میں کہیں تھی اور اسے جوں کا توں اٹھا کر یہاں رکھ دیا گیا تھا۔ ایک سفید دیوار میں سالخوردہ لکڑی کی محرابیں اور ان کے آگے چوبی جالیاں ایک بہت بڑا جھروکا جو چھت سے شروع ہو کر زمین تک آتا تھا اور جس میں برآمدے کھڑکیاں اور محرابیں تھیں اور اس دلفریب رہائش گاہ کے پس منظر میں قراقرم کی بلندی اور شاندار دہشت تھی۔ میں اس عمارت تک گیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو صدر دروازے میں سے کرس داخل ہو رہا تھا۔ اور اس



کے دونوں جانب دو عظیم چنار کھڑے تھے۔ سیڑھیاں طے کر کے ہم چبوترے تک آ گئے۔

"داخلے کا دروازہ کہاں ہے؟"

میں نے ایک بند دروازے کو دھکیلنے کی کوشش کی۔

"یہ محل تو بند پڑا ہے" فدا صاحب نے بتایا "راجہ صاحب کی رہائش ادھر ہے"

ادھر محل کے پہلو میں ایک نیا مکان تھا۔ دروازے پر مارخور کے سینگ آویزاں تھے۔ یہ ایک عجیب' ہر شے سے کٹا ہوا اور ہر آب و ہوا سے مختلف اور ہر آبادی سے جدا اور کسی اور تاریخ اور وقت کا ایک جزیرہ تھا اور یہاں بھی ان خطوں کی خاموشی گہری ہو رہی تھی اور اس چپ میں ہوا کی دھیمی چال تھی یا کہیں زیر زمین چلنے والے پانی کی آواز تھی۔ اور یہاں ایک خوبصورت ٹھہراؤ تھا جو بالکل الگ اور تنہا تھا اور اس ماحول میں ہم چونکے ہو کر ادھر ادھر دیکھتے تھے کہ ہم کہاں آ گئے ہیں اور اس ٹھہرے ہوئے طلسم میں ہم جان نہ سکے کہ کب راجہ صاحب آئے ہیں اور ہم سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ سرخ و سفید نیلی آنکھوں والے ناصر علی خان جو مرحوم راجہ صاحب کے بڑے بیٹے ہیں۔ ان کے جانشین تو ہیں لیکن راجاؤں کا عہد چونکہ اختتام پذیر ہو چکا ہے اس لیے وہ بڑے مزے سے پولیس میں سب انسپکٹری کرتے ہیں۔ اور ان کے چھوٹے بھائی محبوب علی خان بچوں کو پڑھاتے ہیں.... یعنی دونوں نے حکمرانی کے محکمے ہی پسند کیے ہیں۔

ایک طویل برآمدے میں سے گزر کر ہم والان کے اوپر کھلنے والے ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئے۔ برآمدے میں بھی مارخوروں کے سر اور سینگ آویزاں تھے۔ راجہ صاحب اردو نہیں جانتے تھے اور ہم مقامی بلتی زبان سے ناواقف تھے اس لیے زیادہ تر گفتگو مسکراہٹوں کے ذریعے ہوئی اور کچھ ترجمانی فدا صاحب نے کی۔ ہم بے حد تھک چکے تھے اور بس یہی وہ جگہ تھی جس کے لیے ہم ساری زندگی مارے مارے پھرتے رہے تھے۔ اور یہی وہ آخری آرامگاہ تھی جس کے بعد انسان کہیں نہیں جاتا اور اپنے بدن کی تھکاوٹ کے ساتھ مٹی میں مل جاتا ہے۔ اس مختصر کمرے میں راجہ صاحب کی چند پرانی تصاویر آویزاں تھیں۔ اور ان کے اوپر ایک تختے پر آرائش کی مختلف اشیاء قرینے سے سجی تھیں اور ان میں سے کسی ایئر فریشنر کا خالی ڈبہ بھی تھا۔

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



جھروکا نما کھڑکی وادی نپلو کی وسعت پر کھلتی تھی... ایک ملازم کے ہاتھوں میں ایک بڑا سا تھال تھا اور وہ کمرے میں داخل ہوا اور اس تھال کو ہمارے سامنے میز پر رکھ دیا... اس میں سرخ چمکتی ہوئی سیب نما چیری کا ڈھیر تھا۔

"ہمارے دادا جان چیری کے تین پودے سرینگر سے لائے تھے... یہ ان کا پھل ہے جو ہم اپنے خاص مہمانوں کی خدمت میں پیش کرتے ہیں" راجہ صاحب نے چیری کا ایک گچھا اٹھا کر میری پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ چیریوں کو دیکھ کر نظامی صاحب بھی ہوشیار ہو گئے۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ کہیں کسی میز پر اتنی زیادہ چیری بھی ہو سکتی ہے... چنانچہ ہم اگرچہ بڑی متانت اور دانش مندی سے گفتگو کرتے جا رہے تھے لیکن ہماری آنکھوں میں ندیدے بچوں والی چمک تھی اور ہم چیریوں کے تھال پر ہمہ وقت نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد چائے آئی اور صندوق آیا... یہ بھی مقامی خوراک تھی اور بے حد لذیذ تھی۔ میں راجہ صاحب سے ان کے خاندان اور وادی نپلو کے بارے میں پوچھتا رہا... "لیکن آپ کی آنکھیں نیلی کیوں ہیں؟"

"یہ میری والدہ کی جانب سے ہیں" وہ مسکرائے۔

اس دوران ان کے چھوٹے بھائی محبوب علی خان بھی آ گئے اور وہ ہمیں محل دکھانے کے لیے لے گئے... مخدوش سیڑھیاں ۔ بے شمار کمرے۔ کچی چھتیں۔ یہاں درمیان میں خراج کے طور پر وصول شدہ گندم کا ذخیرہ ہوتا تھا۔ پہلے بہت عرصہ پیشتر یہ محل اوپر ان بلندیوں پر ہوتا تھا اور پھر اسی نقشے کے مطابق اسے یہاں تعمیر کیا گیا۔ اور وہاں بلندی پر کچھ آثار تھے جو دکھائی دیتے تھے ۔ چند دیواریں... قلعہ نما برج... اس بلندی سے آس پاس کا منظر کتنا عظیم الشان ہو گا۔ محل کے مختلف کمروں میں محراب نما کھڑکیاں تھیں جو وادی نپلو اور محل کے باغ پر کھلتی تھیں اور ان کھڑکیوں میں کیا شاندار جلال کے منظر تصویر ہو چکے تھے' آپ دیکھتے رہیے اور پھر بھی بے یقینی ساتھ نہ چھوڑے۔ قراقرم کا رعب اور شیوک کا بہاؤ اور ان کے اوپر دور تک چوٹیاں' ننگی اور برف سے ڈھکی ہوئی...

میں ایک ایسے ہی کمرے کی لکڑی کے فرش پر دیر تک لیٹا رہا جب کہ میرے ساتھی محل کے کسی اور حصے میں محو گفتگو تھے اور وہاں سے جو منظر دکھائی دیتے تھے۔ جو تصویریں سامنے تھیں' محرابوں کی گولائی میں اور بالکونی کی جالی میں انہیں میں دیکھتا رہا۔ اس کیمرے کی طرح میرا لینز کھلا رہا جس کے اندر ایک ایسی فلم ہے جس پر دیر



سے نقش ثبت ہوتا ہے... اور پھر دھیرے دھیرے ہوتا ہے۔ مجھے غرناطہ کے قصر الحمرا کا وہ برج یاد آیا جس میں میں نے کچھ وقت گزارا تھا... یہاں غرناطہ کی نسبت منظر زیادہ شاندار تھا۔ محل کی کچی چھت پر ہوا تیز تھی اور اس میں ایک خطرے سے خبردار کرنے والی گونج تھی۔ چھت پر بھی ایک کچا کمرہ تھا جس کے پہلو میں لکڑی کی ایک منقش محراب بس نیچے گرا ہی چاہتی تھی۔ چھت سے اوپر قراقرم کی چٹانیں دھوپ میں تھیں مگر نیچے پوری وادی اور دریائے شیوک سائے میں آ چکے تھے۔

اور جب ہم نیچے محل کے باغ میں آئے' ایک ایسے باغ میں جو کچھ بے ترتیب تھا کچھ بے آباد مگر سرسبز تھا تو وہ بھی سائے میں تھا اور اس کی گھاس میں سے ٹھنڈک پھوٹتی تھی اور ہمارے جوگرز میں سرایت کر کے پاؤں کو سرد کرتی تھی' اوپر سے چشموں کا پانی رکتا' اٹکتا اور ایک خاص سُر میں بہتا نیچے آ رہا تھا اور اسے مختلف نالیوں کے ذریعے پورے باغ میں پھیلا دیا گیا تھا۔ یوں یہ ایک چھوٹا سا شالیمار تھا جو قراقرم کے پھولوں اور مہکار میں بسا ہوا تھا۔ یہاں خاص طور پر گلاب بہت بڑا اور اتنا زیادہ تھا کہ پودے دوہرے ہو رہے تھے اور چٹانوں کے سائے میں اس کا رنگ بہت شوخ اور گہرا تھا۔ اور ایک جانب چیری کے دو شاندار درخت کھڑے تھے اور حیرت ہوتی تھی کہ اتنے بڑے درخت کا پھل اتنا چھوٹا اور منی ایچر کیوں ہے۔

اس باغ میں بھی ان خطوں کی تنہائی اور اداسی تھی... یہ آپ کو خوبصورتی کے اس رخ سے آشنا کرتا تھا جس رخ کا انجام فنا ہے۔ فنا تو ہر شے کو ہے لیکن اس باغ کو دیکھئے تو لگتا ہے کہ ابھی یہ آخری لمحہ ہے۔ آخری دم ہے اور پھر فنا بلند قراقرم سے جھانکے گی' اترے گی اور اسے اپنی لپیٹ میں لے کر دنیا سے اوجھل کر دے گی... یا پھر یہ فنا میرے اندر تھی اور اب قریب آ رہی تھی ورنہ اس باغ کے حسن کو تو دوام تھا... فنا میرے اندر تھی۔ یہاں ایک اور احساس بھی جی کو تنگ کرنے والا تھا کہ قراقرم کی چٹانوں میں اس بے ترتیب گلشن کی گھنی ٹھنڈک اور پانی کی سرسراہٹ میں اور اس کے بے حِس گل بوٹوں میں اور چیری کے درختوں کے آس پاس کوئی اور بھی ہو۔ کوئی اور جو حسن کی آزردگی میں شریک ہو' وہ ان چپ بوٹوں کی مانند بے شک چپ رہے' پر شریک ہو... صرف شراکت سے اس کی آزردگی ختم ہو سکتی ہے ورنہ یہی اداسی اور فنا کی قربت کی کیفیت۔

میں اس باغ سے نکلا تو میرے دل میں ایسا ملال تھا جو دنیا چھوڑنے پر دل میں

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



ہوتا ہوگا۔ خپلو کے بازار کی دکانیں بند ہو چکی تھیں جب ہم محل سے نیچے آئے۔

اگلی صبح میں ذرا سویرے بیدار ہوا اور چپکے سے باہر نکل گیا۔ ریسٹ ہاؤس سے نیچے سور مو جانے والی سڑک دریا کے ساتھ ساتھ تھی۔ اس کے اوپر چٹانیں معلق تھیں اور اسی لیے یہاں ابھی نیم تاریکی تھی۔ ایک صاف پانی کے تالاب کی تہ میں بڑے بڑے پتھر دکھائی دیتے تھے اور دائیں طرف کسی باغ میں بلبل بولے چلی جاتی تھی۔ یہاں امان کلینک تھا جہاں ایک معروف غیر ملکی ڈاکٹر اپنی مہنگی پریکٹس چھوڑ کر ہر برس دو ماہ کے لیے آتا تھا اور اہل خپلو کے زخموں پر مرہم رکھتا تھا اور اس کے بیماروں کو شفا دیتا تھا۔ میں ذرا آگے گیا تو بوڑھا ملاح ایک مشکیزے کو منہ لگائے اس میں ہوا بھرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کا چہرہ لال گلال ہو رہا تھا۔ مشکیزوں کی کشتی ریت پر پڑی تھی۔ جہاں چٹان کا سایہ ختم ہوا اور میں صبح کی دھوپ میں آیا وہاں سے میں واپس لوٹ آیا۔

سکردو واپسی کے لئے ہم اسی ویگن میں سوار تھے جو ہمیں خپلو لائی تھی۔ اور اب خواجہ صاحب کی ہدایت کے مطابق ڈرائیور ہمیں دریا پار کے راستے سے واپس لے جا رہا تھا تاکہ ہم مختلف علاقوں کو دیکھ سکیں۔ دوسری جانب جانے کے لیے ہم نے کھرفق کے پل کو عبور کیا جہاں "ہوشے ۶۵ کلومیٹر" کا سنگ آویزاں تھا۔ ہوشے وہ معروف گاؤں ہے جس پر مشہ برم کی چوٹی جھکی ہوئی ہے اور یہ بیس کیمپ کے طور پر جانا جاتا ہے۔ کھرفق کا پل ہماری ویگن کے بوجھ سے جھولتا تھا۔

یہ راستہ بھی انتہائی خوبصورت تھا۔ راستے میں جو گاؤں پڑتے تھے وہاں کٹائی ہو رہی تھی اور مرد' عورتیں' بچے کھیتوں میں اپنے جانوروں کے ساتھ جتے ہوئے تھے۔ ہاں اس مشقت کے دوران بھی وہ کانوں میں پھول ضرور لگاتے تھے اور ان کے کچے گھروں کی چھتوں پر پھولوں کے گملے بھی سجے تھے۔

دوپہر کو ہم کیرس پہنچ گئے۔

سجادیہ ہوٹل میں زرچون کھانے کے بعد ہم کیرس کی مشہور خانقاہ دیکھنے کے لیے گاؤں کے اندر گئے۔ وادی خپلو کے قدیم باشندے بدھ مت کے پیروکار تھے۔ ۷۸۶ھ میں سید علی ہمدانی کشمیر سے دعوت اسلام کے لیے بلتستان آئے اور خپلو کے راجہ



اور رعایا نے انہی کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔ ان کے بعد میر شمس الدین محمد عراقی بت شکن آئے۔۔۔ مسجد چقچن پر انہی کے نام درج ہیں۔ بلتستان کے مشہور بزرگ میر مختار اخیار انہیں کی اولاد میں سے تھے۔ وادی خپلو میں بھی بہت سے علماء پیدا ہوئے جنہوں نے اس خطے کو علم و ہنر سے آراستہ کیا۔ ان میں میر محمد نور بخش سرفہرست ہیں وہ ایک بلند پایہ ادیب اور شاعر تھے اور ان کی لکھی ہوئی قرآن پاک کی تفسیر کا قلمی نسخہ کا نفیہ لائبریری تلیس میں موجود ہے۔

میر مختار ایک بلند پایہ شاعر اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فلسفی بھی تھے۔ انہوں نے اسلامی فقہ پر ایک کتاب تحریر کی اور دیوان مختاریہ کے نام سے ان کا شعری مجموعہ بھی موجود ہے۔ وہ ایک فنکار بھی تھے اور بلتستان کی کئی عظیم الشان خانقاہیں ان کی تعمیر کردہ ہیں۔

خانقاہ کے راستے میں پیر سید مختار اور ان کے بیٹے کے مزار ہیں جو بے حد خستہ حالت میں ہیں۔ ان کے چوبی دروازے اور جالیاں کھلے آسمان تلے پڑے ختم ہو رہے ہیں۔ ان مزاروں پر مختلف رنگوں کے پرچم لہرا رہے تھے۔۔۔ کیرس کی معروف خانقاہ یہاں سے قریب ہی تھی اور یہ خانقاہ بے حد شاندار اور عظیم تھی۔ اس کا اندرون لکڑی کے اتنے اونچے ستونوں پر قائم ہے کہ وہاں تک نگاہ دیر سے جاتی ہے۔ خانقاہ کے ایک جانب اعتکاف کے لیے کوٹھڑیاں ہیں جہاں خواتین بیٹھتی ہیں۔ یہاں پر دو منبر تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس مسجد میں شیعہ اور سنی مسلک کے لوگ اکٹھے نماز پڑھتے ہیں۔۔۔ بلتستان کے لوگوں میں مذہبی رواداری' اخلاقیات کا ایک حصہ ہے۔۔۔ کیرس کی یہ خانقاہ ہمارا عظیم ورثہ ہے اور اس کی دیکھ بھال مناسب طریقے سے ہونی چاہئے۔۔۔

دھوپ تیز تھی لیکن تمام سائے بے حد سرد تھے۔

ایک مقام پر ویگن دریا کے ریتلے پاٹ پر چلنے لگی۔۔۔ ریت کے ایک سمندر میں ریت اڑاتے۔۔۔ ایک بادبانی کشتی کی طرح اس سمندر کو چیرتے۔

دن کے دو بجے تھے جب ہم سکردو کے بازار میں داخل ہوئے۔

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



## "جھیل کچورا سے راکا پوشی تک"

"وہ ..... اس چٹیل پہاڑ کی چوٹی پر کھرفوچے ہے۔"

"کھرفوچے؟"

"ہاں اس کے معنی عظیم قلعے ہیں۔"

تیز دھوپ میں ایک ایسا پھیلاؤ جو پھیلتا چلا جاتا ہے اور ایک ایسی وسعت جو ہر لحہ وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہے اور اس وادی میں وہ چٹیل پہاڑ جس کی سلیٹی چٹانوں کے اوپر دیوار چین سے مشابہ ایک قلعے کی دیوار' بلندی سے خوفزدہ ان سلیٹی چٹانوں کے ساتھ چمٹی ہوئی دکھائی دیتی تھی'.....میں اس سے نسبتاً کم بلندی پر ایک سینٹرل ایشین باغیچے کی کچی دیوار سے ٹیک لگائے اسے دیکھ رہا تھا اور میں بھی دھوپ میں تھا۔

درمیان میں کہیں نیچے سکردو کا بازار سنسان پڑا تھا۔

ہم ابھی ابھی کاظمی کی اس بلند اور دھوپ میں چمکتی اور سائے میں ٹھٹھرتی آماجگاہ میں دوپہر کا کھانا کھا کر فارغ ہوئے تھے۔ ہم نے چونکہ خصوصی بلتی سوپ "بالے" پیا تھا اور اخروٹ سے بنا ہوا مزیدار پراپو کھایا تھا اس لئے ہماری روحیں بہت بلند تھیں یعنی ہم ہائی سپرٹس میں تھے۔ آج دوپہر جب ہم وادی خپلو سے سکردو بازار میں پہنچے تھے تو کاظمی ہینڈی کرافٹ کی ایک دوکان پر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ اس ہینڈی کرافٹ شاپ پر ہم نے مہاتما بدھ' کے چند سر دیکھے جو میڈ ان ٹیکسلا تھے..... اور دوکان دار کا کہنا تھا کہ وہ پرانے ہیں اور سکردو کے کسی کھنڈر میں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ دوپہر کا کھانا کاظمی کے ہاں تھا اور ان کے ہاں بہت سارے دوست جمع تھے جو ہمیں ملنے آئے تھے۔ نیچے سکردو بازار میں نظامی صاحب نے کہا تھا کہ انہیں تو بالکل بھوک نہیں ہے لیکن جب ہم باقاعدہ کوہ پیمائی کر کے کاظمی صاحب کی رہائش گاہ



پر ہانپتے ہوئے پہنچے اور وہاں ایک سینٹرل ایشین طرز کا باغیچہ ہمارا منتظر تھا اور اس میں تبت کے جنگلی پھول اور سلاد ساتھ ساتھ تھے تو نظامی صاحب کہنے لگے۔ "مجھے بالکل بھوک ہے۔"

جب ان کا سانس بحال ہوا تو کہنے لگے "اندازہ کرو۔"

میں نے ہانپتے ہوئے پوچھا "کیا اندازہ کریں؟"

"یہ جو کاظمی صاحب نے ماؤنٹ اولمپس پر گھر بنا لیا ہے"..... میں نے کہا "بادشاہو ادھر مہمان شمان تو کم ہی آتے ہوں گے۔"

"تو کیا آپ اب کھرفوچے دیکھنا پسند کریں گے؟" کاظمی نے پوچھا۔

"دیکھ تو لیا ہے یارا..... یہ سامنے جو نظر آ رہا ہے۔ پہاڑی پر۔" نظامی صاحب نے اپنے آسودہ پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا۔

"نظامی صاحب۔ کسی انگریز نے لکھا ہے کہ اس قلعے کی چوٹی سے دنیا کا بہترین منظر دکھائی دیتا ہے۔"

"کس انگریز نے لکھا ہے؟ ذرا حوالہ تو دو"

"کسی نہ کسی انگریز نے تو لکھا ہی ہو گا نظامی صاحب" میں نے جھینپتے ہوئے کہا "بہر حال قلعہ دیکھنا ضرور ہے"

جتنی دیر میں اور جتنی مشقت سے ہم کاظمی کے مکان سے اتر کر نیچے بازار میں آئے' پھر گراؤنڈ کے قریب سے گزر کر اس مقام پر آئے جہاں سے قلعے کا راستہ دکھائی دیتا تھا' اتنی دیر میں ہم خلاص ہو چکے تھے۔ کاظمی کے کاندھے پر ایک فلاسک تھی۔

"قلعے تک جانے کے لیے پانی بہت ضروری ہے۔ چڑھائی اتنی شدید ہے اور سورج اتنا تیز کہ انسان خشک ہو جاتا ہے.....کچھ واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ پانی کے بغیر....."

"ہوئے ہیں ناں واقعات....." نظامی صاحب فوری طور پر فکر مند ہو گئے "ویسے اوپر ہے کیا کاظمی صاحب؟"

"اوپر کھرفوچے ہے جسے تقریباً تیرھویں صدی میں مقپون بوخا نے تعمیر کیا تھا"

"تو بادشاہو ہم کونسا کہتے ہیں کہ نہیں تعمیر کروایا تھا..... ہمیں یقین ہے پورا پورا ..... اور جسے یقین نہیں وہ بے شک اوپر جا کر دیکھ لے' کیوں بھئی مطیع؟"

"بالکل جناب..... مجھے تو ویسے بھی تھوڑی بہت شوگر ہے اور آج صبح خپلو سے روانگی کے وقت جلدی میں ٹیکہ بھی نہیں لگا سکا اس لیے ..... آپ ہو آؤ تارڑ

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



صاحب"

میں نے مرداد صاحب کی جانب نگاہ کی تو وہ ٹھوڑی کو مسلسل کھجلائے چلے جاتے تھے' کہنے لگے "میں بہت دفعہ دیکھ چکا ہوں آپ دیکھ آئیں"

اور جب کاظمی میرے آگے آگے دھوپ میں تپتی چٹان میں چڑھتے' بلند ہوتے پتھریلے راستے پر چلتا تھا۔۔۔۔۔ اور میں اس کے پیچھے اور بہت پیچھے منہ کھولے پسینے میں شرابور ہوا اور زندگی سے خالی جسم کے ساتھ اپنے پتھرپاؤں بمشکل اٹھاتا تھا۔ تب میں نے جانا کہ نظامی' مطیع اور مرداد مجھ سے سیانے نکلے تھے اور کاظمی نے میرے ساتھ ایک تاریخی فریب کیا تھا' مجھے یقین تھا کہ میں قلعے تک زندہ نہیں پہنچ سکتا۔ کاظمی مجھے ہر موڑ پر پانی پلا دیتا اور پھر میری حالت زار بلکہ حالت زار زار کا اندازہ کئے بغیر قلعے کی تاریخ دہرانے لگتا۔

"تو جناب مقپون بوخا اسے بنانے والا تھا اور اس کے اندر سنگ مرمر کا استعمال ہمارے عظیم ہیرو علی شیر خان انچن نے کرایا"

"پانی ۔۔۔۔۔"

"جس راستے پر ہم چل رہے ہیں تارڑ صاحب اسے انچن کی مغل ملکہ گل خاتون نے بنوایا تھا"

"پانی ۔۔۔۔۔"

"اور تارڑ صاحب اس کے نیچے جہاں سے ہم چلے تھے وہاں بھی ایک محل تھا جسے اسی گل خاتون نے بنوایا تھا اور اس کے نام کی مناسبت سے وہ محل مینڈوق کھر یعنی پھول محل کہلاتا تھا۔۔۔۔۔"

"پانی۔۔۔۔۔"

"تارڑ صاحب پانی بھی پیو اور تاریخ بھی سنو۔۔۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ کھر فوچے۔۔۔ یعنی عظیم قلعہ عالم میں انتخاب تھا اس کے بیچ میں ایک پانچ منزلہ محل تھا' جسے ۱۸۴۲ء میں ڈوگرہ فوج نے جلا کر راکھ کر دیا۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔"

مجھے یقین تھا کہ اگر میں اس وقت شدید کمزوری اور پیاس کے باعث انتقال کر جاتا تو کاظمی مجھ پر جگت کر کہتا۔۔۔۔۔ بڑے افسوس کی بات ہے تارڑ صاحب آپ کو سکردو کی تاریخ میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔۔۔ ویسے جاتے جاتے انچن کی ملکہ گل خاتون کا ایک قصہ تو سن لیں۔۔۔

سکردو بہت نیچے رہ گیا تھا اور اس کے ساتھ' وہ تمام آوازیں جو زمین کے ساتھ



متعلق ہوتی ہیں اور یہاں صرف ہوا تھی اور تیز دھوپ تھی۔۔۔ اور اس لمحے مجھے پتھریلی فصیل میں ایک محرابی دروازہ منہ کھولے نظر آیا۔۔۔ ہم قلعے کی چھت پر پہنچ گئے۔۔۔ میں کچی دیوار کے سائے میں بہت دیر تک بیٹھا ہونکتا رہا اور پھر ہوا نے پسینے کو ٹھنڈک دی اور میں بہتر محسوس کرنے لگا۔۔۔ میں نے کھڑے ہو کر آس پاس نگاہ کی تو میری ٹانگوں میں کپکپاہٹ سی ہوئی ویسی کپکپاہٹ جو کسی بلند چوٹی پر کھڑے ہونے کی کوشش سے ہوتی ہے یا کسی بلند مٹی پر چڑھ کر بدن کو سیدھا کرنے سے ہوتی ہے۔ چاروں جانب ناقابل یقین مناظر تھے۔۔۔

ایک وسیع ریگزار کے درمیان میں دریائے سندھ کی گزرگاہ اور پس منظر میں وہ پہاڑی سلسلے جہاں وادی شگر تھی۔

ہم اس سطح پر تھے جس سطح پر وادی سکردو کے پہاڑوں کی چوٹیاں تھیں۔

قلعہ تو ایک کھنڈر تھا۔ ایک مسجد کے آثار۔ چند کمرے اور حفاظتی فصیل۔۔ لیکن اس کے علاوہ یہاں وہ کچھ تھا جو اور کہیں نہیں تھا' ایک مکمل تنہائی تھی۔۔۔ سرسراتی ہوا میں اس بلندی پر ایک الگ دنیا تھی جس میں مکمل خاموشی تھی اور ایک وسیع لینڈ سکیپ تھی۔ نیچے جہاں ہم نے پہلی شب بسر کی تھی' اس کے نواح میں ایک بگلی کاپٹر بلند ہو کر کہیں جا رہا تھا۔ اور وہ بمشکل نظر آتا تھا۔

قلعے کی اس دیوار پر جس کے نیچے ریت' چٹانیں اور سندھ کم از کم ایک کلومیٹر کی عمودی گہرائی میں تھے وہاں اس دیوار پر ایک سیاح ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔۔۔ پتا نہیں کب سے بیٹھا تھا اور اس نے مجھے بتایا کہ یہ اس قلعے کی دیوار سے یہ منظر جو نظر آتا ہے یہ دنیا بھر میں میرا دوسرا پسندیدہ ترین منظر ہے۔۔۔ جب میں نے پوچھا کہ پہلا کونسا ہے تو کہنے لگا۔۔۔ بس یہ دوسرا ہے پہلا میں نہیں بتا سکتا۔۔۔ پتا نہیں کیا چیز تھی' ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ کر آگے چلے گئے۔

سکردو کی جانب ہریاول تھی اور وہ برف پوش پہاڑ تھے جن میں ایک راستہ دیوسائی میدان کو جاتا تھا۔ میرا دل اس میدان کے لیے شاید ایک لمحے کے لئے رکا۔۔۔ صرف یہ پوچھنے کے لیے کہ تمہاری برفیں کب پگھلیں گی؟ وادی خپلو سے واپسی پر مرداد صاحب سے پہلا سوال میں نے دیوسائی کے بارے میں ہی پوچھا تھا کہ تازہ ترین صورت حال کیا ہے؟ اور انہوں نے کہا تھا کہ ابھی چند روز اور مری جان ابھی چند روز اور۔۔۔ اور میں چند روز اور ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ اس لئے فیصلہ یہ ہوا تھا کہ ہم اگلے روز یہاں سے گلگت جائیں گے اور وہاں پہنچ کر جی ایم بیگ سے مشورہ

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



کیا جائے گا کہ اے مردوانا ہم تین مسافر کس وادی کو جائیں' کس اجنبی مقام کے لیے سفر اختیار کریں کہ ہماری بے چین روحوں کو سکون ملے...... تو ہم اگلی صبح گلگت جا رہے تھے۔

ہم قلعے سے اترے...... اور اب میرے دل میں کاظمی کے لیے صرف محبت کے جذبات تھے کہ اس کی وجہ سے میں نے وادی سکردو کا ایک ناقابل بیان منظر دیکھا۔

ہم قلعے سے اترے تو شام ہو رہی تھی ...... اور ایک شام سکردو کی میونسپل لائبریری میں ہمارے اعزاز میں تھی۔ لائبریری ایک کمرے پر مشتمل تھی اور مکالمے کی میز کے ارد گرد مقامی شاعر' ادیب اور دانشور جمع تھے۔ ہم کچھ شرمندہ تھے کہ پاکستان کے ایک اہم علاقے کے بارے میں ہم بہت کم جانتے تھے ...... لیکن اس شام ہم نے اہل سکردو سے بہت کچھ سیکھا اور بہت کچھ جانا۔

ہم نے پہلی بار بلتستان کے ہیرو علی شیر خان انچن کے بارے میں جانا۔

انچن کی رسائی مغل دربار تک اس وقت ہوئی جب اکبر نے ۱۵۸۶ء میں کشمیر فتح کیا۔ مغل تاریخ دانوں نے انچن کا ذکر علی رائے کے نام سے کیا ہے۔ انچن نے ایک مغل شہزادی کے ساتھ شادی کی جو کہ گل خاتون تھی۔ بلتی عوام نے اس مغل شہزادی کو مینڈوق گیالمو کا خطاب دیا۔ علی شیر خان نے نہ صرف یہ کہ ایک مغل شہزادی سے شادی کی بلکہ اس نے اپنی ایک بیٹی شہزادہ سلیم سے بیاہ دی۔ گل خاتون سکردو آئی تو اپنے ہمراہ موسیقار' انجینیئر' ملاح اور دیگر ہنرمند لے کر آئی۔ جن زمانوں میں انچن اپنی سلطنت کی توسیع کے لئے تقریباً چار برس کے لیے سکردو سے باہر رہا' ان زمانوں میں گل خاتون نے مغل ثقافت اور طرز تعمیر کو فروغ دیا اور مینڈوق کھر' ہلال باغ' چہار باغ اور گنگوپی نہر تعمیر کروائے اور ...... وہ راستہ جس پر چل کر ہم قلعے تک پہنچے تھے۔

ہمیں بتایا گیا کہ بلتی ادب کی ایک قدیم اور توانا روایت ہے۔ بلتی زبان پہلے تبتی سکرپٹ میں لکھی جاتی تھی لیکن مذہبی تنگ نظری نے اسے کاغذ سے سینوں میں منتقل کر دیا۔ قدیم لوک ادب کی بنیاد تاریخی اور رومانوی داستانیں ہیں۔ بلتستان میں اسلام ایرانی مبلغین کی کوششوں سے پھیلا...... ہم لائبریری سے باہر آئے تو شام' رات میں جاتی تھی۔ اور رات دھیرے دھیرے اس چھوٹے سے بازار میں اترتی تھی جس میں ہم چہل قدمی کر رہے تھے...... سکردو میں ابھی دو منزلہ عمارتیں ذرا کم ہیں اور بازار کھلے اور ایک منزلہ ہیں۔ یوں آسمان زیادہ نظر آتا ہے اور اسی لیے رات بھی



پوری طرح نیچے آتی ہے۔ اس بازار میں ایک اطمینان ایسا تھا جس نے مجھے بہت سکھ دیا۔ بجلی بند تھی اس لیے دوکانداروں نے لالٹینیں روشن کر کے چوکھٹوں سے لٹکا رکھی تھیں۔ ہمارے چہرے نیم تاریکی میں تھے اور ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر بولنے کی بجائے ایک دوسرے کو سن کر بولتے تھے' ہمیں منہ زور ٹریفک سے بچنے کے لیے صرف ایک بار تردد کرنا پڑا جب ایک بوڑھا بلتی اپنے گدھے کو فل سپیڈ سے ہانکتا ہوا ہمارے قریب سے گزر گیا۔ بلتستان اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ یہاں جرم نہ ہونے کے برابر ہے' قتل ڈاکے اور چوری سے خالی یہ سرزمین ابھی ان سولائزڈ کہلاتی ہے...... تو پھر سولائزیشن کیا ہے......؟

کاظمی میرے ساتھیوں کو قلعے تک جاتے ہوئے میری حالت زار زار کے بارے میں بتا چکا تھا اور نظامی صاحب چہک رہے تھے۔ "ہاں جی تارڑ صاحب پھر کیا دیکھا اس قلعے میں۔ کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ کچھ دیکھنے گئے تھے؟"

"بالکل دیکھنے گیا تھا اور وہاں سے دنیا کا دوسرا بہترین نظارہ دکھائی دیتا ہے"

"اس نظارے نے کہیں جانا تو نہیں ہے ناں ابھی؟ تو پھر دیکھ لیں گے" نظامی صاحب مسکرائے......

"آپ کیا کرتے رہے اس دوران؟"

"ہم؟ ......" نظامی صاحب نے مکمل آسودگی سے اپنے دونوں بازو پرندوں کی طرح پھڑپھڑائے "ہم بادشاہو ادھر خواجہ صاحب کے کالج جا کر ایک تاری لگا آئے...... مطیع نے ہمالین مراتھن میں حصہ لینے والے چند گورے گھیر لئے اور ان کے ہاتھ دیکھ ڈالے...... کرس بازار میں بیٹھا دھوپ سینکتا رہا"

"ہمالین مراتھن؟ میں چونک گیا۔ "یار وہ تو کل ہے اور کل صبح ہم گلگت جا رہے ہیں......"

"اور خواجہ صاحب نے بکنگ بھی کروا دی ہے ہماری ......" نظامی صاحب نے فوراً کہا۔

"نظامی صاحب...... ہمالین مراتھن میں حصہ لینے کو جی چاہتا ہے۔ یہ موقع پھر کبھی نہیں آئے گا"

"بادشاہو یہ ذرا اوپر قلعے تک تو جا نہیں سکتے آپ' ہمالین مراتھن میں حصہ لے کر کیوں ہماری اور ملک کی بدنامی کراؤ گے۔ دس قدم کے بعد آپ جناب اور اس جانور میں کوئی فرق نہیں رہتا جس کی زبان ہمہ وقت باہر لٹکی رہتی ہے۔"

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



"نظامی صاحب۔۔۔۔" میں نے احتجاج کیا۔

"اندازہ کرو" نظامی صاحب نے میرے کندھے کو تھپکا "میں تو مذاق کر رہا تھا۔۔۔ ضرور حصہ لو ہمالین مراتھن میں لیکن میں اور مطیع کل گلگت ہی جائیں گے"

چنانچہ ہمالین مراتھن میں حصہ لینے کی آرزو یہیں تمام ہو گئی۔

مجھ سے فارغ ہو کر نظامی صاحب نے کرس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "کرس اولڈ بوائے کیا میں نے تمہیں چار انگریز عورتوں کے بارے میں وہ لطیفہ سنایا ہے جو سنایا نہیں جا سکتا"

کرس فراخ دلی سے ہنسا۔ "یہ چار انگریز خواتین کے بارے میں ایک لطیفہ ہے یا الگ الگ چار لطیفے ہیں جو سنانے کے قابل نہیں ہیں۔"

"جس طرح تم پسند کرو" نظامی صاحب بھی ہنسنے لگے۔

"میں تو یہ پسند کروں گا کہ چار پاکستانی خواتین کے بارے میں ایک ایسا لطیفہ ....."

"آہم ۔۔۔۔۔" نظامی صاحب زور سے کھانسے اور ان کا چہرہ سرخ ہو گیا "خبردار یہ گورا اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟"

"مذاق صرف کرنا نہیں بلکہ سننا بھی سیکھو بادشاہو۔" میں نے ان کے کندھے پر ایک دھپ رسید کی۔

"اندازہ کرو۔ ہماری خواتین کے بارے میں لطیفے سناتا ہے۔ باندر کا بچہ"....

رات کے کھانے کے لیے ہم شہ برم سروس کے مالک بابو رضا صاحب کی جانب سے کشیر ان میں مدعو تھے۔ کشیر ان میں اندھیرا تھا۔ بجلی یہاں بھی نہیں تھی۔ ویٹر نے ایک تیزی سے پگھلتی ہوئی موم بتی میز پر جما دی۔ کھانا لگنے میں کچھ دیر تھی۔ میں اٹھ کر ٹیرس پر چلا گیا۔ سکردو بازار سنسان پڑا تھا۔ بہت دور کوئی جیپ ڈرائیور لائٹوں کو بار بار آن اینڈ آف کرتا تھا اور ان کی روشنی میں بازار کی چند دوکانیں اور قلعے کی پہاڑی کا کچھ حصہ تھوڑی دیر کے لیے نظر آ جاتا تھا وادی میں کہیں کہیں چراغوں کی جھلمل روشنی تیرتی تھی۔ یہاں ٹیرس پر کچھ مانوس لہجے میرے کانوں میں آئے اور ان مسافروں کی جانب سے آئے جو ایک بڑی میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان کے چہرے نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن وہ خالص لاہوری النسل تھے۔ میں نے سلام دعا کی تو وہ مجھ سے ایسے اٹھ اٹھ کر بغلگیر ہوئے جیسے پرانی دوستی ہو۔ وہ سیر و سیاحت



کی غرض سے سکردو آئے ہوئے تھے اور اب اس لیے کشیر ان کے ٹیرس پر بیٹھے ہوئے سالن کے ڈونگے سامنے رکھے ان روٹیوں کا انتظار کر رہے تھے جو ویٹر کسی قریبی تنور سے لینے گیا ہوا تھا اور پچھلے پندرہ منٹ سے لینے گیا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک لیڈر ٹائپ تھا۔ وہ کہنے لگا "دیکھو جی تارڑ صاحب۔ ان بلتیوں نے کیا خانہ خراب ہوٹل بنایا ہے۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے سالن رکھ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔۔"

"اوئے یار صدر صاحب۔۔۔۔" ان میں کسی نے اسے کہا اور پھر میری جانب مخاطب ہوا۔ "یہ جی ہمارا صدر ہے یونین کا۔ اس خانہ تنگ نے کہا تھا کہ سکردو چلو وہاں پہاڑی بکرے کھانے کو ملیں گے۔ لو جی یہاں پہنچتے ہی ہم نے ان لوگوں سے پوچھا کہ پہاڑی بکرے ہیں؟ یہ کہنے لگے کہ بالکل ہیں۔۔۔۔ ہم نے پوچھا کہاں ہیں؟ کہنے لگے پہاڑوں پر....."

"آپ کا کس محکمے سے تعلق ہے؟"

اندھیرے میں' وہ سب ہنسے اور پھر کسی نے کہا "محکمہ ڈیکوریشن سے۔۔۔۔۔"

لیڈر ٹائپ کی آواز آئی "جناب گپت روڈ نہیں ہے لاہور میں ؟ کاغذ کی مارکیٹ ہے جہاں پر۔ تو وہاں ہماری دوکانیں ہیں ڈیکوریشن کی .....کاروں کو اور پارٹیوں میں سجانے کے لیے جو چمکیلے کاغذ بناوٹی پھول' اور رنگین گلدستے وغیرہ ہوتے ہیں ناں تو یہ ہمارا کاروبار ہے۔۔۔۔۔۔"

"یہ صدر ہے ہماری یونین کا۔۔۔۔۔" پہاڑی بکروں کے شوقین صاحب کی آواز آئی۔ "ہر سال ہم سب اکٹھے نکلتے ہیں موج میلہ کرنے کے لیے۔ ہر سال مری جاتے تھے۔ اور وہاں تو آپ جانتے ہیں کہ کھانے پینے کی کوئی پرابلم نہیں۔ اس مرتبہ صدر صاحب کہنے لگے کہ سکردو چلتے ہیں.... اور یہاں کچھ کھانے پینے کا رواج ہی نہیں' دو دن ہو گئے ہیں مونگی کی دال اور آلو شوربہ کھاتے ہوئے۔۔۔۔۔"

"اوئے تم کھانے کو آئے ہو یا سیر کرنے" ایک اور صاحب بولے اور پہلی بار بولے "ذرا یہاں کے نظارے تو دیکھو۔ ایسے پہاڑ دیکھے ہیں کبھی .....؟ اوئے صد پارہ جھیل اور کچوڑا جھیل کی کیا بات ہے.....؟"

میں نے انہیں خپلو جانے کا مشورہ دیا۔ اس دوران ان کی روٹیاں آ گئیں اور میری جانب ایک "آؤ جی بسم اللہ کرو" کے بعد وہ کھانے میں مصروف ہو گئے۔

میں واپس اندر آیا تو ہمارا کھانا بھی لگ چکا تھا۔

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



رات گیارہ بجے ہم سکردو سے جھیل کچورا جانے والے راستے پر سفر کرتے تھے۔ تاریکی اور خاموشی میں جیپ کی روشنیاں جیسے ہم سے باتیں کرتی تھیں، ہمیں بہت کچھ دکھاتی تھیں۔ اور ہاں سردی تھی جو ہڈیوں میں اثر کرتی تھی۔

ہم جھیل کچورا پر واقع تبت موٹل کے خیموں میں رات گزارنے کے لیے آئے تھے۔

صبح ساڑھے آٹھ بجے گلگت روڈ پر ویگن ہماری منتظر ہو گی۔ لیکن اس سے پیشتر ہم نے کچورا گاؤں سے پرے بالائی کچورا ابھی دیکھنا تھی۔

ہم دیر تک سونے کی کوشش کرتے رہے لیکن سردی بہت تھی..... جھیل کنارے سردی تو ہو گی۔

"ہمیں بلتستان آئے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے نظامی صاحب؟"

"پتا نہیں 'مدتیں ہو گئی ہیں گھر سے نکلے" نظامی صاحب رضائی کے اندر سے کہتے تھے "سو جاؤ بادشاہو سو جاؤ"

کچورا گاؤں کے کچے مکان ابھی خوابیدہ تھے اور ان کی دیواریں اور چھتیں شب کی سیاہی میں لگتی تھیں جب ہم کچورا نالہ پار کر کے اوپر پہنچے۔ جھیل کچورا کا بہترین منظر یہاں سے نظر آتا ہے، شنگریلا کی سرخ چھتیں ابھی واضح نہیں تھیں، البتہ پوری جھیل صبح کی سفیدی کو جذب کر کے اپنے کناروں سے الگ ہو چکی تھی، جیسے کسی سیاہ آئینے پر پارے کا قطرہ ساکت ہو۔ ہم تیزی سے چلنے لگے۔ ہمیں بہر صورت اپنا سامان اٹھا کر ساڑھے آٹھ بجے سے پیشتر گلگت روڈ پر پہنچنا تھا اور ہم اپر کچورا کو بھی بہر صورت دیکھنا چاہتے تھے اور اسی لیے اتنی سویرے بیدار ہو کر ٹھٹھرتے ہوئے اپنے خیموں سے باہر آ گئے تھے۔

جھیل 'گاؤں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔

درختوں اور چٹانوں میں گھری ہوئی اپر کچورا ایک بڑے تالاب کی طرح پھیلی ہوئی تھی، اس پر ہلکی ہلکی دھند کے آثار تھے جو تیزی سے تحلیل ہو رہی تھی۔ میں اور کرس نیچے کنارے تک جانے کے لیے آہستہ آہستہ اترنے لگے۔ یہاں بھی کنارے کے درخت اور چٹانیں غیر واضح تھیں لیکن پانی شیشہ ہو رہے تھے اور یہ شیشہ صرف اس لمحے ٹوٹ کر جڑتا تھا جب کوئی مچھلی اچھل کر باہر آتی تھی اور پھر پانی پر گر کر پانی



ہو جاتی تھی۔ چٹانوں کے اوپر سے چند برف پوش چوٹیاں جھانکتی تھیں اور یہ سب پانی میں بھی تھیں کہ ان کا عکس شیشے پر ایسا تھا کہ دھوکہ ہوتا تھا کہ اصل اوپر ہے یا پانی پر ہے..... کرس نے تصویر لینے کے لیے جب کیمرے کو آنکھ سے لگایا تو وہ بھی ایک لمحے کے لیے جھجکا کہ اصل منظر کہاں ہے' اوپر جھیل کے پس منظر میں یا جھیل کے پانی پر...... پانیوں پر اس منظر کو صبح کی روشنی تیزی سے پھیکا کر رہی تھی۔

ایک لمحہ ایسا آیا کہ درجنوں مچھلیاں اس منظر کا طلسم توڑ کر اچھلیں اور میں نے سب کو الگ الگ دیکھا کہ وہ اتنی دیر تک ہوا میں معلق رہیں اور پھر یکدم گریں اور جھیل کا آئینہ برابر ہو گیا۔

ہم تبت موٹل واپس پہنچے تو سورج خاصا بلند ہو چکا تھا۔ ناشتے کے بعد ہم نے اپنا سامان باندھا اور سفر کے دوران پہلی بار اسے اپنے کاندھوں پر اٹھایا۔ اٹھانا کیا تھا مطیع نے میرا رک سیک مجھے پہنایا کہ سٹریپس کو بازوؤں میں پہنا ہی تو جاتا ہے۔ جونہی مطیع نے رک سیک کو چھوڑا میں اس کے بوجھ سے نیچے بیٹھ گیا۔ پھر دوستوں نے بغلوں میں ہاتھ دے کر بڑی مشکل سے اٹھایا اور میں بڑی مشکل سے اٹھا۔

گلگت روڈ پر ہمیں ویگن کے لیے زیادہ دیر تک انتظار نہ کرنا پڑا۔

وادی سکردو میں جتنی وسعت تھی اس میں سے باہر جانے کا راستہ اتنا ہی تنگ تھا۔

مسلسل بل کھاتی ایک سڑک اونچائی پر اور نیچے شیر دریا سندھ اور دوسرے کنارے کی چٹانیں اور پہاڑی سلسلے آپ پر جھکے ہوئے۔ یہاں شاہراہ قراقرم کے شاندار مناظر دیکھنے میں نہیں آتے تھے...... جیسے ایک وسیع غار ہو اور اس میں ایک سڑک 'ایک دریا اور چٹانیں ہوں.... تقریباً چھ گھنٹے کے سفر کے بعد روشنی تیز ہو گئی اور ہم کھلی فضا میں آ گئے۔ ایک وسیع لینڈ سکیپ میں دریائے سندھ بہتا تھا اور سڑک کے برابر میں ایک چھوٹا سا صحرا تھا اور اس سے پرے نانگا پربت نظر آ رہی تھی۔

سکردو روڈ' قراوا پل کے پار ہوئی اور شاہراہ قراقرم میں جا ملی ...... یوں محسوس ہوا جیسے جی ٹی روڈ پر آ نکلے ہیں.... پچھلی نشست پر مطیع ایک مقامی نوجوان سے گفتگو کر رہا تھا اور اس سے وعدہ کر رہا تھا کہ گلگت پہنچتے ہی وہ اپنے سامان میں سے صد پارہ گولڈ کی پوٹلی نکال کر اسے سونا دکھائے گا.... اس نوجوان نے مجھے مخاطب کیا "جناب آپ دیوسائی جانا چاہتے ہیں؟"

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



"ہاں۔۔۔۔۔" میں نے فوراً پلٹ کر پیچھے دیکھا۔

"تو پھر آپ جنگوٹ اتر جائیے وہاں سے جیپ کے ذریعے استور جائیں گے اور وہاں سے شائد چلم چوکی کے لیے کوئی سواری مل جائے۔۔۔۔"

"تو جی تارڑ صاحب یہ آپ کے حقے پانی کا بندوبست کر رہا ہے۔۔۔۔ چلم چوکی۔" نظامی صاحب جو اس سفر کے دوران غیر معمولی سنجیدگی اختیار کیے بیٹھے رہے تھے اب ہنس کر بولے۔

"چلم چوکی؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں میں چلم چوکی کا رہنے والا ہوں اور وہاں سے میں آپ کو ٹٹوؤں کا بندوبست کرا دوں گا اور آپ ان پر سوار ہو کر بڑی آسانی سے دیوسائی عبور کر کے سکردو پہنچ جائیں گے"

"بڑی آسانی سے؟"

"راستے میں دلدل تو ہو گی۔۔۔ برف بھی پوری طرح نہیں پگھلی۔۔۔ ٹٹو پھنس بھی سکتے ہیں لیکن پھر بھی آپ آسانی سے دوسری جانب چلے جائیں گے۔۔۔"

"کیوں نظامی صاحب۔۔۔۔ تجویز تو اچھی ہے"

"نہ! اس عمر میں آپ ہمیں ٹٹو پر بٹھاؤ گے" نظامی صاحب چہکنے لگے۔ "میں ایک مدبر قسم کا پروفیسر ہوں ٹٹو پر بیٹھا اچھا لگوں گا؟"

پیچھے سے مطیع نے فقرہ پھینکا "ٹٹو بھی تو یہی سوال پوچھ سکتا ہے کہ میں ایک مدبر قسم کا ٹٹو ہوں نظامی صاحب کو بٹھاتا اچھا لگوں گا"

"آخر انشورنس ایجنٹ ہو ناں۔۔۔ کتنی گھٹیا حس مزاح ہے۔۔۔۔" نظامی صاحب نے بڑی مشکل سے تیوری چڑھا کر متانت اختیار کرنے کی کوشش کی۔

"میں نے تو صرف ٹٹو کے خیالات کی ترجمانی کی ہے۔۔۔۔" مطیع نے بھی بڑی متانت سے کہا۔

"پھر بھی سہی۔۔۔۔" میں نے اس نوجوان سے کہا "میرے ساتھی اس بارے میں سنجیدہ نہیں۔۔۔۔"

"نظامی صاحب آپ فی الحال کرس کو ان تین یا چار انگریز خواتین کے بارے میں وہ لطیفہ سنائیں جو سنایا نہیں جا سکتا" مطیع پھر بولا۔



"دفع کرو جی۔۔۔۔" نظامی صاحب فوراً کہنے لگے "باندر کا بچہ آگے سے جواب دیتا ہے"

کرس جانتا تھا کہ ہم اس کے بارے میں بات کر رہے ہیں اور کوئی اچھی بات نہیں کر رہے۔

دریائے گلگت کے پار جلی ہوئی چٹانوں کا سلسلہ ختم ہوا اور ہریاول شروع ہو گئی۔۔۔۔

گلگت پہنچتے ہی ویگنوں کے اڈے سے میں نے ریاض صاحب کو فون کیا تاکہ ہم چنار ان میں قیام کر سکیں۔ معلوم ہوا کہ سیاحوں کے ہجوم کی وجہ سے نہ صرف چنار ان اور ہنزہ ان بلکہ ہر قسم کے ان' ان دنوں آؤٹ ہے۔۔۔ البتہ رور سائڈ ٹورسٹ لاج میں ایک کمرہ مل سکتا ہے۔۔۔ لاج کے نوجوان مالک اپنی ذاتی جیپ پر ہمیں ویگنوں کے اڈے پر لینے آ گئے۔

یہ ٹورسٹ لاج دریائے گلگت کے قریب تھا اور بقیہ شہر کی نسبت قدرے خنک آب و ہوا رکھتا تھا۔ نظامی صاحب نے کمرے میں داخل ہوتے ہی غسل خانے کا رخ کیا اور تاری لگانے لگے۔ مطیع کا شوگر لیول گر رہا تھا اس لیے وہ لیٹ گیا۔

دریائے گلگت کے پانیوں کا منہ زور شور کمرے کے اندر ایک ہلکی گونج کی طرح داخل ہو رہا تھا۔۔۔

میں ایک مرتبہ پھر گلگت میں تھا۔ چٹانوں سے گھرا ہوا ایک نامہرباں جزیرہ جس میں ایک نا معلوم کشش تھی۔ یہاں نامعلوم کو جاننے کی کشش تھی۔ پچھلے پہر ہم تینوں گلگت کے بازار میں تھے۔۔۔ اب ہمیں آئندہ سفر کی منصوبہ بندی کرنا تھی۔۔۔۔ اور اس کے لیے ہم گلگت کے مرد دانا جی ایم بیگ کی بک شاپ کی جانب رواں تھے۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ بیگ صاحب کسی کام کے سلسلے میں اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ ان کی جگہ ان کے بیٹے اکرام بیگ دوکان میں براجمان تھے۔۔۔۔ اکرام نے فوراً قہوہ منگایا اور میں نے فوراً اپنا مسئلہ بیان کر دیا۔ "ہم تینوں کو کہیں بھیج دو"

"کہاں بھیج دوں تارڑ صاحب" اکرام کے تیکھے نقش و نگار پر حیرت پھیلی۔

"ہمارے پاس دس بارہ دن ہیں' ہمیں کسی دور افتادہ قراقرمی وادی میں بھیج دو جو اس دنیا سے باہر کی جگہ لگے"

"آپ کیسے جا سکتے ہیں؟" اکرام نے ایک نظر میرے بھدے سراپے پر ڈالی

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



"آپ اس جسم کے ساتھ دشوار گزار پہاڑی راستوں پر کیسے چلیں گے۔۔۔ راستے کی سختیاں کیسے برداشت کریں گے۔۔۔۔۔"

"میں؟" میں نے فوج میں بھرتی ہونے کے لیے آنے والی کسی نوجوان کی طرح سینہ پھلا کر پیٹ اندر کرنے کی کوشش کی "میں بالکل فٹ ہوں۔ سو فیصد۔ سو فیصد نہ سہی پچاس فیصد تو ہوں کیونکہ قوت نہ سہی میرے پاس ارادہ تو ہے"

"میں ان کو سہارا دے کر لے جاؤں گا بادشاہو" نظامی صاحب نے گردن ٹیڑھی کر کے بیان دیا۔

"ہیں؟" اکرام کے ہاتھ سے قہوے کی پیالی گرتے گرتے بچی "آپ بھی جائیں گے؟"

"کیوں میں نہیں جا سکتا؟" نظامی صاحب نے ذرا بے عزتی محسوس کی "بادشاہو ہم پنڈی کی پہاڑیوں میں اکثر ماؤنٹینرنگ وغیرہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ کے ٹو اور نانگا پربت وغیرہ تو ہمارے سامنے معمولی بات ہے"

"یہ بھی جائیں گے۔۔۔" میں نے ذرا جھینپتے ہوئے مطیع کی جانب اشارہ کیا جس نے فوراً دانت نکال دیئے کہ مجھے نہ بھول جانا۔

"میں بالکل فٹ ہوں" مطیع نے فوراً کہا "صرف ٹیکہ لگانا پڑتا ہے ہر روز"

"ٹیکہ۔۔۔ یعنی انجکشن؟" اکرام کا منہ کھل گیا۔

"جی ہاں میرا شوگر لیول بہت گر جاتا ہے"

"اور آپ تینوں ٹریکنگ یا کوہ پیمائی کے لیے گھر سے نکلے ہیں؟" اکرام حیرت اور اچنبھے سے مسکراہٹ کی طرف آ گیا۔

ہم تینوں نے اچھے بچوں کی طرح سر ہلا کر کہا "ہاں"

اکرام سوچ میں پڑ گیا۔ ہم اس کی جانب سالانہ امتحان کا نتیجہ سننے والے طالب علموں کی طرح دیکھنے لگے جنہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ اس برس بھی پاس نہیں ہو سکیں گے۔

"دو ٹریک ہیں جو آپ کے معیار پر پورے اترتے ہیں لیکن آپ تینوں کی جسمانی صحت ان کے معیار پر پوری نہیں اترتی"

اکرام نے بالآخر سر اٹھایا "ایک تو وادیٔ شمشال کا ٹریک ہے۔ اگر آپ صرف شمشال گاؤں تک جائیں گے تو تین چار دن کا راستہ ہے' دشوار ہے۔۔۔ اگر شمشال



پامیر تک جائیں گے تو اتنے ہی دن مزید لگ جائیں گے۔۔۔ آپ فیری میڈو بھی جا سکتے ہیں۔ نانگا پربت کے بیس کیمپ کے قریب۔۔۔ دو دن جانے میں لگیں گے' راستہ پہلے دن کا بہت سخت ہے۔۔۔۔۔"

"یہ پریوں والی چراگاہ ٹھیک ہے جی۔ شاید وہاں کوئی پریاں شریاں ہی مل جائیں" نظامی صاحب نے سر ہلایا اور میں تو ایک عرصے سے فیری میڈو کے بارے میں پڑھ رہا تھا اور اسے دیکھنے کی خواہش میں تھا۔ میرے ذہن میں فیری میڈو تک ٹریکنگ کے بارے میں جتنے سوالات تھے وہ میں نے پوچھ ڈالے۔۔۔ ہمارے پاس کس قسم کا سامان ہونا چاہیے؟ خوراک کا کیا بندوبست ہو گا؟ کونسی دوائیاں ہمراہ لے جانا ضروری ہیں؟ راستہ کیسا ہے؟ سامان اٹھانے کے لیے پورٹرز کا بندوبست کیسے ہو گا؟

"آسٹریا کے ٹریکرز کا ایک گروپ دو تین روز تک فیری میڈو جا رہا ہے اور میرا سفری ادارہ اس کا بندوبست کر رہا ہے۔ میں آج شام تاتو گاؤں کو پیغام رساں روانہ کر رہا ہوں۔ اسے یہ بھی کہہ دوں گا کہ۔۔۔۔ کل؟ نہیں دو دن بعد دو پورٹر نیچے رائے کوٹ پل پر بھیج دے۔۔۔ آپ کے پاس سامان کیا کیا ہے؟ اس کا بندوبست میں کر دوں گا۔۔۔ آپ خوراک کا بندوبست کیجیے"

اکرام نے ایک طویل فہرست ان اشیاء کی بنا دی جن کی ضرورت فیری میڈو تک کے سفر میں پڑ سکتی تھی۔

"لیجیے نظامی صاحب بازار میں گھوم پھر کر یہ اشیاء خرید لائیے" میں نے فہرست ان کے حوالے کی اور انہوں نے اسے بلند آواز میں پڑھنا شروع کر دیا۔" چاول' دال' بسکٹ' لالٹین' چینی' چائے' خشک دودھ۔۔۔ بادشاہو یہ گھریلو کام کاج مجھ سے نہیں ہوتے۔۔۔ ساتھ لائے ہو تو اس قسم کی ڈیوٹی بھی آپ ہی دو" انہوں نے فہرست واپس کر دی۔

ہم اٹھنے لگے تو اکرام کہنے لگا "میں کل صبح اپنی کار پر ہنزہ کریم آباد جا رہا ہوں۔ پرسوں صبح واپس آجاؤں گا۔ آپ کا جی چاہے تو میرے ساتھ چلیے۔۔۔۔"

"لیکن مجھے تو فیری میڈو کے لیے تیاری کرنا ہے بلکہ خریداری کرنا ہے۔۔۔۔"

"وہ آپ پرسوں کر سکتے ہیں۔ پچھلے پہر دو بجے ویگن چلاس کے لیے چلتی ہے اس پر بیٹھ جائیے گا اور رائے کوٹ پل پر اتر جائیے گا۔ رات وہاں بسر کیجیے اور اگلی صبح فیری میڈو" یہ ساری گفتگو چونکہ اکرام نے صرف مجھ سے مخاطب ہو کر کی۔ اس

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



لے نظامی صاحب قدرے بے آرام ہو کر کہنے لگے "میں نے کہا بادشاہو ہمیں اکیلا چھوڑ کر ہنزہ جا رہے ہو؟"

"آپ اس دوران گلگت دیکھ لیں نظامی صاحب"

"وہ تو ہم نے دیکھ لیا ہے۔ اب ذرا ہمیں بھی ہنزہ شنزہ کی سیر کرا دو..... کیوں بھئی مطیع چلنا ہے اکرام صاحب کی کار پر بیٹھ کر ہنزہ؟"

"کیوں نہیں؟" مطیع صاحب فوراً مان گئے۔

"جی ہاں بالکل آپ حضرات بھی چلئے....." اکرام نے مسکرا کر کہا۔

اس شام گلگت کے بازار میں گھومتے ہوئے میں نے ایک ایسی بے چینی بدن میں محسوس کی جو اس سے پیشتر میرے تجربے میں نہ آئی تھی۔ میں پرسوں اپنی زندگی کے پہلے باقاعدہ ٹریک پر جا رہا تھا۔ نامعلوم میں سفر کر رہا تھا۔ اس سفر کے لیے مجھے زندگی کی تمام ضرورتیں اپنے ساتھ لے جانا تھیں۔ اور ظاہر ہے وہاں خطرہ بھی تھا.....

ہنزہ روڈ پر اکرام کی سفید سوزوکی چلی جاتی تھی اور ڈرائیور کی نشست پر، میں براجمان تھا۔ خوبصورتی اور پہاڑوں کے جلال کے منظر ہمارے ساتھ ساتھ چلے جاتے تھے۔

ہنزہ روڈ شائد پاکستان کا سب سے خوبصورت راستہ ہے۔

میں خاموشی سے بیٹھا ڈرائیور کر رہا تھا۔ کیونکہ مجھے راکا پوشی کا انتظار تھا..... پچھلی نشست پر نظامی اور مطیع اطمینان سے ٹانگیں پسارے بیٹھے تھے۔

"اپنی آنکھیں راکا پوشی کی پہلی جھلک کے لیے کھلی رکھنا کیونکہ اس سفید برفانی معبد کا نظارہ ایک پوری زندگی کے برابر ہے" میں نے ان سے کہا۔

خوبانیوں کے باغوں میں بچے اور خواتین درختوں سے پھل اتار کر بڑے بڑے تھالوں میں رکھ رہے تھے۔ گلگت کی گرمی رخصت ہو چکی تھی اور ہنزہ کی ٹھنڈک بدن کو چھوتی تھی..... کار میں خاموشی تھی۔

بھوری چٹانوں کے پیچھے اور آسمان کی نیلاہٹ میں راکا پوشی کی سفیدی نمودار ہونے لگی۔ جیسے وہ میری منتظر تھی۔ اور پھر دھیرے دھیرے اپنا آپ ظاہر کرنے لگی۔ جیسے وہ میری منتظر تھی اور میں اسے اس شخص کی طرح دیکھتا رہا جس کے اندر صرف جدائی ہوتی ہے، اور وہ اپنے محبوب چہرے کو سامنے پا کر نم آنکھوں سے اسے دیکھتا چلا



جاتا ہے، اسے اپنے اندر جذب کر کے جدائی کے کانٹے کو نکالنے کے لیے.....

میں مشکل سے بولا۔ "تو راکا پوشی کیسی ہے؟"

پیچھے سے کوئی جواب نہ آیا۔ میرے دونوں ساتھی منہ کھولے خراٹے لے رہے تھے.....

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



## "وادی ہنزہ کا چراغاں"

"راکا پوشی ان" کے کمرے میں بھی باہر کی شام تھی۔
کریم آباد پہنچنے کے بعد کھانا تناول کیا گیا اور پھر فوری طور پر نظامی صاحب نے فیصلہ دے دیا کہ "بادشاہو اب آرام کرو کیا بھاگ دوڑ لگا رکھی ہے کہ ابھی کچورا چلو اٹھ کر اور وہاں سے گلگت اور وہاں سے ہنزہ.... تو اب ذرا ریسٹ ہو جائے" تو اب ذرا ریسٹ ہو رہا تھا اور دونوں حضرات کمبل اوڑھے نیند میں گم تھے۔ اس سے پیشتر تھوڑی سی بد مزگی بھی ہو چکی تھی جب راکاپوشی نظر آنے پر میں نے پیچھے دیکھا تو دونوں صاحبان خراٹے لے رہے تھے۔
"عجیب کور ذوقی ہے کہ راکا پوشی جیسی شاندار برف پوش چوٹی گزرتی جا رہی ہے اور آپ لوگ خراٹے لے رہے ہیں" میں نے گرم ہو کر کہا تھا۔
اس پر نظامی صاحب نے ایک آنکھ کھول کر کہا تھا "گزرتی کہاں جا رہی ہے یہ سامنے تو دیکھ رہے ہیں۔ ٹھیک پانچ منٹ پہلے نہ دیکھی اب دیکھ لی..... آپ دنیا کو اپنی نظر سے ہمیں کیوں دکھانے پر مصر ہیں؟"
ان کا کہنا شاید درست تھا۔ اور مطیع کا کہنا تھا کہ ضروری تو نہیں راکا پوشی نیند خراب کر کے دیکھی جائے۔ اسے واپسی پر بھی تو دیکھا جا سکتا تھا' یہی والی راکا پوشی رہے گی بدل تو نہیں جائے گی۔
اکرام ہمیں ہوٹل میں چھوڑتے ہوئے کہہ گیا تھا کہ اگلی صبح ساڑھے آٹھ بجے ہم گلگت واپس چلے جائیں گے۔ بارہ بجے کے قریب گلگت۔ پھر فیری میڈو کے لیے خریداری اور دو بجے چلاس جانے والی ویگن پر اس مہم کے تینوں ممبر..... چنانچہ ہنزہ دیکھنے کے لیے بس یہی ایک شام تھی..... میں نے باتھ روم میں جا کر اپنے آپ کو ہنزہ کے برفیلے پانی سے تروتازہ اور یخ بستہ کیا اور کمرے میں واپس آکر اپنے پھیپھڑوں



میں پوری ہوا بھر کر ایک دلدوز قسم کا بلند ..... ہاہاہا..... قسم کا قہقہہ لگایا' ایسا قہقہہ جو فلم کا ولن ہیروئن کو تن تنہا کسی تالاب میں نہاتے ہوئے دیکھ کر لگاتا ہے' حالانکہ ایسے موقعوں پر خاموشی زیادہ سود مند ثابت ہو سکتی ہے..... قہقہہ سن کر نظامی صاحب باقاعدہ پلنگ سے اچھل پڑے "بادشاہو کیا ہو گیا ہے! گجرات آگیا ہے؟"
"نظامی جی ہنزہ آگیا ہے۔ آپ زندگی میں پہلی بار یہاں آئے ہو۔ ذرا باہر نکل کر تو دیکھو کہ سارا جہان اس وادی کے حسن کی تعریف کیوں کرتا ہے"
"لیکن ....." وہ آنکھیں ملتے ہوئے بولے "تم یہ کسی بھوکے لگڑبگڑ کی طرح ہنس کیوں رہے تھے"
"بس میرا جی چاہا تھا....." میں نے لاپرواہی سے کہا۔
"اٹھ بیٹھ مطیع الرحمٰن ....." انہوں نے مطیع کے کمبل کو ہلاتے ہوئے کہا "یہ تارڑ صاحب کے پیچ ڈھیلے ہو گئے ہیں سفر کرتے کرتے۔ مجھے تو اب ان سے ڈر لگتا ہے..... چل دیکھ ہی لیں ہنزہ شنزہ"
میں دو برس پیشتر اپنے بڑے بیٹے سلجوق کے ہمراہ پہلی مرتبہ ہنزہ آیا تھا..... اور ہم "ہنزہ ان" کے اس چھوٹے سے کمرے میں ٹھہرے تھے جس کے برآمدے سے راکا پوشی اور گھر ناٹے کا منظر ایسے نظر آتا ہے جیسے ایک وسیع تصویر ہو۔ کریم آباد بدل چکا تھا۔ اس کی بازلد والی سڑک اب پکی ہو چکی تھی اور اس پر ایک لڑکا موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ غیر ملکی سیاح گمشدہ بھیڑوں کی طرح ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ یہاں ہم تینوں نے کرس کی غیر موجودگی کو بری طرح محسوس کیا..... وہ گلگت پہنچنے پر چین جانے والی بس پر سوار ہو گیا تھا کیونکہ اس کی منزل ایک صحرا کے پار دنیا کی بلند ترین چوٹی ایورسٹ کے دامن میں تھی..... سفر کی دوستیوں میں یہی فائدہ ہے۔ جتنی دیر میں ہماری خوبیاں اختتام کو پہنچتی ہیں اور خامیاں شروع ہونے لگتی ہیں. تو راستے جدا ہو جاتے ہیں .....اور ہم صرف ایک دوسرے کے بہتر پہلو کو یاد رکھتے ہیں ..... یہ بات صرف سفری دوستیوں کی حد تک درست ہے اس کا اطلاق سفری ساتھیوں پر نہیں ہوتا۔

بازار کے بعد آسمان کو اٹھتا ہوا وہ راستہ نظر آیا جو پولو گراؤنڈ سے ہوتا ہوا' ہنزہ کے ڈرائنگ روم اور پن چکی کے قریب سے گزر کر قدیم قلعے کی بلندی تک جا رہا تھا۔

"بادشاہو اس وقت کیا کرنا ہے قلعہ دیکھ کر" نظامی صاحب ایک دیوار کا سہارا

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



لے کر کھڑے ہو گئے۔

"رات ہونے کو ہے۔ اندھیرے میں کیا نظر آئے گا..... رہنے دو"

"میں تو بہر صورت جا رہا ہوں....."

"نہ تو آپ نے دو برس پہلے بھی اپنے بیٹے کے ساتھ اسے دیکھا نہیں تھا؟"

"دیکھا تھا....."

"تو پھر دوبارہ کیا کرنا ہے دیکھ کر؟"

میں نے اس کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا' یا شاید میرے پاس اس کا کوئی مناسب جواز نہیں تھا..... میں اگر کریم آباد میں تھا تو مجھے بہر طور قلعے تک تو جانا تھا۔ بس اتنی سی بات تھی..... میں نے راستے پر چڑھنا شروع کر دیا۔

"بادشاہو اب بھی واپس آ جاؤ ابھی ہونکنے لگو گے زبان نکال کر....." یہ نظامی صاحب کی آواز تھی۔

"ہم ہوٹل چلتے ہیں" یہ مطیع کی آواز تھی۔

اور واقعی میرا سانس پھولنے لگا..... اور میں فکر مند ہونے لگا۔ آج کے لیے نہیں بلکہ پرسوں کے لیے جب مجھے فیری میڈو کے سفر کے لیے ایک دشوار پہاڑی سلسلے پر پیدل چلنا تھا..... کریم آباد آج رات کچھ مختلف سا لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی پر مسرت تہوار ہو اور وہ اندر مکانوں اور دالانوں میں پوشیدہ ہو لیکن اس کی خوشی ابل ابل کر کے پتھریلی گلیوں میں بہتی ہو..... خواتین ہنزہ کے روایتی لباس میں تھیں اور آپس میں چہلیں کر رہی تھیں۔ ان کی خوبصورت پر کشش ٹوپیاں نئی تھیں۔ ایک جوڑا گزرا جو سر جوڑے کھسر پھسر کر رہا تھا..... کچھ نوجوان ہنستے ہوئے اور کچھ زیادہ ہی ہنستے ہوئے گزرے۔

جب میں پن چکی کے قریب پہنچا تو مجھے سانس درست کرنے کے لیے رکنا پڑا..... آپ نے ہمارا پانی پیا؟ راستے کے اوپر وہ منقش کمرہ تھا جس کے نیچے سے گزر کر قلعے کو جایا جاتا تھا..... اوپر تاریکی کچھ زیادہ تھی اور دھند تھی اور سردی بھی تھی۔ میں دھند میں آہستہ آہستہ چلنے لگا..... اور یہ ایک خواب میں چلنے کی طرح تھا..... دھند قلعے کی دیوار تک پہنچنے پر ختم ہو گئی..... کسی تبتی لاما سرائے کیطرح بلتت کا قلعہ تھا' کسی بدھ بھکشو کی طرح اپنے گیان میں اپنے دھیان میں گم تھا..... میں ایک بلند جگہ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اور اب میرے نیچے وادی ہنزہ دھند میں تھی اور اس سے پرے راکا پوشی کی سفیدی مبہم خیال کی طرح تھی۔ کہیں کہیں چراغ جلتے تھے..... کچھ گھروں میں



چراغاں تھا..... کہیں ہلکی روشنی تھی۔

میں بہت دیر تک وہیں اکیلا بیٹھا رہا..... میرے آس پاس صرف تاریکی تھی۔ تحلیل ہوتی ہوئی دھند تھی' التر گلیشیئر سے اترنے والی خنکی تھی' التر کے درے سے گزرنے والی تیز ہوا کا مدہم شور تھا اور سر کے اوپر سینکڑوں برس پرانا لکڑی کا ایک بوسیدہ کمرہ تھا جسے شہتیروں کے سہارے قائم رکھا گیا تھا۔ اور یہی وہ قلعہ تھا جو دنیا کے شاندار ترین مناظر میں سے ایک کے پہلو میں نظر آتا ہے۔

میں بالکل خالی الذہن تھا جب سامنے کی پہاڑی کے اندھیرے میں ایک پھلجھڑی سی پھوٹی' روشنی سے ہوئی..... پھر وادی کے اندھیرے گوشے منور ہونے لگے..... اور اس چکا چوند کے بیچ ہزاروں چراغ تھے یا لالٹینیں تھیں یا مشعلیں تھیں جو میرے چاروں جانب وادی ہنزہ کے گرد کھڑے پہاڑوں کی بلندیوں پر جلتی تھیں..... کچھ نوجوان نیچے سے اوپر آئے اور قلعے کی دیوار پر موبل آئل سے بھگوئے ہوئے کپڑے رکھ کر انہیں آگ لگا دی۔ چھوٹے چھوٹے خالی ڈبوں میں بھی تیل تھا جو روشن ہو رہا تھا۔

وادی ہنزہ میرے سامنے روشن ہو رہی تھی اور اس میں وہ زرد جھلملاہٹ تھی جو چراغوں میں ہوتی ہے..... مجھے اب یاد آیا کہ گلگت میں اکرام نے کہا تھا کہ کل پرنس کریم آغا خان کی تاج پوشی کی سالگرہ ہے..... اور یہ چراغاں میرے لیے انعام تھا..... ہر سیاح کو قدرت اس کی سفری صعوبتوں کے بدلے میں کہیں نہ کہیں انعام دیتی ہے..... کبھی وہ جھیل جنیوا کے کنارے والز رقص کی تیرتی ہوئی دھن ہوتی ہے..... کبھی وہ قسطالیہ کے ویرانوں میں ثوریا کی شام ہوتی ہے..... دریائے ماسکو کے کنارے سفیدے کے جنگل میں ایک پکنک..... قادر آباد بیراج کے پانیوں پر سردیوں کی دھوپ میں تیرتی ہوئی ہزاروں مرغابیاں..... گھاس کے سنہری میدانوں کے پس منظر میں زرد چہرہ..... رتی گلی کی جڑواں جھیلیں..... کہیں نہ کہیں قدرت انعام ضرور دیتی ہے اور اس شب کریم آباد کے قدیم قلعے کی دیوار پر بیٹھے ہوئے میرے آس پاس پوری وادی میں جو چراغاں ہو رہا تھا وہ میرا انعام تھا..... وہ چراغاں صرف میرے لیے ہو رہا تھا۔

میں اس وقت اپنی پتھریلی آماجگاہ سے نیچے اترا جب الاؤ مدہم ہو کر بجھنے لگے اور اندھیرا ایک سیاہ دھند کی طرح رینگتا ہوا واپس آنے لگا۔

میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا نیچے اترنے لگا۔ بازار میں ابھی کچھ لوگ تھے

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



..... راستہ ایک ہوٹل کے باورچی خانے کے روشن دان کی سطح پر تھا۔ باورچی خانے میں سفید ایپرن باندھے ایک باورچی نما صاحب میز پر پڑے ایک سالم بکرے کی ٹانگ پکڑے اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ سامنے سے تین نوجوان چلے آرہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ رک گئے اور پھر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ وہ ملتان میڈیکل کالج کے طالب علم تھے۔ انھیں سفرناموں کا اور سیاحت کا خبط تھا اور ان کے پاس بہت سوال تھے اور میرے پاس کم جواب تھے۔ اندھیرے میں آہستہ آہستہ چلتا ایک غیر ملکی شخص کاندھے پر ایک رک سیک گلے میں ہار کی طرح تسموں میں بندھے ہوئے فل بوٹ' سر پر ہیٹ اور پتلے فریم کی عینک لگائے۔ وہ ہمارے قریب سے گزرا تو اس نے بلند آواز میں "السلام و علیکم" کہا۔

"وعلیکم السلام" ہم رک گئے۔ وہ رکنے کے موڈ میں نہیں تھا لیکن رک گیا

"آپ اردو بولتے ہیں؟"

"جی ہاں" اس نے سر ہلایا۔

"کہاں سے آئے ہیں؟" ایک نوجوان نے دریافت کیا۔

"اوپر اونچے پہاڑوں سے....." اندھیرے میں اس کی عینک کے شیشوں میں کچھ روشنی سی تھی۔

"آپ بہت اچھی اردو بولتے ہیں" میں نے کہا۔

"جی شکریہ"

اور یہ زبان آپ نے کہاں سے سیکھی؟"

"کراچی سے....."

"بہت خوب..... کون سے ملک کے ہیں؟"

"پاکستان....."

ہم تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گئے..... وہ جان گیا کہ ہم شرمندگی سے چپ ہیں۔ اس لیے بولنے لگا "میرا نام عبدالحق ہے اور میں کراچی کے ایک سکول میں ٹیچر ہوں ..... گرمیوں کی چھٹیاں ہوتی ہیں تو میں اپنا رک سیک اور سلیپنگ بیگ اٹھا کر ادھر شمال میں آجاتا ہوں....."

"آپ ایک پیالی چائے ہمارے ساتھ پئیں ....."

وہ ہمارے قبیلے کا آدمی تھا اور میں اسے بہتر طور پر جاننا چاہتا تھا۔ ہم نزدیکی ہوٹل میں چلے گئے۔



"آپ نے جوتوں کا ہار پہن رکھا ہے ....." ایک نوجوان نے اسے چھیڑا۔

"ہاں خود پہنا ہے کسی نے پہنایا نہیں" اس نے سر ہلا کر کہا "یہ میرے رفیق ہیں" وہ انہیں تھپکنے لگا "مجھے بہت دور اور بہت بلندی پر لے جاتے ہیں ....."

"آپ اس وقت کہاں سے آرہے ہیں؟" میں نے دریافت کیا

"اوپر سے..... بہت بلندی سے..... وہاں ایک گلیشیئر پر میں مرنے لگا تھا..... بچ گیا..... ان جوتوں کی وجہ سے..... یہ میرے دوست ہیں"

"آپ اکیلے جاتے ہیں پہاڑوں میں؟" ایک نوجوان جو بے حد مرعوب نظر آتا تھا پوچھنے لگا۔

"میں اکثر کسی مہم کے ساتھ شامل ہو جاتا ہوں ان سے کہتا ہوں کہ خیمہ میرا اپنا ہے۔ خوارک میں خود پکاؤں گا۔ صرف آپ کے ساتھ سفر کرنا چاہتا ہوں اور اکثر اوقات وہ مان جاتے ہیں۔ پھر ایسا ہوتا ہے کہ پہاڑوں میں مجھے کوئی وادی نظر آجاتی ہے۔ مجھے کہیں کوئی جنگل دکھائی دے جاتا ہے' کوئی آبشار نظر آتی ہے تو میں مہم سے الگ ہو کر ادھر چلا جاتا ہوں ..... اور اکثر اوقات مرتے مرتے بچتا ہوں..... شمال میں اب بھی ایسے علاقے ہیں جہاں مار خور انسان کے قریب آجاتے ہیں بغیر کسی خوف کے اور وہ اسے سونگھتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے..... کیونکہ انہوں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوتا....."

"واہ..." ایک نوجوان نے بے اختیار ہو کر کہا۔

"اور آپ باقی سارا سال کیا کرتے ہیں؟"

"بتایا تو ہے کہ ٹیچر ہوں بچوں کو اپنے سفر کے قصے سناتا ہوں اور قدرت کے قریب لے جانے کی کوشش کرتا ہوں..... انسان نیچر کا ایک حصہ ہے اسے اسی کے پاس واپس جانا چاہیے..... اور انسان کبھی نہیں مرتا..... انسان اور اس کا جذبہ..... مٹی سے کسی نے پوچھا تم میں خوشبو کہاں سے آئی؟ کہنے لگی میں گلاب کے پاس رہی ہوں..... مجھ میں پورے کائنات کی خوشبو ہے..... میں اس کا ایک حصہ بن چکی ہوں....."

آپ کے بال بچے آپ کی آوارہ گردیوں پر معترض نہیں ہوتے؟"

"میں نے شادی نہیں کی....." اس نے چائے پینے سے پیشتر اپنے جوتوں کا ہار میز پر رکھ دیا "کیونکہ میں بچے پیدا کرنا نہیں چاہتا"

"کیوں ....." ایک نوجوان نے فوراً پوچھا۔

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



"وہ دوسرے بچوں کو بھوکا مار دیں گے۔۔۔ دنیا میں روزانہ لاکھوں بچے بھوک کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں۔ اگر میں دو بچے اور پیدا کر دوں تو اس کا مطلب ہے کہ دو بچوں کی خوارک اور کم ہو گی۔۔ میں چاہتا ہوں کہ دنیا بھر کے بھوکے بچوں کو خوارک مہیا کروں۔۔۔ وہ سب بھی تو میرے بچے ہیں۔ میں مزید بچے پیدا کرنا نہیں چاہتا۔۔۔ مجھے اجازت دیجئے میں تھکا ہوا ہوں"

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے جوتوں کو پھر سے گلے میں ڈال لیا "ابھی مجھے شب بسری کے لیے کوئی سستا کرہ تلاش کرنا ہے"

"ہمارا ہوٹل بے حد سستا ہے۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔۔" میڈیکل کے طالب علموں نے بڑے اشتیاق سے اسے دعوت دی۔

"چلیں۔۔۔" وہ اٹھا "جب تک انسان گلے میں جوتوں کا ہار نہ پہنے وہ اپنے آپ کو نہیں پہچانتا تارڑ صاحب۔۔۔ مٹی میں خوشبو کہاں سے آئی۔۔۔؟" وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر چلا گیا اور میں بہت دیر تک اس کی شخصیت کے الجھاؤ میں گم وہاں بیٹھا رہا۔

واپس "راکا پوشی ان" میں اپنے کمرے میں آیا تو وہاں ایک اور الجھاؤ میرا منتظر تھا۔ نظامی صاحب بستر پر دراز تھے اور مطیع آلتی پالتی مارے اپنے بستر پر بیٹھا عینک اتارے تیزی سے آنکھیں جھپک رہا تھا۔

"نظامی صاحب نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔۔"

"کیا ہوا؟"

"آپ کو یاد ہے بازار کے بعد جب وہ بلند راستہ آیا تھا تو نظامی صاحب ایک دیوار کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے تھے اور آپ سے کہا تھا کہ کیا کرنا ہے قلعہ دیکھ کر؟"

"ہاں۔۔۔"

"آپ کے جانے کے بعد میں نے غور کیا تو نظامی صاحب کا چہرہ زرد ہو چکا تھا اور یہ کھڑے بھی نہیں ہو سکتے تھے۔۔۔ وہیں بیٹھ گئے۔۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہوا ہے تو پہلے چپ رہے پھر کہنے لگے کہ یار مجھے وہ ہارٹ شارٹ کی تھوڑی سی پرابلم ہے"

"ہارٹ۔۔۔" میں نے نظامی صاحب کی جانب دیکھا وہ کمبل اوڑھے ہوئے تھے اور یقیناً اس وقت ہماری باتیں سن رہے تھے۔ میرے سامنے وہ تمام بلندیاں اور چڑھائیاں گھوم گئیں جہاں ہم نظامی صاحب کو لے کر گئے تھے۔۔۔ ان میں خپلو کی



چقچن مسجد کی چڑھائی بھی شامل تھی۔۔۔ انہیں وہاں کچھ ہو جاتا تو؟ اور اب ہم انہیں نانگا پربت کے بیس کیمپ کی جانب لے جانے لگے تھے۔۔۔ اچھی ٹیم بنائی ہے میں نے' مجھے ایک دم غصہ آ گیا ایک صاحب روزانہ شوگر کا ٹیکہ خود لگاتے ہیں اور دوسرے دل کے مریض ہیں۔۔۔ "نظامی صاحب آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

"بادشاہو ہمیں کوئی نہیں ہارٹ شارٹ کی پرابلم۔۔۔" کمبل کے اندر سے ان کی آواز آئی۔۔۔

"ذرا چہرہ کرائیں اور اٹھ کر بیٹھیں۔۔۔" میں نے انہیں باقاعدہ ڈانٹا اور وہ اچھے بچوں کی طرح فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"آپ کو اس سفر کے دوران کچھ ہو جاتا تو کون ذمہ دار ہوتا؟ میں۔۔۔ آپ نے بتایا کیوں نہیں؟"

"بادشاہو بتا دیتا تو آپ مجھے اپنے ساتھ لاتے؟"

"نہیں ہرگز نہیں۔۔۔"

"اسی لیے نہیں بتایا تھا۔۔۔"

میں بہت دیر تک کڑھتا رہا۔ مطیع بھی چپ بیٹھا آنکھیں جھپکتا رہا۔ پھر نظامی صاحب بڑی نرمی سے کہنے لگے "یار یہ ڈاکٹرز جو ہوتے ہیں ان پڑھ ہوتے ہیں۔۔۔ کہتے ہیں کہ انجائنا ہے۔ اندازہ کرو گولیاں شولیاں بھی دے رکھی ہیں لیکن میں نہیں کھاتا۔۔۔"

"بڑی عقلمندی کرتے ہیں ناں کہ گولیاں نہیں کھاتے۔۔۔"

"میں دل کے درد کو برداشت کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ مجھے کہاں تک لے جاتا ہے"

وادی کی ڈھلوانوں پر کھڑے پاپلر کے درخت نگر گلیشیر سے آنے والی ہوا کے زور سے اندھیرے میں شور کرتے تھے اور جب ہم چپ ہو جاتے تھے تو ان کا شور کمرے میں بولتا تھا۔

"آپ ہمارے ساتھ نانگا پربت کے بیس کیمپ تک نہیں جا رہے۔۔۔" میں نے ہمت کر کے کہا کیونکہ نظامی صاحب کو بھی اسی فقرے کا انتظار تھا اور اسی لیے وہ فوراً بولے "نہیں کیوں نہیں جا رہے۔۔۔ میں کیا سمجھتا ہوں دل کی بیماری کو۔۔۔ آپ فکر ہی نہ کرو۔۔۔"

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



"آپ نہیں جا سکتے" مطیع نے بھی فیصلہ دے دیا اور نظامی صاحب کے چہرے پر وہ زردی پھیلی جو لاعلاج مریض کے چہرے پر اس لمحے پھیلتی ہے جب ڈاکٹر اسے آخری انکار کرتا ہے.....

"کیوں نہیں جا سکتے" نظامی صاحب نے ہمت کر کے پھر کہا' ان کی آواز شدت جذبات سے بیٹھ چکی تھی۔ "تم نے کوئی مجھے اٹھا کر لے جانا ہے.... خود چل کر جاؤں گا اپنے پاؤں پر.... مجھے تم روک لو گے.... میں خود آ جاؤں گا تمہارے پیچھے پیچھے......"

"نہیں......" میں نے اس شخص کے لئے بے پناہ ہمدردی محسوس کرتے ہوئے کہا "نظامی صاحب وہاں اگر آپ کو کچھ ہو جاتا ہے تو.... میں آپ کو واپس گجرات نہیں پہنچا سکتا.... یہ میرے بس کی بات نہیں"

"تو بادشاہو وہیں چھوڑ آنا.... کیا فرق پڑتا ہے۔ کم از کم جگہ تو خوبصورت ہو گی ناں.... پریاں شریاں.... مرنا تو بندے نے ہوتا ہی ہے کہیں نہ کہیں...." انہوں نے ہم دونوں کی جانب باری باری دیکھا...... اور ہمارے چہروں پر اپنے لیے دکھ دیکھا اور پھر نظامی صاحب اپنے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ زندگی کے ان گوشوں کے بارے میں جو ہم سے پوشیدہ تھے.... ان لمحوں کے بارے میں جو ان پر بھاری گزرے.... اپنی پہلی بیوی کے بارے میں۔

"میں اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ کالج میں دس منٹ کے لیے فارغ ہوتا تو گھر آ کر اسے ایک نظر دیکھ جاتا۔ اس کی ہر خواہش پوری کرتا..... محلے والے کہتے ماسٹر نے تو ہماری بیویوں کو بھی چوڑ کر دیا ہے یہ کہتی ہیں کہ ہمیں بھی اس طرح رکھو جس طرح ماسٹر اپنی بیوی کو رکھتا ہے لاڈ پیار سے اور عزت سے..... اور پھر وہ مر گئی... لوگوں نے مجھے ذمہ دار ٹھہرایا... میں تو اس سے بے حد محبت کرتا تھا بادشاہو... محلے والے کہتے تھے ماسٹر نے تو ہماری بیویوں کو بھی چوڑ کر دیا ہے..."

وادی کی ڈھلوانوں پر کھڑے پاپلر ہوا کے زور سے شور کرتے تھے اور بہت کرتے تھے۔ ہم تینوں گلگت بازار میں کھڑے تھے اور ہمارے رک سیک اوندھے کچھوؤں کی طرح فٹ پاتھ پر پڑے تھے۔

کریم آباد سے واپسی کا سفر خاموشی میں طے ہوا۔ ابھی ابھی اکرام ہمیں یہاں



چھوڑ کر اپنے دفتر گیا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے تھے اور چلاس کے لئے ویگن دو بجے روانہ ہوتی تھی۔ ان ڈھائی گھنٹوں میں ہمیں ویگن کے لیے بکنگ کرانا تھی اور فیری میڈو کے سفر کے لیے تمام ضروری سامان خریدنا تھا اور یہ ایک بہت طویل فہرست تھی اور میں اسے جیب سے نکال کر بار بار دیکھتا تھا۔

"تو پھر میں جاؤں؟" نظامی صاحب اب بالکل تر و تازہ تھے اور ہمیں چھیڑنے کے موڈ میں تھے "یار ہمیں بھی لے چلو اپنے ساتھ..... ہم بھی دیکھیں ناں پریاں شریاں"

"آج شب تو یہیں گلگت میں بسر کریں اور کل صبح پسو چلے جائیں...... بہت پرسکون اور خوبصورت قصبہ ہے اور وہاں میرے ایک دوست ماسٹر حقیقت بھی ہیں' آپ کی دیکھ بھال کریں گے اور دو ماسٹر اکٹھے ہو جائیں گے......"

"نظامی صاحب یہ بہت اچھا آئیڈیا ہے" مطیع بولا "اتنی دور آ کر گجرات واپس چلے جانا بہت بے وقوفی ہے۔ آپ چند دن ادھر ہی گزاریں....."

"اکیلا ہی گھومتا پھروں؟ یار اکیلے گھومتے مجھے بڑا ڈر لگتا ہے" نظامی صاحب کی تازگی یکدم ماند پڑ گئی" ویسے پسو اچھی جگہ ہے؟"

"بہت......"

"تو پھر ٹھیک ہے میں کل صبح ہی جاتا ہوں...... کتنی دیر میں پہنچ جاؤں گا پانچ چھ گھنٹے میں؟ بس تو جی مجھے کیا پرواہ ہے آپ کی.... آپ جاؤ نانگا پربت.... میں پسو جا کر آرام کرتا ہوں......" نظامی صاحب نے اپنا بیگ اٹھا لیا "رور سائیڈ ٹورسٹ لاج میں رات بسر کرتا ہوں اچھی جگہ تھی..... اچھا بھئی مطیع..... لو جی تارڑ صاحب پھر ملاقاتیں ہوں گی"

"سوری نظامی صاحب...." میں نے کہا لیکن یہ دراصل ہم دونوں نے دل سے کہا کیونکہ ہم بے حد مجرم محسوس کر رہے تھے۔ ہم اپنے ایک ساتھی کو راستے میں چھوڑ رہے تھے لیکن اس کیفیت کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ نظامی صاحب نے سڑک پار کی دوسری جانب پہنچ کر بیگ کو فٹ پاتھ پر رکھا اور چند گہرے سانس لے کر بیگ پھر اٹھایا اور آہستہ آہستہ چلتے چنار ان کی جانب مڑ گئے۔

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



## "چینی شیر سندھ کی گہری گونج اور رائے کوٹ پل"

"مطیع .... ہمارے پاس تقریباً دو گھنٹے باقی ہیں۔ ویگن کی بکنگ اور پھر خریداری"
ہم ویگن سٹینڈ پر پہنچے۔ بکنگ کلرک سے گفتگو کی۔ لیکن اس نے ہماری جانب دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا۔ ایک نوجوان کوہستانی ہماری مدد کو آیا اور اس نے بتایا کہ بکنگ ویگن سٹارٹ ہونے سے آدھا گھنٹے پہلے ہو گی ...... تب ہم بھاگم بھاگ بازار میں پہنچے ...... "ہم" سے مراد صرف میں تھا کیونکہ مطیع الرحمان بڑے پرسکون انداز میں گلگت بازار میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ پھل کھا رہے تھے۔ پرانے سکے اور زیورات تلاش کر رہے تھے۔ ان کے ذمہ رات کے کھانے کے لیے چپلی کباب اور نانوں کی خریداری تھی۔ میں نے فہرست ہاتھ میں پکڑی اور بازار کی تقریباً ہر دوکان میں جا کر مطلوبہ اشیاء خریدیں اور ان کے پیکٹ بندھوا کر انہیں وہیں رکھوا دیا۔ ہمیں کم از کم ایک ہفتہ کی خوراک اور دیگر اشیائے ضرورت خریدنا تھیں۔ اس روز گلگت بازار کے فٹ پاتھ پر جو شخص پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دوڑ رہا تھا اور مخبوط الحواس تھا' وہ میں تھا .... اور جو شخص فٹ پاتھ پر اطمینان سے کھڑا چند سیاحوں کے ساتھ گپ بازی کر رہا تھا وہ مطیع تھا اور جب کبھی میں پسینہ پونچھتا اس کے قریب سے گزرتا وہ کہتا "میری مدد کی ضرورت تو نہیں؟" .... ایک مرتبہ جب میں شاید بیسویں مرتبہ اس کے قریب سے گزرا تو اس نے چار پانچ حضرات کو یہ لالچ دے کر روک رکھا تھا کہ ابھی آپ کی ملاقات تارڑ صاحب سے کرائیں گے اور پھر اکٹھے چائے پئیں گے اور یہ جو منہ کھولے پسینہ پونچھتے چلے آ رہے ہیں یہی تو تارڑ صاحب ہیں .... جناب یہ ہیں .... یہ کہہ کر اس نے ان معززین کا تعارف کرانا شروع کر دیا ......



اور ہماری ویگن چلنے میں صرف پندرہ منٹ باقی تھے اور ہمارا سامان گلگت بازار میں ایک کلومیٹر کے علاقے میں واقع مختلف دوکانوں میں بندھا پڑا تھا اور ابھی اسے سمیٹنا تھا ..... میں نے رکے بغیر چلتے چلتے ان حضرات سے ہاتھ ملایا اور پھر سپیڈ پکڑ لی .... بعد میں مطیع بے حد ناراض ہوا کہ ان میں تو ایک کرنل صاحب بھی تھے۔ آپ نے لفٹ ہی نہیں کرائی۔ ان کے ساتھ ایک کپ چائے پی لیتے تو کون سا طوفان آ جاتا .... زیادہ سے زیادہ چلاس جانے والی ویگن مس ہو جاتی تو کل چلے جاتے .... انسان کو اتنا بھی مغرور نہیں ہونا چاہیے۔

اور جب ہم اپنی درجنوں پوٹلیاں سنبھالتے گھسیٹتے ویگن اسٹینڈ پر پہنچے تو چلاس جانے والی آخری ویگن کے لیے تمام نشستیں پر ہو چکی تھیں اور بکنگ کلرک جو پہلے ہماری طرف دیکھتا نہ تھا اب وہ ہماری سنتا بھی نہ تھا .... میں نے بہت شور مچایا کہ میں ڈھائی گھنٹے پیشتر یہاں آیا تھا اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ بکنگ ہو جائے گی لیکن بے سود .... تب اس کوہستانی نوجوان نے ویگن کے اندر سے سر نکالا اور باہر تھوکا اور پھر ہنگامہ کر دیا کہ یہ صاحب اس ویگن میں ضرور بیٹھے گا کیونکہ یہ سچ کہتا ہے اس کلرک نے وعدہ کیا تھا .... اگر نہیں بٹھائے گا تو ویگن نہیں چلے گا .... چلے گا تو ہم روک دے گا .... اور اس کے ساتھ اس نے اپنی کمر کو تھپتھپایا یہ بتانے کے لیے کہ ویگن روکنے کے لیے اس کے پاس مناسب بندوبست ہے .... چنانچہ دو حضرات کو اٹھا کر باہر پھینک دیا گیا اور ہمیں جگہ دے دی گئی۔ ان حضرات نے بالکل احتجاج نہ کیا کیونکہ یہ دراصل ہماری نشستوں پر ہی بیٹھے ہوئے تھے اور وہ اطمینان سے کپڑے جھاڑتے ہوئے چلے گئے۔

ڈرائیور اپنی نشست پر بیٹھ گیا اور چابی گھما کر انجن گرم کرنے لگا .... اور تب اس لمحے مجھے اس خیمے کا خیال آیا جو اکرام کے دفتر میں رکھا تھا اور جسے مطیع نے وہاں سے لانا تھا اور جس کے بغیر ظاہر ہے ہم فیری میڈو جانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے ....

"مطیع صاحب ہمارے پاس خیمہ نہیں ہے"

"ہاں .... وہ تو نہیں ہے" اس نے بڑے اطمینان سے کہا اور برابر بیٹھے ہوئے ایک ڈاکٹر صاحب سے پھر محو گفتگو ہو گیا۔

"اور اس کے بغیر ہم ٹریکنگ پر نہیں جا سکتے ...." وہ بدستور محو گفتگو تھا اس لیے میں نے ذرا گرجدار آواز میں کہا "خاں صاحب ابھی اس وقت جائیں اور رکشے پر

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



سوار ہو کر جائیں اور اگر اکرام کا دفتر بند نہیں ہو گیا تو خیمہ لے کر آئیں ....."

"ایک تو آپ کو جلدی بہت ہوتی ہے ....." وہ بیزار ہو کر بولا "ویگن تو چلنے والی ہے اور ہمارا سامان بھی اوپر بندھ چکا ہے ..... خیمے کے بغیر گزارہ کر لیں گے فکر نہ کریں۔"

"خاں صاحب ....." میں نے صرف اتنا کہا اور اور مطیع مسکراتا ہوا ویگن سے اتر گیا "اور وہاں اگر تمہیں دیر ہو جائے تو کل صبح کی ویگن پر بیٹھ کر آ جانا میں رائے کوٹ پل پر تمہارا انتظار کروں گا ..... اور ہاں ..... خیمہ لگانے کا طریقہ بھی معلوم کر کے آنا ....."

مطیع چلا گیا ..... ویگن حرکت میں آ گئی ..... اب میں نے ان ڈاکٹر صاحب سے رجوع کیا جن کے ساتھ مطیع گپ لگا رہا تھا۔ ان کا نام قاضی سلیم تھا اور وہ سول ہسپتال دوغانے' بلتستان میں میڈیکل آفیسر تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ اگر یہ ویگن اڈے سے باہر نکل گئی تو میرا ساتھی کبھی بھی خیمے کے ساتھ رائے کوٹ پل پر نہیں پہنچے گا ..... وہ دو تین روز گلگت بازار میں پرانے سکے تلاش کرے گا اور پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر جہاز میں سوار ہو کر راولپنڈی چلا جائے گا اور شاید وہاں جا کر اسے خیال آ جائے کہ تارڑ رائے کوٹ پل پر بیٹھا میرا اور خیمے کا انتظار کر رہا ہے۔ اس آہ و زاری کا مناسب اثر ہوا اور ڈاکٹر صاحب نے ویگن ڈرائیور سے مذاکرات شروع کر دیئے۔ ان میں بار بار مہمان اور مسافر کا ذکر آتا تھا۔ ڈرائیور بھی بار بار کھڑکی سے باہر تھوکتا تھا' شدید غصہ کا اظہار کرتا تھا اور ایکسیلیٹر کو پپ کرتا چلا جاتا تھا ..... دس منٹ کے بعد اس کی بے صبری کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور ویگن اڈے سے باہر جانے کے لیے رینگنے لگی ..... میرا دل بھی رینگتا ہوا نیچے ہونے لگا ..... لیکن مطیع "ٹھہرو ٹھہرو" کا شور مچاتا' کاندھے پر خیمہ رکھے اسی لمحے وارد ہو گیا۔ وہ ویگن کے اندر داخل ہوا تو دیگر مسافرین نے اسے خوب تھپکیاں دیں۔

ویگن شاہراہ ریشم پر آئی تو اس کی رفتار میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ..... لیکن ڈرائیور ماہر تھا وہ تیز مگر محتاط چلاتا تھا۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے جگلوٹ میں رکے ..... شاندار قراقرم اتنے بلند تھے کہ سورج ابھی سے ان کے پیچھے پوشیدہ ہو رہا تھا اور ان کے سائے وادیوں میں پھیلتے جا رہے تھے۔ ویگن کے اندر گرمی تھی۔ ہمارے آس پاس چٹیل پہاڑ تھے جو سارا دن دھوپ سے گرم ہوتے تھے اور پھر شام کے وقت ان میں سے تپش خارج ہوتی ہے۔ یہ علاقہ گرم موسموں کا تھا اور بنجر ویرانوں کا تھا۔



روشنی ابھی تھی جب ویگن رائے کوٹ پل کے پار جا کر رک گئی۔

ویگن چلی گئی تو ہم نے آس پاس دیکھا .....

رائے کوٹ کا خوبصورت پل جس کے بہت نیچے سندھ کا مٹیالا پانی ایک گہری گونج کے ساتھ بہتا تھا۔ پل پر چینی شیروں کے مجسمے اترتی شام اور پہاڑوں کی ویرانی میں ..... ایک سناٹا جس میں صرف سندھ کے بہاؤ کی آواز تھی۔ اور سڑک کے کنارے ہم دونوں کے رک سیک اور پوٹلیاں ..... جدھر سے ہم آئے تھے ادھر ایک بہت بڑی چٹان تھی جو پل پر سایہ کرتی تھی ..... بائیں ہاتھ پر شنگریلا ہوٹل کی چھوٹی سی عمارت بند پڑی تھی' چند گیراج تھے۔ پل کے پہلو میں ایک چھوٹا سا کیبن تھا جس میں دو پولیس والے دبکے بیٹھے تھے۔ کیبن کے ساتھ بڑے بڑے پتھروں کا ایک مجموعہ تھا اور تھوڑی سی ریتلی جگہ تھی۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ فیری میڈو اور نانگا پربت جانے والے کوہ پیما اسی مقام پر خیمہ نصب کر کے رات گزارتے ہیں .....

لیکن یہاں تنہائی بہت تھی اور شاہراہ ریشم پر سے گزرنے والی اکا دکا بس یا ویگن بھی اس خوف کو کم نہیں کرتی تھی جو اس تنگ درہ نما مقام پر دل میں بیٹھتا جاتا تھا ..... پل کے بائیں ہاتھ پر تو پولیس کیبن تھی اور وہ ریتلی جگہ جہاں شب بسری کے لیے ہمیں خیمہ زن ہونا تھا اور دائیں جانب شنگریلا کے ساتھ ایک پتھریلا راستہ اوپر جاتا تھا۔ راستے کے نیچے دریا کے قریب بھی ایک چھوٹا سا ویرانہ تھا جو مجھے خیمہ لگانے کے لیے زیادہ موزوں لگ رہا تھا۔ میں جائزہ لینے کے لیے نیچے اترا۔ وہاں چند کچی کوٹھریاں تھیں جن کے چھتیں ڈھے چکی تھیں اور ان سے پرے ایک فوجی تنبو تھا جس کے باہر بنیان اور نیکر میں ملبوس ایک فوجی رات کے کھانے کے لیے ہانڈی میں ڈوئی چلا رہا تھا اور اس نے میرے سلام کرنے پر صرف ایک نظر مجھ پر ڈالی اور پھر میرے وجود سے مکمل طور پر غافل ہو گیا ..... وہ پل پر تعینات تھا اور شاید اکثر سیاح شام کے وقت جان بوجھ کر ادھر سے گزرتے ہوں گے تاکہ وہ انہیں مروتاً کھانے کی دعوت دے اور وہ اسے فوری طور پر قبول کر لیں ..... اس کے علاوہ اس کی سرد مہری کا کوئی جواز نہ تھا ..... میں کچی کوٹھریوں کے آس پاس گھوم رہا تھا کہ اینٹوں کے ایک ڈھیر کے پیچھے سے ایک کتیا نکلی' اس نے مجھے دیکھا اور یہ دیکھنا میرے لیے کافی تھا اور میں شتابی سے پل پر واپس آ گیا ..... میرا اندازہ درست تھا' بعد میں پولیس والوں نے بتایا کہ وہ پاگل تھی اور متعدد راہ گیروں کو کاٹ چکی تھی۔

ہم نے اپنے رک سیک اور دیگر سامان اٹھایا اور کیبن کے ساتھ پتھروں کے

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



درمیان ریتلی جگہ پر لے گئے ۔۔۔ مطیع نے خیمہ کھولا ۔ یہ انگلو قسم کا خیمہ تھا اور اسے نصب کرنا بے حد آسان تھا ۔ یوں بھی مطیع آج صبح اکرام سے اسے نصب کرنے کی ٹریننگ لے کر آیا تھا ۔۔۔ اس نے خیمہ زمین پر بچھایا تو میں اس کی میخیں ٹھونکنے لگا ۔۔۔ پھر یہ گنبد نما خیمہ زمین سے بلند ہو کر ایک چھوٹے سے خوبصورت اور پر آسائش گھر میں بدل گیا ۔۔۔ میں سر جھکا کر رینگتا ہوا اس کے اندر گیا تو جیسے ایک ٹائم ٹنل کے اندر سفر کرنے لگا ۔۔۔ پیچھے بہت پیچھے ۔۔۔ میں آج تک کتنی بار کتنی سرزمینوں' کیسی کیسی جسمانی اور ذہنی حالتوں میں اس طرح رینگتا ہوا ان خیموں میں داخل ہوا تھا جو عمر کے مختلف حصوں میں میرے ساتھی تھے ۔۔۔ سیاحت کا لطف اس لمحے میں ہوتا ہے جب آپ کسی سرزمین پر پہلی بار اپنا خیمہ نصب کر کے اس میں رینگتے ہوئے داخل ہوتے ہیں اور آپ واپس اپنے گھر پہنچ جاتے ہیں ۔۔۔ ہم نے اپنا اپنا سامان اندر رکھا اور پھر باہر ریت پر بیٹھ گئے ۔۔۔ اب شام گہری ہونے لگی تھی اور دریا کا شور پہلے کی نسبت بہت زیادہ بلند ہو چکا تھا ۔ ہم جب سے یہاں آئے تھے مطیع کچھ چپ چپ تھا اور وہ حیرت سے آس پاس دیکھتا تھا اور گردن میں بل دے کر عینک سنبھال کر ان پہاڑوں کو دیکھتا تھا جو ہم پر جھکے ہوئے تھے۔

" فیری میڈو کو کون سا راستہ جاتا ہے " اس نے پوچھا۔

" وہ شاید ادھر ہے اس پہاڑ کے پیچھے ۔۔۔ "

" اس پہاڑ کے پیچھے ؟ ۔۔۔ لیکن ۔۔۔ اس پر چڑھنا تو مشکل لگتا ہے "

اور میں بھی جب سے رائے کوٹ پل پر اترا تھا ادھر دیکھتا تھا جدھر دو دن کی مسافت پر فیری میڈو ہے اور تین دن کی مسافت پر نانگا پربت کا بیس کیمپ ہے اور ڈرتا تھا کہ کل میں اس خوفناک اور آسمان کے اندر تک جاتے ہوئے پہاڑ پر کیسے چڑھوں گا ۔۔۔ کیبن سے ایک نوجوان پولیس والا باہر نکلا اور ہمارے پاس آ گیا ۔ اس کے ہاتھوں میں چائے کی پیالیاں تھیں ۔۔۔ اس نے چائے ہمارے سامنے رکھی اور پھر کیبن میں جا کر دو تازہ روٹیاں لے آیا ۔۔۔

" میرا نام امیر اعظم ہے صاحب ۔۔۔ یہ کھائیں ۔۔۔ آپ ہمارے مہمان ہیں ۔۔۔ روٹیاں سوکھی ہیں لیکن تازہ ہیں ۔۔۔ "

" بہت بہت شکریہ " میں اس کے حسن سلوک سے بے حد متاثر ہوا ۔۔۔ " لیکن ہم رات کا کھانا ساتھ لائے ہوئے ہیں ۔۔۔۔۔۔ "

" نہیں لائے ہوئے " مطیع چپکے سے بولا ۔۔۔ " وہ چپلی کباب اور نان وغیرہ مجھے یاد نہیں رہے ۔۔۔ اب میں ان کرنل صاحب کو چھوڑ کر کیسے چلا جاتا ۔۔۔ "



وہاں اگر امیر اعظم نہ ہوتا تو ہمارے سفر کی پہلی رات ایک بھوکی رات ہوتی ۔۔۔ وہ ہمیں ان سیاحوں کے قصے سناتا رہا جو کبھی کبھار کسی بس یا ویگن سے اتر کر یہاں شب بسری کرتے ہیں اور اگلی صبح فیری میڈو کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں ۔۔۔ راولپنڈی کی جانب سے ایک بس آئی اور پل کے پاس کھڑی ہو گئی ۔ اس میں سے دو مسافر اترے ۔ ایک چھوٹے قد کا باریش شخص تھا جو پگڑی باندھے ہوئے تھا اور ذرا اکڑ کر چلتا تھا اور دوسرا ایک بارہ تیرہ برس کے بچے کو اٹھائے ہوئے بس میں سے باہر آیا ۔۔۔ وہ ہماری طرف دیکھے بغیر دوسری طرف اس پتھریلے راستے پر چلنے لگے جو پہاڑ کی جانب جاتا تھا ۔ تھوڑی دور جا کر وہ اپنا سامان درست کرنے کی غرض سے رکے اور انہوں نے ہماری طرف دیکھا ۔ آپس میں کچھ گفتگو کی اور پھر پیچھے مڑ کر ہمارے پاس آئے اور بیٹھ گئے۔

" مسلمان " ؟ باریش شخص نے آتے ہی پہلا سوال کیا ۔ میرے سر ہلانے پر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور کہنے لگا " ہم مسلمان تم مسلمان ۔۔۔ تم ہمارا بھائی " مطیع سے بھی یہی سوال پوچھا گیا اور پھر اسے بھی " ہم مسلمان تم مسلمان ۔۔۔ تم ہمارا بھائی "

اس نے اپنا نام مولوی عبدالرحمٰن بتایا ۔ وہ فیری میڈو کے راستے میں پڑتے گاؤں تاتو کی مسجد کا امام تھا ۔ کسی کام کی غرض سے چلاس گیا ہوا تھا اور اب گاؤں لوٹ رہا تھا ۔۔۔ اس کے ساتھی کا نام قدم خان تھا اور وہ اپنے بیمار بیٹے کے علاج کی خاطر چلاس کے ہسپتال تک گیا تھا اور اب اسے اٹھا کر گھر لے جا رہا تھا۔

" آپ کے پاس بوجھ ہے ؟ " مولوی صاحب نے پوچھا۔

" بوجھ ؟ "

" ادھر سامان۔ تم ادھر فیری میڈو جاتا ہے تو ہم بوجھ اٹھاتا ہے ۔۔۔ ہم پورٹر ہے " اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

" مولوی صاحب آپ کیسے پورٹر ہے آپ تو مولوی صاحب ہے " میں نے ہنس کر کہا۔

مولوی صاحب فوراً اٹھے اور ایک رک سیک با آسانی اٹھا کر شل کر اپنے پورٹر ہونے کا مظاہرہ کیا " یہ قدم خان ہے ۔ یہ بھی پورٹر ہے۔ یہ بھی بوجھ اٹھائے گا "

" یہ بے چارا تو اپنے بیٹے کو اٹھائے گا ۔۔۔ " میں نے قدم خان کو دیکھا۔ وہ ایک

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



ناخوش اور ناآسودہ کوہستانی تھا۔ اس کے چہرے پر بیٹے کی بیماری کی تشویش تھی اور وہ بار بار اپنی داڑھی کریدتا تھا۔

"یہ بیٹا اٹھائے گا۔۔۔" مولوی صاحب بولے "اور گدھا بوجھ اٹھائے گا"

"کون گدھا؟"

"ادھر سے آئے گا۔۔۔" اس نے بلند پہاڑ کی جانب اشارہ کیا "ابھی آئے گا"

اور ابھی تاریکی گہری نہیں ہوئی تھی جب مولوی نے آنکھ میچ کر اس بلند پہاڑ کو دیکھا جسے کوہ پیمائی کی کتابوں میں بولڈر رج کہا جاتا ہے اور میرا کندھا پکڑ کر کہنے لگا "ادھر پورٹر آتا ہے" پہلے تو مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پھر جیسے بلندی پر چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔ وہاں کچھ تھا۔۔۔

"وہاں کیا ہے؟"

"وہاں گدھا ہے اور پورٹر ہے۔ تاتو سے آتا ہے۔ ٹیم کو لینے"

اکرام نے ہمیں بتایا تھا کہ ایک آسٹرین ٹیم بھی فیری میڈو کے لئے رائے کوٹ پہنچنے والی تھی اور یہ پورٹر شاید اس کے پیغام کے نتیجے میں اس ٹیم کو لینے آ رہے تھے۔۔۔ میں پہاڑ کو دیکھتا رہا' تاریکی گہری ہو رہی تھی اور وہ آہستہ آہستہ نیچے آ رہے تھے۔۔۔ جب وہ ہم تک پہنچے تو امیر اعظم اپنی لالٹین جلا کر ہمارے درمیان رکھ رہا تھا اور ہم سب ایک دائرے میں بیٹھے تھے۔۔۔ انہوں نے درجن بھر گدھوں کو کھلا چھوڑ دیا اور خود ہمارے دائرے میں شامل ہو گئے۔ وہ تقریباً پندرہ مزدور تھے جو تاتو سے ٹیم کو لینے آئے تھے۔۔۔ اور ٹیم ابھی نہیں پہنچی تھی۔۔۔ لالٹین کی روشنی میں میں نے سب کے چہروں کو غور سے دیکھا۔ ہر ایک' ایک الگ دنیا' ایک پورا جہان' ہر ایک کی امیدیں اور دکھ سکھ اور محبتیں۔۔۔ اور زندگی کے بکھیڑے۔۔۔ روزگار کے لئے وہ تاتو سے نیچے آئے تھے۔ وہ مسلسل ہم دونوں کو دیکھتے رہے اور ہم رائے کوٹ پل کے پہلو میں ایک تاریک رات میں بلند پہاڑوں کے خوف اور سندھ کے مسلسل شور میں لالٹین کی روشنی میں۔۔۔ انہیں دیکھتے رہے۔ اور سوچتے تھے کہ قدرت کا یہ کیا کھیل ہے کہ وہ وہاں ہیں ہمارے سامنے' اور ہم یہاں ہیں ان کے سامنے۔۔۔ وہ ہماری جگہ کیوں نہیں اور ہم ان کی جگہ کیوں نہیں۔۔۔ یا شاید وہ ہماری جگہ ہیں اور ہم ان کی جگہ ہیں۔



رات خیمے میں گرم تھی۔ کبھی کبھار گلگت یا راولپنڈی کی جانب سے کوئی ویگن یا بس وغیرہ آتی تو پل کے قریب آ کر اس کی رفتار کم ہو جاتی اور اس کی روشنی خیمے کے پردے پر لمحہ بھر کے لئے رونما ہوتی' ٹھہرتی اور دور ہو جاتی۔ پورٹروں کے گدھے پتھروں کے قریب کھڑے تھے۔ ان کی گردنوں میں بندھی گھنٹیاں خاموشی میں آواز دیتیں تو ایک عجیب خوف خیمے کے اندر آ جاتا جیسے باہر کوئی ہے۔۔۔ میں کروٹیں بدلتا رہا۔ میری آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ رات کے کسی پہر میں خیمے سے باہر آ گیا۔۔۔ سندھ کی گونج کے شور کے سوا ہر شے ٹھہری ہوئی تھی۔۔۔ ہاں اسی ٹھہراؤ میں کبھی کبھی گدھوں کی گھنٹیاں دستک دیتیں۔۔۔ میں پل پر چلا گیا۔ یہاں قدرے ٹھنڈک تھی۔ پل کے فٹ پاتھ پر تاتو سے آئے ہوئے پورٹر سو رہے تھے کیونکہ یہاں سندھ کی قربت تھی اور جنگلے کے نیچے سے ہوا آتی تھی۔ پل پر چینی شیروں کے چھوٹے چھوٹے مجسمے ننھی منی بلیوں کی طرح چپکے سے بیٹھے ہوئے تھے۔۔۔ وہ پہاڑ بہت بلند اور بہت تاریک تھا جس پر ہمیں کل چڑھنا تھا۔ کل نہیں بلکہ آج۔ صبح ہونے والی تھی۔

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



# "اٹھو فیئری میڈو چلو"

خیمے میں واپس جا کر میں ابھی لیٹا ہی تھا کہ مولوی رحمٰن کا باریش چہرہ خیمے کے پردے میں سے نمودار ہو گیا۔ "ہم مسلمان تم مسلمان .... تم ہمارا بھائی .... اٹھو فیئری میڈو چلو"

میں نے مطیع کے سلیپنگ بیگ کو گرفت میں لے کر زور سے ہلایا "ہم مسلمان .... تم مسلمان .... تم ہمارا بھائی .... اٹھو فیئری میڈو چلو"

مطیع نے کروٹ بدلی اور نیند میں بڑبڑایا "میکوں ٹھنڈ لگ وسی ...."

میں نے خیمے میں سے سامان باہر نکالنا شروع کر دیا .... باہر ابھی نیم تاریکی تھی .... پولیس کیبن کے باہر امیر اعظم آگ جلائے بیٹھا تھا .... قدم خان کا باپ جو پچھلی شب دوسرے پورٹروں کے ہمراہ نیچے آیا تھا' اپنے گدھے کو تھپک کر دوسرے گدھوں سے الگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رحمٰن اپنے استرہ شدہ سر پر بار بار ایک چپت سی لگاتا تھا اور پھر جانے کیوں بلند آواز میں ایک لمبی "ہو" نکالتا تھا۔ اس قسم کی چوتھی یا پانچویں "ہو" پر مطیع آنکھیں ملتا ہوا خیمے سے باہر آ گیا۔

"مطیع صاحب چلیں ؟"

"بالکل چلیں چوہدری صاحب" وہ یکدم ہوشیار ہو گیا اور خیمے کی میخیں اکھاڑ کر اسے سمیٹنے لگا۔

"پانی آ گیا مولوی صاحب" میں نے رحمٰن سے دریافت کیا ....

"پانی آ گیا ؟ کیوں نہیں آ گیا" رحمٰن بولا .... اور یہی اس کے بولنے کا انداز تھا کہ آپ جو کچھ پوچھیں گے اسے سوالیہ انداز میں دہرا کر خود ہی جواب مہیا کر دیتا ....



فیئری میڈو تک ٹریکنگ کے بارے میں میں نے جتنی کتابیں پڑھی تھیں اور جن تجربہ کار ٹریکرز سے بات کی تھی سب نے یہی بتایا تھا کہ وہاں جانے کے لئے منہ اندھیرے اٹھ کر روانہ ہو جانا ازحد ضروری ہے بلکہ کئی کتابیں تو یہاں تک مشورے دیتی ہیں کہ بے شک ٹارچ کی روشنی میں چل دیں اور آدھی رات کو چل دیں .... صرف اس لئے کہ سورج نکلنے کے ساتھ ہی فیئری میڈو کا پتھریلا راستہ جو "بولڈر رج" کہلاتا ہے' گرم ہوتا ہے اور پھر تپنے لگتا ہے۔ دس گیارہ بجے کے بعد وہاں چلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ آس پاس صرف پتھر ہیں اور وہ گرم ہو کر پگھلنے کو آتے ہیں اور یاد رہے کہ پورے راستے میں چھاؤں بالکل نہیں.... فیئری میڈو کے راستے میں ایک بھی درخت یا جھاڑی نہیں جس کے نیچے آپ ستا لیں.... اس کے علاوہ اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ رائے کوٹ پل سے روانہ ہوتے وقت آپ کے پاس پانی ہونا چاہئے .... یہ زندگی بچانے والا نکتہ ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ بہت عرصہ پیشتر کچھ ایسے ٹریکر جو ذرا لاپرواہ تھے "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ راستے میں پانی نہ ہو" یا "دیکھا جائے گا" قسم کے تھے' راستے میں ہی پیاس کی شدت سے جاں بحق ہو گئے .... یعنی فیئری میڈو جانے والا راستہ کالاہاری صحرا کا چھوٹا بھائی تھا.... گلگت میں ہماری خریداری فہرست پر سب سے اوپر "پلاسٹک کا بڑا جیری کین" تھا....

رحمٰن اس جیری کین کو نیچے جا کر سندھ سے بھر لایا تھا.... اگرچہ رائے کوٹ پل کے نیچے سندھ کا جو پانی ہے وہ گدلا ہے اور بدذائقہ ہے لیکن بہرحال پانی ہے۔

"چائے صاحب".... امیر اعظم ہمارے لیے کوہستانی میزبان کے طور پر چائے لے کر آ گیا.... اور ہمیں یاد دلایا کہ ناشتہ بھی کرنا ہے.... اور ہمارے پاس ناشتے کے لیے پنجاب بیکری گلگت سے خرید کردہ ایک ڈبل روٹی کے سوا اور کچھ نہ تھا اور اس کا کچومر نکل چکا تھا.... بہرحال چائے کے ساتھ اس کے ٹکڑے نگلنے کے بعد ہم دونوں پھر پیکنگ میں جت گئے.... تھوڑی دیر میں ہم دونوں رحمٰن اور گدھا چاروں تیار ہو چکے تھے....

"خاں صاحب چلیں ؟"

مطیع الرحمٰن خاں نے اپنی چھڑی ایک پتھر پر رکھی اور بیگ میں سے ایک ماؤ کیپ نکال کر پہن لی "چلیں"

"مولوی صاحب چلیں ؟"

"مولوی صاحب کیوں نہیں چلیں...."

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



مولوی نے میرا رک سیک اٹھایا جس کے سٹرپس کے ساتھ سٹور کی ایک دیگچی اور پانی کی ایک چھوٹی بوتل لٹک رہی تھی۔۔۔ قدم خان کے گدھے پر مطیع صاحب کا سامان اور پانی کی سپلائی تھی۔۔۔ ہم سب نے بلند آواز میں بسم اللہ پڑھ کر اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔

فیری میڈو تک پہنچنے کے لیے دو راستے ہیں۔۔۔ تاتو نالے کے ایک جانب پہاڑ پر بریگیڈیئر اسلم خان کی کچی سڑک زیر تعمیر ہے۔۔۔ راستے میں جہاں جہاں بڑے پتھر ہیں وہاں سے سڑک نہیں بن سکی اور پیدل چلنے والوں کو چند انتہائی خطرناک مقامات سے گزرنا پڑتا ہے جہاں' جہاں سے گزر جانے کے امکانات بھی قوی ہو جاتے ہیں۔۔۔ دوسرا پرانا راستہ ہے یعنی تاتو نالے کے دوسری جانب جو پہاڑی سلسلہ ہے اس کے اوپر۔۔۔ یہ راستہ انتہائی دشوار ہے' اور سورج نکلنے پر تنور بن جاتا ہے۔۔۔ ہمیں اکرام نے بتایا تھا کہ تاتو کا نمبردار شکور شاید اپنی جیپ آپ کے لیے رائے کوٹ پل پر بھیج دے گا اور آپ جہاں تک کچی سڑک ہے وہاں تک اس پر سوار ہو کر جا سکتے ہیں اور باقی راستہ پیدل طے کر لیجئے گا لیکن ایک تو جیپ کی شکل دکھائی نہ دی۔۔۔ شاید شکور کو پیغام نہیں ملا تھا۔۔۔ اور یوں بھی تاتو کے پورٹرز کا یہی خیال تھا کہ پرانا راستہ اگرچہ مشکل اور طویل ہے لیکن یہ سڑک کی نسبت اتنا خطرناک نہیں۔۔۔ چنانچہ ہم نے پرانے راستے کا چناؤ کیا۔

رائے کوٹ پل پر جھکی چٹان کے پیچھے کہیں ہلکی سی سفیدی تھی۔۔۔ شنگریلا ہوٹل کے پہلو میں سے جو پتھریلا راستہ اوپر جا رہا تھا ہم اس پر چلنے لگے۔ سب سے آگے قدم خان کا باپ اور اس کا گدھا تھا اس کے پیچھے رحمٰن سر جھکائے چل رہا تھا اور پھر ہم دونوں تھے' جو اونچے اونچے پتھروں کی وجہ سے اور نیم تاریکی کے باعث کہیں کہیں ٹھوکر کھاتے تھے اور چلتے تھے۔۔۔ اس نیم تاریکی میں ہم نے تاتو نالے کا بوسیدہ اور لرزاں پل پار کیا۔۔۔ یہاں تاتو نالہ سندھ کے اندر ٹکر مار کرتا تھا اور شور کرتا اس میں گم ہوتا تھا۔ اور اس کے پانیوں سے گندھک کی گرم بو اٹھتی تھی۔ پل کے بعد ذرا چڑھائی شروع ہوئی۔۔۔ میں ہانپنے لگا۔۔۔ میری عادت ہے کہ میں اپنی برداشت سے تجاوز کی کوشش نہیں کرتا۔۔۔ اگر میں دس قدم کے بعد تھکاوٹ محسوس کرتا ہوں تو وہیں رک کر آرام کر لیتا ہوں۔۔۔ میرا مقصد ایک خاص مقام پر پہنچنا ہوتا ہے' چاہے میں ایک دن کا سفر دو دن میں مکمل کروں۔۔۔ اس چڑھائی کے بعد ایک میدان نما علاقہ آیا۔۔۔ اور یہاں پہنچنے تک سفیدی میں چیزیں واضح ہونے لگیں اور پتھر



اور راستے اور پگڈنڈیاں دکھائی دینے لگے۔۔۔ میں نے اپنے سامنے دیکھا تو بس منہ کھولے دیکھتا ہی رہ گیا۔۔۔ سامنے ایک ناقابل عبور قسم کا انتہائی غیردوستانہ پہاڑ جیسے آسمان تک چلا گیا تھا اور ذرا ترچھا ہو کر چلا گیا تھا۔۔۔

"ہمیں وہاں جانا ہے؟" میں نے رحمٰن کو آواز دی۔

"ہمیں وہاں جانا ہے؟ کیوں نہیں جانا" وہ بولا "جدھر گدھا جاتا ہے ادھر جانا ہے"۔

اور گدھا کہاں ہے؟۔۔۔ اور یہ کمبخت گدھے کا بچہ کہاں ہے۔۔۔ میں نے اس نیم نیالے عظیم تودے کو غور سے دیکھا جس کے ان گنت پتھروں میں اور ڈھلوانوں میں کہیں وہ گدھا نظر آنا چاہیے تھا لیکن نظر نہیں آ رہا تھا۔۔۔

"مطیع گدھا کہاں ہے۔۔۔؟"

وہ اپنی چھڑی کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا اور آنکھیں بھینچ کر بلندی کی جانب اس گدھے کو تلاش کرنے لگا جس پر اس کا سامان لدا تھا۔۔۔ دراصل پتھر کی وہ دنیا اتنی وسیع تھی کہ اس میں ایک گدھا آہستہ آہستہ بلندی کی جانب بڑھتا ہوا تلاش کرنا ایک ناممکن سا کام تھا۔۔۔ لیکن وہ یکدم نظر آ گیا۔۔۔ بلکہ اس پر لدے سرخ رک سیک کی سرخی نظر آ گئی۔۔۔ میں نے فوراً کیمرہ گلے سے اتار کر تصویر اتار لی۔۔۔ میرے پاس اس وقت جبکہ میں فیری میڈو کا سفرنامہ لکھ رہا ہوں وہ تصویر سامنے میز پر رکھی ہوئی ہے۔۔۔ ایک بلند نیالے پہاڑ کی تصویر۔۔۔ ایک کونے میں رحمٰن دکھائی دیتا ہے لیکن۔۔۔ گدھا دکھائی نہیں دیتا۔۔۔ ہاں کبھی کبھار میں جب اس تصویر کو بہت غور سے دیکھتا ہوں تو وہ مل جاتا ہے۔۔۔ چنانچہ یہ تصویر "آؤ گدھا تلاش کریں" کہلاتی ہے۔۔۔

ایک راستے کے نشان تھے جس پر ہم سورج طلوع ہونے سے پیشتر چلے تھے اور چڑھتے تھے۔۔۔ شہری زندگی اور آسائشوں کا عادی بدن تھکاوٹ اور پسینے سے کپکپا رہا تھا۔۔۔ اور پسینہ ایسے بہہ رہا تھا جیسے تیز دھوپ میں کوئی کچا گلیشیئر پگھلتا ہو۔۔۔ اور پیاس۔۔۔ سوکھتی زبان۔۔۔ اور میں نے اپنا پہلا پانی مانگا۔۔۔ "پانی"

"پانی؟" رحمان رک گیا "کیوں نہیں پانی" اس نے جیری کین میں سے تام چینی کے مگ میں پانی انڈیلا اور مجھے دے دیا۔ سندھ کا گدلا اور بدذائقہ پانی کسی معجزے کے اثر سے دنیا کا شیریں ترین پانی بن چکا تھا۔۔۔

"مولوی صاحب۔۔۔ یہ جو پہاڑ ہے تو جب ہم اس کی چوٹی پر پہنچیں گے تو ادھر سے نانگا پربت نظر آئے گا؟۔۔۔

"ہاں کیوں نہیں آئے گا۔۔۔" اس کی نگاہیں میری گھڑی پر جم گئیں "یہ گھڑی

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



کتنے کی خریدی تھی؟"

"پتہ نہیں..." میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"بیچو گے؟ سو روپیہ دوں گا..."

رحمٰن اس ٹریک کے دوران میری مختلف چیزوں کی قیمتیں پوچھ کر انہیں خریدنے کی کوشش کرتا رہا...

مطیع اپنی چھڑی گھماتا آگے آگے چل رہا تھا... "کیوں جی تارڑ صاحب رہ گئے ہو؟" وہ بار بار مجھے چھیڑتا اور میں جواب نہ دیتا کیونکہ اگر میں جواب دیتا تو ہانپتا کس منہ سے؟ میں نے اپنے آپ کو ایک بڑے پتھر سے سہارا دیا اور پیچھے دیکھا... نیچے اور دور دور تک پوری لینڈ سکیپ سلیٹی رنگ کی تھی' ہم خاصی بلندی پر سے قراقرم کا مشاہدہ کر رہے تھے اور اس بلندیوں کی خاموش دنیا میں دریائے سندھ کے پانی سفید لاوے کی طرح خاموشی سے بہہ رہے تھے۔ چٹانوں اور سلیٹی پہاڑوں کو کاٹ کر پگھلتے ہوئے' بہتے ہوئے... اور ان کے اوپر ایک لکیر تھی جو ظاہر ہے شاہراہ قراقرم ہی ہو سکتی تھی... سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔

ایک خاص بلندی پر پہنچ کر راستے کی واضح علامات معدوم ہو گئیں اور ہم چھڑیوں کے سہارے بڑے بڑے پتھروں کو عبور کرتے ہوئے ان سے اپنے گھٹنے بچاتے ہوئے چلنے لگے... یہاں ہم ان لاتعداد گدھوں کے شکرگزار ہوئے جو اس راستے پر چلے اور مسافت کے دوران اپنی دمیں اٹھا کر فراغت حاصل کرتے رہے اور یوں جانے والے اپنے نشان چھوڑ گئے... اور ان نشانوں کی مدد سے ہی ہم راستہ تلاش کرتے تھے... اور پھر ہم یکدم روشنی میں آ گئے... سورج ہم تک نہیں بلکہ ہم سورج تک آ گئے تھے۔ نیچے دریائے سندھ اور رائے کوٹ پل ابھی اسی نیم تاریکی میں تھے جس میں ہم انہیں چھوڑ کر آئے تھے۔

"پانی" مطیع نے دہائی دی۔

"پانی؟ کیوں نہیں پانی..." رحمٰن فوراً رک گیا۔

مطیع نے چند گھونٹ پانی پیا اور بقیہ سر پر انڈیل لیا "مولوی صاحب ہم دو تین گھنٹے میں تاتو پہنچ جائیں گے؟"۔

"دو تین گھنٹے میں تاتو پہنچ جائیں گے؟ کیوں نہیں پہنچ جائیں گے" مولوی رحمٰن سر ہلا کر بولا...

"اگر ہم دو تین گھنٹے میں تاتو پہنچ جاتے ہیں تو آج ہی فیئری میڈو کے لیے



روانہ ہو جائیں گے..." مطیع کہنے لگا۔

"پہلے تاتو تو پہنچ لیں..."

"تاتو تو پہنچ گئے..." رحمٰن نے جیری کین اٹھاتے ہوئے ہمیں نوید دی "اس پہاڑ کے دوسری طرف تاتو ہے..."

ہم نے خاصی دیر چلنے اور چڑھنے کے بعد جب بھی مڑ کر دیکھا... وہاں رائے کوٹ کا پل اور دریائے سندھ نظر آتا تھا صرف ان کا سائز چھوٹا ہوتا جاتا تھا اور ہم ان دونوں سے بے حد بیزار ہوئے کیونکہ جانتے تھے کہ یہ ہمارے سفر کے آغاز کی علامتیں ہیں اور جب یہ نظروں سے اوجھل ہوں گی تب دوسری جانب منزل دکھائی دینے کی آس بندھے گی... ویسے یہ ایک شاندار منظر تھا جو صرف ہم جیسے جیالوں اور گدھوں کی قسمت میں ہی لکھا تھا... اس بلندی سے اب شاہراہ ریشم فاصلے کا شکار ہو کر چٹانوں کا ایک حصہ بن چکی تھی اور مشکل سے ہی نظر آتی تھی...

دھوپ میں تیزی کے آثار تیزی سے نمایاں ہونے لگے... اس میں چبھن تھی... نیچے سندھ کے دائیں جانب بلندی پر ایک وسیع میدان تھا جس میں ایک پرپیچ راستہ دور تک جاتا تھا اور یہ استور روڈ تھی... ویسے ہم خوش قسمت تھے کہ آج آسمان بالکل خالی نہ تھا بلکہ کہیں کہیں ہلکے ہلکے بادل تھے... راستہ زیادہ خطرناک تو نہیں تھا لیکن احتیاط سے چلنا پڑتا تھا... ایک پتھر کے ساتھ لگ کر ذرا سستانے لگا تو پیچھے دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی' رائے کوٹ پل نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا... یہاں سے ایک راستہ مٹھاٹھ کے گاؤں کو جاتا تھا... ہم پھر چلنے لگے... لیکن اب ہماری حالت بہت دگرگوں ہو چکی تھی۔ کم از کم میں بے حد تھک چکا تھا۔ میرے گھٹنے بے جان ہو چکے تھے' آنکھیں کھلتی نہ تھیں اور ٹانگیں اٹھتی نہ تھیں تب مطیع نے پھر شیطانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا "تارڑ صاحب بوڑھے ہو گئے ہو..."

"ہاں..." میں نے سر ہلایا۔

"رہ گئے ہو؟"

"نہیں..." میں نے بمشکل اپنے غصے پر قابو پایا "لیکن میں پہاڑوں کے ساتھ مقابلہ کرنے نہیں آیا... میں نے فیئری میڈو پہنچنا ہے اور میں انشاء اللہ پہنچ جاؤں گا... چاہے تم سے دو گھنٹے بعد پہنچوں..."

"میں آہستہ چلتا ہوں..." اس نے پیشکش کی۔

"نہیں تم اپنی چال چلو میں اپنی چال چلتا ہوں..."

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



اور بالآخر ہم اس وسیع چٹانی سلسلے کی آخری بلندی تک پہنچ گئے... یہاں مکمل ویرانی تھی' سوائے دھیرے دھیرے گرم ہوتے ہوئے پتھروں' گدھوں کے نشانوں اور تیزی سے اس پتھر سے نکل کر دوسرے پتھر میں پوشیدہ ہوتے ہوئے گرگٹوں اور کرلوں کے اور کچھ نہ تھا... ہاں بلندی تو تھی۔

"تاتو کہاں ہے" مطیع نے پوچھا۔

"تاتو کہاں ہے یہ ادھر ہے..." رحمٰن نے ایک چھوٹے سے راستے کی طرف اشارہ کیا... "ادھر تاتو ہے"

ہمارے دائیں جانب نیچے تاتو نالہ تھا جسے ہم عبور کر کے آئے تھے اور جو یہاں سے دکھائی نہ دیتا تھا۔ اور نالے کے پار دوسرے پہاڑ پر بریگیڈیئر اسلم خان کی کچی سڑک دکھائی دیتی تھی۔ اور وہ خطرناک مقام بھی دکھائی دیتے تھے جہاں پہنچ کر سڑک اختتام پذیر ہو جاتی تھی کیونکہ راستے میں اتنا بڑا پتھر ہوتا تھا کہ اسے ہٹانا یا بارود سے توڑنا بھی آسان نہ تھا... انہی مقامات پر سے مسافر حضرات سڑک چھوڑ کر نیچے اترتے تھے اور تاتو نالے میں گرنے کا خطرہ مول لیتے تھے... سڑک پر کہیں کہیں کام ہو رہا تھا۔ اور دو تین مرتبہ بارود کے زوردار دھماکے بھی پہاڑوں میں دیر تک اپنی آواز برقرار رکھے گونجتے رہے...

پتھر اب اتنے گرم ہو چکے تھے کہ ہم ان کا سہارا لینے کے لیے ہاتھ رکھتے تو انگلیاں تپش سے جل اٹھتیں... آنکھوں میں پسینہ اور اس آبی پردے کے پار پہاڑ اور سورج اور پتھروں میں چمکتا مائیکا... کچھ ایسے پتھر تھے جن پر تیل اور چکناہٹ کے آثار تھے اور یہ تیل بھی دھوپ میں گرم ہو رہا تھا۔ ہماری واٹر سپلائی بھی تیزی سے کم ہو رہی تھی اور جو پانی رہ گیا تھا وہ بے حد گرم ہو چکا تھا اور اس میں پلاسٹک کی بو تھی... ہمیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ فاصلے اور وقت کے بارے میں ہم رحمٰن کا اعتبار نہیں کر سکتے... اس کے لیے تاتو... "وہ ادھر ہے" تھا اور تاتو ہمیں نظر نہیں آتا تھا... اس راستے کی ویرانی مثالی تھی۔ ہم نے سارے دن کے سفر کے دوران اس ٹریک پر کسی ذی روح کو نہ دیکھا... اور ہریالی کا ایک پتہ تک نہ دیکھا... بعض مقامات پر ہم قدم خان کے گدھے کی چھاؤں میں بیٹھ کر آرام کرتے... اوپر چھدرے بادلوں میں سے ایک شناسا آواز آئی... ہم خشک لبوں پر زبانیں پھیرتے اور پسینہ پونچھتے اوپر دیکھنے لگے... پی آئی اے کا فوکر فرینڈ شپ طیارہ اسلام آباد سے گلگت جا



رہا تھا... ہم اس جہاز کو منہ کھولے ہانپتے ہوئے اتنے اشتیاق سے دیکھنے لگے جیسے یہ ابھی بولڈر رج کے ان دہکتے ہوئے پتھروں پر لینڈ کرے گا اور ہمیں اس عذاب سے دور لے جائے گا...

"مجھے یقین ہے کہ اس لمحہ پائلٹ بڑے شستہ لہجے میں اعلان کر رہا ہو گا کہ خواتین و حضرات ہم اس وقت نانگا پربت کی وادی کے اوپر سے گزر رہے ہیں ذرا نیچے دائیں دیکھئے ' دریائے سندھ کے ساتھ جو چٹانی سلسلہ ہے... اس کی بلندی پر... اوہو یہ کون بے وقوف کھڑے ہیں..."

مطیع ہنسنے لگا... "ویسے میں جہاز میں سوار مسافروں کو بتانا چاہتا ہوں کہ خدا کے لیے کوئی بھی ادھر کو نہ آئے... فیری میڈو کی جانب رخ نہ کرے..."

"تو بتا دو..." میں نے پسینے سے نچڑتے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"اوئے بھائی مسافرو..." مطیع بیچ بیچ منہ پر ہاتھ رکھ کر گلگت کی جانب رینگتے جہاز کو مخاطب کرتے ہوئے چیخنے لگا "پائلٹ کی باتوں کا اعتبار نہ کرنا... دل دیتا ہے رو رو دہائی کوئی کسی سے پیار نہ کرے اور کوئی تارڑ صاحب کی باتوں میں نہ آئے... اوئے لوگو میں مارا گیا میں لوٹا گیا... فیری میڈو دیکھنے کے چاؤ میں میرا کچومر نکل گیا..."

رحمٰن جو ذرا آگے جا چکا تھا مطیع کی چیخ و پکار سن کر واپس آ گیا...

"یہ پاگل ہو گیا ہے" میں نے کہا۔

"یہ پاگل ہو گیا ہے؟ اچھا یہ پاگل ہو گیا ہے" رحمٰن حیران بھی ہوا اور میں نے نوٹ کیا کہ اس کے بعد وہ مطیع سے ذرا ایک محفوظ فاصلے پر رہنے لگا...

جہاز نظروں سے اوجھل ہوا تو ہم پھر نارمل ہو گئے اور چلنے لگے۔

"ویسے تارڑ صاحب ایک بات بتائیں اور سچ سچ بتائیں..."

"جو کہوں گا سچ کہوں گا..."

"میرے والد صاحب سے آپ نے مسجد میں دینی تعلیم حاصل کی تو کیا وہ آپ کی پٹائی کیا کرتے تھے ' آپ پر ظلم و ستم کے پہاڑ وغیرہ ڈھاتے تھے..."

میں چونک گیا۔ اسے کیسے معلوم ہوا کہ اللہ بخشے مولوی صاحب مجھے بے دریغ زدوکوب کیا کرتے تھے۔ "نہیں بالکل نہیں... بس کبھی کبھار ترنگ میں ہوتے تھے تو دس بیس تھپڑ لگا دیا کرتے تھے لیکن تم کیوں پوچھتے ہو؟"

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



"مجھے کافی دیر سے ایک عجیب و غریب خیال تنگ کر رہا ہے... کہ آپ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مجھے یہاں لائے ہیں تاکہ آپ ان پھبتیوں کا بدلہ لے سکیں جو آج سے چالیس برس پیشتر قبلہ والد صاحب نے آپ کو لگائی تھیں... ورنہ کسی بھی شریف آدمی کو ایسی جگہ لانے کا کوئی جواز نہیں بنتا..." اور مطیع صاحب یہ گفتگو بڑی سنجیدگی سے کر رہے تھے... لگتا تھا کہ تھکاوٹ اس پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے۔ اس کی چلبلاہٹ میں کمی واقع ہو چکی تھی اور اس نے کافی دیر سے "تارڑ صاحب رہ گئے ہو؟" کا نعرہ بھی نہیں لگایا تھا... ہم سائے کے لیے پتھروں کے ساتھ ہو کر چلتے تو ان میں سے خارج ہونے والی تپش بے حال کرتی تھی... میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ فیئری میڈو جانے والا یہ راستہ اتنا تکلیف دہ اور جان لیوا ہو گا... ایک فرانسیسی سیاح نے اس کے بارے میں درست کہا تھا کہ یہ راستہ نہیں قتل ہے...

"اوئے رحمن تاتو کہاں ہے؟..." مطیع بار بار پوچھتا اور وہ "تاتو کہاں ہے؟ تاتو ادھر ہے" کہہ کر چلتا جاتا...

دوپہر کے کھانے کے لیے ہم ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گئے... بلکہ ڈھیر ہو گئے... اور دوپہر کے کھانے کے لیے ہمارے پاس ایک کیک کے چند ٹکڑے اور جوس کا ایک ڈبہ تھا... ہماری منصوبہ بندی کے تحت ہمیں دوپہر کے کھانے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ ہم نے دوپہر کو تاتو پہنچ جانا تھا... اور ہم کہیں بھی نہیں پہنچے تھے... تاتو نالے سے گندھک کی بو باقاعدگی سے آ رہی تھی۔ یہ راستہ جو پہاڑی کے ساتھ بل کھاتا' الٹتا پلٹتا چلتا جاتا تھا بس چلتا ہی جاتا تھا۔ اس پر ایک گدھا اور ایک سیاح آگے پیچھے تو چل سکتے تھے البتہ شانہ بہ شانہ چلنے سے دونوں میں سے کوئی ایک' جو نالے اور کھائی کی جانب چلتا ہو' نالے اور کھائی میں با آسانی پہنچ سکتا تھا۔ میری نظریں چند قدم دور راستے کے اس حصے پر تھیں جو بالکل ایک سیڑھی کی طرح اوپر جا رہا تھا اور دوسری جانب سے دکھائی ہی نہیں دیتا تھا... ہمارا لنچ بے حد گرم تھا... جوس نے چائے کا مزا دیا... رحمن نے وعدہ کیا تھا کہ یہاں کچھ فاصلے پر ایک پتھر میں بارش کا پانی جمع ہوتا رہتا ہے اور اگر کسی گدھے نے اسے پی نہ لیا ہو تو وہ اسے ہمارے پینے کے لیے لے آئے گا اور یہ پانی بے حد خنک اور شیریں ہو گا... ہمارا پانی یعنی جیری کین کا پانی' تقریباً ابلنے کو تھا اور اس میں پلاسٹک کی بو اب ناقابل برداشت



ہو رہی تھی...

"تارڑ صاحب آپ کیوں اچھی بھلی زندگی چھوڑ کر اس قسم کی جگہوں پر آتے ہیں اور ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی خوار کرتے ہیں؟..." مطیع پسینہ پونچھتے ہوئے کہنے لگا "آج کا تجربہ کیسا ہے؟"

"بہت ہی ہولناک... میرے لیے یہ ٹریک اتنا دشوار ہے' اتنا قاتل ہے کہ... میں دوبارہ تو نہیں آؤں گا..."

"اور اگر فیئری میڈو بہت ہی خوبصورت نکلا پھر بھی نہیں آئیں گے..."

"یہ ممکن نہیں کہ کوئی بھی جگہ اتنی خوبصورت ہو کہ اس کے لیے اس قسم کی خوفناک مسافت طے کی جائے... فیئری میڈو کتنا خوبصورت ہو سکتا ہے..."

ایک ہی مقام پر زیادہ دیر بیٹھنے سے ہمارے بدن ذرا نارمل ہو گئے اور تھکاوٹ ٹھنڈی ہو کر زیادہ دکھ دینے لگی۔

"مولوی صاحب تاتو کتنا دور ہے؟" مطیع نے کپڑے جھاڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہم مسلمان... تم مسلمان... تم ہمارا بھائی... تاتو ادھر ہے" رحمن نہایت خشوع و خضوع سے بولا...

"بہت بہت شکریہ" ہم دونوں نے جھک کر کہا اور پھر چلنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم جیسے کسی دوسرے سیارے میں کسی دوسرے وقت میں سفر کرتے تھے جہاں ہمارے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ ایک وسیع ویرانی' پہاڑی کے ساتھ چمٹا ہوا خشک تپتا ہوا راستہ اوپر ہی اوپر... گرگٹ... تاتو نالے کی گندھک کی بو... راستے پر پڑی ہوئی مینگنیاں... اور ہمارا پسینہ بدن پر چلتا ہوا اور رینگتا ہوا... رحمن ہم سے چند قدم کے فاصلے پر جا کر رک گیا اور ہمیں آگے آنے کا اشارہ کرنے لگا۔ ہم بمشکل تمام اس کے پاس آئے تو کہنے لگا "ادھر نانگا پربت"

ادھر نانگا پربت تھی... ہم نے اسے بیزاری اور کچھ نفرت سے دیکھا... ٹھیک ہے' ہو گی نانگا پربت' ہم کیا کریں... البتہ اس کی قربت میں کچھ ہریالی سی نظر آئی... لیکن وہ بہت دور تھی...

"ادھر تاتو..." رحمن کہنے لگا... "ادھر"

"ہو گا..." میں نے اکتا کر کہا "جب وہاں پہنچیں گے تو پھر کہنا کہ ادھر تاتو..."

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



یہیں کہیں وہ چشمہ تھا جس میں پانی جمع ہو رہا تھا... قطرہ قطرہ... رحمن اپنی پشت سے سامان اتار کر اوپر گیا اور آدھا مگ پانی لے آیا "بس اتنا ہے"

اور پانی واقعی ہمارے جیری کین کی نسبت ٹھنڈا تھا۔

اب ہماری آنکھوں میں بھی تھکاوٹ اور اس سے ٹوٹ کر گرنے والا لمحہ تھا... اسی لیے میں صرف سامنے دیکھتا تھا' راستے کی جانب اور قدم اٹھاتا جاتا تھا اور اگر قدموں کی جانب دیکھتا تو یقیناً میرے قدم وہیں ڈھیر ہو جاتے... مکھیاں میرے چہرے پر جھنجھنانے لگیں... اور ان مکھیوں کی جھنجھناہٹ میرے لیے موسیقی سے کم نہ تھی کیونکہ یہ ظاہر کرتی تھی کہ ہم کسی ایسی جگہ کے قریب ہو رہے ہیں جہاں زندگی ہے... نانگا پربت کی قربت کی ہریاول کا ٹکڑا ذرا بڑا ہوتا دکھائی دیتا تھا... یہاں ہم اس پہاڑی راستے کے چنگل سے آزاد ہوئے... آگے نسبتاً ہموار قسم کی جگہ تھی... اور ہم نے کتنے زمانوں سے یہ دونوں چیزیں نہیں دیکھی تھیں... رحمن کا کہنا تھا کہ اب ہم تاتو میں تھے... سامنے سے ایک چھوٹا سا بچہ گدھے پر سوار ناک پونچھتا ہوا آ رہا تھا... اس گدھے کو اور بچے کو دیکھ کر رحمن بے حد خوش ہوا کیونکہ یہ دونوں اسی کے تھے۔ مولوی صاحب کی بیگم نے اس کے لیے اپنے آٹھ بچوں میں سے ایک کے ہاتھ کھانا بھیجا تھا... رحمن نے چلتے چلتے دسترخوان میں جو کچھ بھی لپیٹا تھا وہ نگلا اور پھر کہنے لگا تم آؤ میں پہنچ کر تمہارے لیے بندوبست کرتا ہوں۔ کیونکہ ہم مسلمان تم مسلمان... میں اور مطیع اب برے حالوں میں تھے۔ ہمیں تو دور دور تک کسی گاؤں کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس یہ سہولت تھی کہ چڑھائی ختم ہو چکی تھی... تھکاوٹ کا یہ حال تھا کہ ہماری چھڑیاں بھی زمین پر ٹیکنے سے ٹانگوں کی طرح لرزتی تھیں۔ مطیع نے خشک گھاس کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کے پاس پہنچ کر آس پاس دیکھا اور چھڑی پھینک کر لیٹ گیا "میں آرام کرنا چاہتا ہوں"

میں تو بہانہ تلاش کر رہا تھا۔ میں بھی بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب میں نے مطیع کو اٹھانے کے لیے کندھے سے ہلایا تو وہ تقریباً نیند میں تھا "میں سونا چاہتا ہوں" وہ بڑبڑایا۔

"اٹھو یار..." میں نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں..." وہ غصے سے بولا "مجھے چھوڑ دو... میں اب نہیں اٹھ سکتا... میں آرام کرنا چاہتا ہوں' میں سونا چاہتا ہوں"



"اٹھو یار تاتو اب آنے والا ہے..."

"نہیں نہیں..." وہ نیند میں ڈوبتا ہوا بولا "تاتو کبھی نہیں آئے گا..."

اس کے چہرے پر بچوں جیسا اطمینان تھا' گھاس کا ایک تنکا اس کے نتھنوں میں جاتا تو وہ سر جھٹک کر بڑبڑاتا... میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا کہ شاید وہ اٹھ کر بیٹھ جائے لیکن وہ مزے میں تھا اور اس کی نیند گہری ہو رہی تھی... یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں اسے وہاں سوتا ہوا چھوڑ کر آگے نکل جاتا... پتہ نہیں کیسا ویرانہ تھا' کیسا علاقہ تھا اور یہاں کیسے کیسے جانور رات کو گھومتے تھے۔ میں نے اس کے دونوں شانے پکڑ کر جھنجوڑا تو وہ سر جھٹک کر بڑبڑانے لگا "نہیں جاؤں گا... تم چلے جاؤ..."

"مطیع..." میں نے اس کے رخساروں کو ذرا شدت سے تھپکا... پھر کندھوں سے جھٹکا... خاصی مشقت کے بعد وہ بیدار ہوا اور بڑی منت سماجت کے بعد وہ چلنے پر راضی ہوا... لیکن اب وہ تروتازہ ہو چکا تھا... ہموار علاقہ ختم ہونے پر کچھ کھیت دکھائی دیئے اور ہم نیچے اترنے لگے... کھیتوں کے ساتھ ایک تنگ درہ نما علاقے میں چند گھر تھے مٹیالے اور ہموار چھتوں والے... گندھک کی بو بھی قریب آ گئی' یہی تاتو تھا۔

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



## "ناتو کے گرم چشمے"

کھیتوں کے درمیان میں تاتو کے گندھک کے چشمے کا تقریباً ابلتا ہوا پانی ایک نالی میں بہہ رہا تھا اور اس پر بھاپ اٹھتی تھی... اسی گرم پانی کی مناسبت سے گاؤں کو تاتو کہا گیا... اور یہی پانی جب نانگا پربت کے رائے کوٹ گلیشیئر سے آنے والے نالے میں شامل ہوتا ہے تو نیچے رائے کوٹ پل تک اس میں گندھک کی بو شامل ہو جاتی ہے...

"یہ گرم ہے..." مطیع نالی کے کنارے بیٹھ گیا۔

"یہ بہت گرم ہے"

"اتنا بھی کیا گرم ہو گا..." اس نے پانی میں انگلی ڈالی اور "ہائے اوئے" کہہ کر کھینچ لی "گرم ہے بھئی"

کھیتوں کی مینڈھوں پر چند بچے ہمیں دور سے آتا دیکھ رہے تھے... یہ بچے خیالات کی پرواز سے آگے تک غلیظ تھے اور ان کے ناک بھرے ہوئے تھے...

گاؤں کا پہلا گھر رحمٰن کا تھا... گھر کی کچی چھت اس پگڈنڈی کی سطح پر تھی جس پر ہم آ رہے تھے۔ چھت پر ایک پرانی دری اور ایک چارپائی ہماری منتظر تھی... شہتوت کا ایک بڑا درخت اس پر جھکا ہوا تھا... رحمٰن ہماری حالت دیکھ کر ہنس رہا تھا اور کہہ رہا تھا آؤ آؤ تم مسلمان... ہم مسلمان... تھکاوٹ تو تھی لیکن اس کے ساتھ میرا دل بیٹھنے لگا... اس گاؤں میں اور اس کے آس پاس بھی ایک وحشت سی تھی' ایک اجاڑ پن اور اس سے آگے کچھ نہیں ہے' والی کیفیت... روکھے سوکھے گھر اور بے آباد چہرے... یہ ہم کہاں آ گئے ہیں... ہمیشہ جب راستے ویران اور مشکل تھے' تب ان کے آخر میں کوئی بستی ایسی آ جاتی تھی جو ساری تھکاوٹ اور مسافت کی اداسی



دور کر دیتی تھی۔ لیکن یہاں تو کیفیت کچھ اور تھی۔

رحمٰن چارپائی پر بیٹھا گاؤں والوں کی جانب فاتحانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا کیونکہ ہم اس کے مہمان تھے۔ اس سفر کے دوران وہ بار بار ہمیں اپنی نسلی برتری کے بارے میں معلومات فراہم کرتا رہا... "میں کوہستانی نہیں..." وہ سینہ ٹھونک کر کہتا "میں پختون ہوں اور ادھر روزگار کے لیے آیا ہوں... یہ تو جنگلی لوگ ہیں..."

آپ چائے پیو گے یا لسّی؟" اس نے پوچھا...

"لسّی؟" میری آنکھیں کھل گئیں... میرے خشک گلے میں اور زبان کی کڑواہٹ پر لسّی کا لفظ ایک ٹھنڈی آبشار کی طرح گرا "کیا واقعی؟"

اس نے پکے از پچّان کو کچھ کہا اور وہ بچہ سیڑھیاں اتر کر صحن میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بچہ آیا تو اس نے ڈالڈا کا ایک ٹین اٹھا رکھا تھا... "پیو پیو" رحمٰن نے وہ ٹین دونوں ہاتھوں سے تھام کر میرے آگے کر دیا... یہ دراصل لسّی نہیں بلکہ دہی تھا... لیکن یہاں یہ لسّی تھی کیونکہ شمالی علاقوں میں دہی کو لسّی پکارا جاتا ہے... ڈالڈے کا ٹین اسی لسّی سے لبریز تھا اور اسے پینے میں صرف یہ قباحت تھی کہ اس کی سفید سطح پر چند مکھیاں مردہ حالت میں تَیرتی ہوئی تھیں... میں نے جب لسّی پر جھک کر اسے کچھ دیر کے لیے غور سے دیکھا تو رحمٰن جان گیا کہ کیا مسئلہ ہے اور اس نے فوراً اپنی چھوٹی انگلی سے ان کو چن چن کر نکالا اور پھینک دیا... مجھے معلوم تھا کہ یہ صرف سطحی عمل ہے اور لسّی کے اندر بھی اس قسم کے ذخائر موجود ہوں گے لیکن... میں پیاسا تھا... میں نے آنکھیں بند کر کے دل میں بسم اللہ پڑھی اور ٹین کو لبوں سے لگا لیا... یقین کیجئے میں نے لاہور کے رائل پارک یا گوالمنڈی میں بھی اتنی شیریں' اتنی زندگی بخش لسّی نہیں پی تھی... اس لسّی نے میرے تھکاوٹ کو ختم کر دیا اور سفر کے دوران جو سر درد شروع ہوا تھا اس کا خاتمہ کر دیا... چند بچے تام چینی کی ایک تھالی میں شہتوت سجا کر لے آئے جو ہم نے رغبت سے کھائے۔ پھر رحمٰن کا بچہ ساگ سے بھری ہوئی ایک پلیٹ اٹھائے نیچے سے آیا... اس کے ساتھ روٹی بھی تھی لیکن نہ ہم یہ ساگ کھا سکتے تھے اور نہ ہی یہ روٹی... ساگ میں پانی تھا اور صرف ابلا ہوا تھا اور روٹی شاید باجرے کی تھی اور ہم بھوک کے باوجود بھی اسے نہ نگل سکے۔

تنگ درے کی جانب سے ایک شخص تیزی سے چلتا ہوا آ رہا تھا اور اس کے پیچھے اس کا ایک ملازم اس کے قریب پہنچنے کی کوشش میں ہانپتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ یہ شخص بریگیڈیئر اسلم کا منشی تھا جو کسی جنگل کی خریداری کے سلسلے میں اوپر گیا ہوا تھا۔

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



"خیمہ لگانے کے لیے کون سی جگہ مناسب رہے گی؟" میں نے رحمٰن سے پوچھا۔

"کون سی جگہ؟... جگہ کیوں نہیں۔ ادھر سکول کے سامنے نالے کے ساتھ..."

تو پھر چلیں... میں بے حد تھکا ہوا ہوں..."

گاؤں کے کھیت یہاں پہنچ کر ختم ہو جاتے تھے۔ یہاں صرف اتنی جگہ تھی کہ ہاتو نالہ اوپر سے نیچے آئے اور اس کے سامنے پرائمری سکول کی عمارت ہو اور تھوڑی سی کھلی جگہ ہو... اس کے سوا دونوں جانب پہاڑ آپ پر تنگ ہوتے تھے... رحمٰن اور قدم خان کے والد نے مل کر خیمہ لگایا... اور صبح سویرے واپس آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے... شام ہو رہی تھی... یہاں ہاتو نالے کا شور نہ تھا صرف ہلکی سی آواز تھی... مطیع خیمے میں لیٹ گیا اور میں ایک پتھر پر بیٹھ کر ڈائری لکھنے لگا... ایک تنگ درہ نما جگہ میں جہاں گھٹن کا احساس ہوتا تھا... جہاں سے ہم آئے تھے ادھر راکاپوشی کی چوٹی نظر آتی تھی جو یہاں سے سینکڑوں میل دور تھی اور جدھر ہم نے جانا تھا ادھر درے کے ناکے پر نانگا پربت کا ایک حصہ نمایاں ہو رہا تھا... اور ہم ان دو عظیم چوٹیوں کے درمیان ایک ویران گاؤں میں خیمہ زن تھے اور شام ہو رہی تھی...

ابھی اندھیرا مکمل نہیں ہوا تھا جب رحمٰن ایک لالٹین اٹھائے چلا آتا تھا... ہم مسلمان... تم مسلمان... تم ہمارا بھائی... تمہارے لیے لالٹین... اس کے ہمراہ گاؤں کے دیگر معززین بھی تھے جو ہم سے ملنے کے لیے آئے تھے... جیسے پنجاب کے دیہات میں کھانے کے بعد رات کے وقت دوستوں اور بزرگوں کی بیٹھک ہوتی ہے۔ ان میں فریدوں خان بھی تھا جو گاؤں کے نمبردار شکور کا بھائی تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ اس کے بھائی کو اگرچہ اکرام بیگ کا پیغام مل گیا تھا لیکن وہ رائے کوٹ پل پر جیپ لے کر اس لیے نہ آ سکا کہ شاہراہ ریشم پر ایک ٹرک ایڈس میں گر گیا تھا اور وہ مرنے والوں کی لاشیں جیپ میں ڈال کر چلاس چھوڑنے گیا تھا... یہاں ممتاز خان بھی آیا اور ہمارے لیے چند انڈے تحفے کے طور پر لایا... لالٹین درمیان میں رکھی ہوئی تھی اور ہم سب حلقہ بنائے اس کے گرد بیٹھے ہوئے تھے...

دو سائے درّے کے اندھیرے میں سے الگ ہوئے، ہمارے قریب آئے اور لالٹین کی روشنی کی زد میں آئے تو وہ نوجوان چہرے تھے اور وہ بھی ہمارے قریب بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک اکبر حسین تھا جو کراچی کے کسی کالج میں بی اے میں پڑھتا تھا



اور گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے ہاتو آیا تھا... اس لئے کہ ہاتو اس کا گھر تھا ورنہ کراچی چھوڑ کر ہاتو میں گرمیوں کی چھٹیاں کون گزارتا ہے... دوسرا خوشحال خان تھا جو خنک نہ تھا رائے کوٹی تھا اور خوش مزاج بہت تھا۔

"ہم نے سنا کہ آپ آئے ہوئے ہیں تو ہم آپ سے ملنے آ گئے۔ ہم ادھر جیل میں رہتا ہے..." خوشحال خان بولا۔

"کون سی جیل میں" مطیع ہنسنے لگا۔

"جیل ہمارے گاؤں کا نام ہے... اسے ہم لوگ میل کہتے ہیں... آپ لکھتے ہو ناں؟" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں لکھتا ہوں؟"

"آپ کا پیغام آیا تھا شکور صاحب کے نام... کہ آپ گلگت سے رائے کوٹ آؤ گے... تو میں نے کہا یہ شخص تو وہی ہے لکھنے والا... تو آپ فیری میڈو پر کتاب لکھو گے؟"

"شاید..."

"وہ جگہ بہت خوبصورت ہے اور ہر کوئی اس پر کتاب لکھتا ہے... آپ ہاتو کے بارے میں لکھو..."

"کیا لکھوں؟"

"یہ لکھو..." اس نے کمبل میں سے چند کاغذات نکال کر میرے سامنے رکھ دیئے... "یہ میں نے آپ کے لئے لکھا ہے کہ آپ باہر کی دنیا کو بتاؤ کہ ہاتو میں لوگوں کو بہت مشکلات ہے..."

"لیکن میں اس قسم کی کتاب نہیں لکھتا..."

"تو کس قسم کی کتاب لکھتا ہے؟ جس میں لوگوں کی مشکلات کا ذکر نہ ہو اور صرف خوبصورت جگہ کا بیان ہو..."

یہ خوشحال اتنا بھولا کوہستانی نہ تھا جتنا میں اسے سمجھا تھا... میں نے کاغذ لئے... لالٹین کی ناکافی روشنی میں ان پر جھکا... یہ ہاتو کے محل وقوع، تہذیب و ثقافت اور مشکلات وغیرہ پر ایک تفصیلی رپورٹ تھی اور دلچسپی سے خالی نہ تھی... خوشحال خان رائے کوٹی کی رپورٹ کا عنوان تھا "رائے کوٹ ہتو" اور اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا...

"ہمارے گاؤں کا نام ہتو کیوں رکھا گیا یعنی وجہ تسمیہ... ہمارے گاؤں کے

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



شروع میں گرم پانی کا ایک چشمہ واقع ہے۔ مقامی لوگ اس پانی کو تات دیئے کہتے ہیں جس کے معنی گرم پانی کے ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے ہمارے گاؤں کا نام تتو رکھا گیا۔۔۔

گرم پانی کی چند خصوصیات۔۔۔ اس میں نہانے سے بیمار لوگ شفا پاتے ہیں یا جن لوگوں کے جوڑوں میں درد ہوتی ہے یا کمر میں درد ہوتی ہے تو وہ لوگ اس پانی میں ' جو کہ ایک چھوٹی سی تالاب بنی ہوئی ہے ' اس میں چند منٹ کے لئے ڈوبے بیٹھتے ہیں۔ اس کے علاوہ موٹے آدمی اور بانجھ عورتیں شفا پاتی ہیں۔ جہاں سے یہ پانی نکلتا ہے وہاں کی مٹی سرخ اور سفید رنگ کی ہے۔ اس پانی میں جہاں سے پانی باہر نکلتا ہے کوئی سخت چیز اندر ڈالو تو پک کر باہر آتی ہے۔ اس پانی کو لیبارٹری ٹیسٹ کے لئے فرانس لے کر گئے ہیں۔

تعلیمی معیار۔۔۔ تعلیمی معیار صفر کے برابر ہے۔ ہم لوگ جیب سے چندہ کر کے ایک ماسٹر استور سے پکڑ کر لائے تھے۔ علاج معالجہ کا بندوبست۔۔۔ جب ہمارا کوئی آدمی بیمار ہوتا ہے تو اس کو سٹریچر پر لٹا کر کندھوں پر اٹھا کر مین روڈ تک پہنچاتے ہیں۔ وہاں سے گلگت علاج کو لے جاتا ہے۔

قومیت۔ عام طور ہمارے علاقے میں دو بڑی قومیں ہیں (۱) شین (۲) یشکن۔ شین قوم اعلیٰ ذات ہے۔ ہمارے علاقے کا زبان شینا بھی شین قوم کے نام پر منسوب ہے جو ہماری مادری زبان ہے۔

عام پیشے۔ کھیتی باڑی اور مویشی پالنا۔ ایک ایک گھرانے کے پاس تقریباً سو دو سو بھیڑ بکریاں اور گائے بیل ہوتے ہیں۔

شادی بیاہ کی رسومات۔ ہمارے ہاں شادی کی رسوم سادہ ہیں جس میں لڑکے اور لڑکی کی پسند اور ناپسند کو دخل نہیں۔ منگنی کے لئے لڑکی والے لڑکے والوں سے اپنی بیٹی کے عوض ایک کثیر رقم طلب کرتے ہیں جس کو مقامی زبان میں "ژپ" کہتے ہیں۔ یہ رقم پانچ ' چھ ہزار روپے سے لے کر پچاس ہزار تک ہوتی ہے۔ پھر سال دو سال بعد شادی کی تاریخ مقرر ہوتی ہے اور لڑکے والے ژپ کی رقم ادا کرتے ہیں جس کے ساتھ لڑکی والے زیورات اور کپڑے وغیرہ بناتے ہیں۔ شادی کے دن لڑکے والے باجا والوں کو بلاتے ہیں۔ جوشیلے جوان ناچتے ہیں۔ پھر نکاح زبانی ہوتا ہے۔ بعض اوقات تقریباً پچاس فٹ اونچے ایک ڈنڈے پر نشانہ باندھتے ہیں اور شرط رکھتے ہیں کہ جب تک لڑکے والے بندوق سے لکڑی کا ڈنڈا نشانہ نہیں کریں گے۔ نکاح نہیں ہو گا۔۔۔



اس لئے سب لوگ کوشش کرتے ہیں۔

زیورات۔ زیورات چاندی کے ہوتے ہیں۔ یہ زیورات ہماری عورت کی ٹوپی پر استعمال ہوتے ہیں جو پانچ دس ہزار کے ہو سکتے ہیں۔ ان زیورات کے نام ہماری زبان میں یہ ہیں۔

تومر۔ یہ تقریباً بیس تولے سے زیادہ کا ہوتا ہے۔ دو عدد شہ مئے ہوتے ہیں ان کے علاوہ سولہ کی تعداد میں مٹزنک ہوتے ہیں۔ گلے کے لئے "مقرے" پہنتے ہیں۔

بیٹا پیدا ہوا تو رسم۔ جب ہمارے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے تو اپنے قریبی رشتہ داروں کے سب جمع ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب جب بچے کے کان میں اذان پڑھتا ہے تو ہمارے لوگ سب سے پہلے اس بچے کے کان سے گوش گزار بندوق کی فائر کرتے ہیں۔ اور سب مرد آ کر فائر کرتے ہیں اس طرح تقریباً سو ڈیڑھ سو فائر کرتے ہیں۔

پسندیدہ مشغلہ۔ ہمارے لوگوں' یا مردوں کا پسندیدہ مشغلہ شکار کھیلنا ہے"۔

ناتو کی رات آہستہ آہستہ سرد ہونے لگی اور لوگ اٹھنے لگے۔۔۔ اور وہ رات بے حد سرد تھی۔ یوں محسوس ہوتا جیسے ہم کسی گلیشیئر پر خیمہ زن ہیں۔۔۔ لیکن شدید سردی کے باوجود ہم ہر شے سے بے خبر سوئے جیسے ایک شہتیر جہاں پڑا ہوتا ہے وہاں پڑا رہتا ہے ' ایسے ہم جس کروٹ لیٹے اسی کروٹ پڑے سوتے رہے۔۔۔ ہم نے بولڈر رج کو عبور کیا تھا ایک پتھریلے صحرا کو پار کیا تھا اور ہم فیری میڈو جا رہے تھے۔۔۔

صبح کی سفیدی پھیلی تو میں جاگ گیا۔۔۔ اور اسی لمحے رحمٰن کا باریش چہرہ خیمے کا پردہ اٹھا کر نمودار ہوا "ہم مسلمان۔۔۔ تم مسلمان۔۔۔ تم ہمارا بھائی۔۔۔ اٹھو فیری میڈو چلو"

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



## "فنتوری ایک فینٹسی اور فیئری میڈو کے آسمان سے گرتے ستارے"

تاتو سائے میں تھا اور دھوپ اوپر تھی اور نانگا پربت کا ایک حصہ نیلے آسمان میں نمایاں تھا۔ قدم خان اپنے گدھے پر ہمارا سامان لاد رہا تھا اور رحمٰن ہمارے لئے اپنی پختون روایت کے مطابق پراٹھے پکوا کر لایا تھا جو اس سرد صبح میں تاتو نالے کی قربت میں اور فیئری میڈو جانے کی خوشی میں شاندار ذائقہ لئے ہوئے تھے۔

"مولوی رحمٰن آج تو بتا دو کہ فیئری میڈو یہاں سے کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کتنی دور ہے؟ کیوں کتنی دور ہے؟ فیئری میڈو ادھر ہے..." اس نے نالے کے دوسری جانب کچھ فاصلے پر اٹھتی ہوئی ایک سرسبز پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

اسکول سے کچھ دور وہ چھوٹا سا پل تھا جس کے ذریعے ہم نے نالے کو عبور کیا اور دوسری جانب چٹان کے پہلو میں چلنے لگے۔ راستے میں بڑے بڑے پتھر تھے اور کچھ دیر تو تاتو نالہ ہمارے ساتھ چلا... اور پھر ہم اس درے سے پرے ہو گئے اور ہم اس درہ نما تنگی سے پرے ہوئے جس میں تاتو کا گاؤں بھنچا ہوا تھا۔ یہاں زمین تقریباً ہموار تھی اور جنگلی گلاب "سیا" کی بے شمار جھاڑیاں پھولوں سے بھری ہوئی تھیں...... آب و ہوا میں فرق نمایاں تھا اور ہم ایک سرخوشی کی کیفیت میں چلتے تھے۔ کچھ بے پروا سے اور کچھ کھلنڈرے سے کیونکہ یہاں چڑھائی نہ تھی' سامنے نیم سیاہ جنگلوں سے ڈھکی ہوئی دو پہاڑیوں کے درمیان نانگا پربت کی برفیں تھیں' ابھی دور تھیں لیکن ان کی سفید ٹھنڈک ہوا میں ہم تک آتی تھی۔ تاتو سے نکلنے کے بعد ہم "لعل" کے گاؤں



کے قریب سے گزرے اور یہاں پر خوشحال خان ہمارا منتظر تھا۔ اس نے ہمیں چائے کے لئے روکنے کی کوشش کی لیکن ہمارے سامنے فیئری میڈو تھا ہم کہاں رکتے تھے' ہم نے اس سے معذرت کی اور چلتے گئے۔

ہم نے ایک چھوٹی سی ندی کو عبور کیا اور اس دوران اس کے خنک پانیوں میں سے ابھرے ہوئے پتھروں پر بیٹھ کر ہم نے اپنے چہرے تر کیے اور جی بھر کے پانی پیا کہ یہ کئی روز کے بعد تھا کہ ہمارے سامنے صاف شفاف پانی بہتے تھے ورنہ جانے کتنی مدتوں سے ہم ایک پتھریلے صحرا کے مسافر تھے... بدن میں کل کی تھکاوٹ کی تلخی ابھی باقی تھی لیکن شاید اس آب و ہوا میں کچھ تھا جو ہمیں تروتازہ اور شفاف کر رہا تھا اور ہم کل کے دکھ بھول کر سکھ میں چلتے تھے۔ ایک اور ندی کے پار ایک اور ہموار جنگلی گلابوں کی جھاڑیوں کی جگہ ہم نے تھامس مشائلہ اور گاڈفرے کو اپنا منتظر پایا۔ انہوں نے ہمیں اس راستے پر دیکھا تھا جو فیئری میڈو کو جاتا تھا اور وہ ہم سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے' ان کے ہمراہ دو پورٹر تھے جو بھاری سامان اٹھائے ہوئے تھے۔ مطیع الرحمٰن خان نے جب یکمشت تین غیر ملکی سامنے دیکھے تو باقاعدہ پھڑپھڑانے لگا۔

تھامس اور مشائلہ میاں بیوی تھے اور جرمن تھے اور بہت سادہ طبیعت کے تھے۔

گاڈفرے بھی جرمن تھا لیکن اب آسٹریلیا میں رہتا تھا اور اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی کے بعد دنیا کی سیر کو نکلا ہوا تھا' تن تنہا فیری میڈو کی جانب رواں تھا کہ راستے میں ہم وطنوں سے ملاقات ہو گئی اور اب ان کا ساتھی تھا۔

مطیع نے فوراً سب سے ہاتھ ملایا اور ان کے ہاتھوں کو غور سے دیکھا۔

"ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ فیری میڈو یہاں سے کتنی دور ہے؟" تھامس نے گہرے جرمن لہجے کی انگریزی میں دریافت کیا۔

"ہم بھی یہی جاننا چاہتے ہیں..." میں نے جواب دیا "....اور کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ فیری میڈو کیوں جا رہے ہیں؟"

"اس لئے کہ فیئری میڈو کا نام ایک جرمن نے ہی تو دیا تھا..."

"واقعی" مطیع نے حیرت ناک انداز میں کہا۔

"شاید آپ نے ڈاکٹر ہرلگ کوفر کا نام سن رکھا ہو۔ کوفر کو نانگا پربت سے عشق تھا" تھامس سستانے کے لیے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس کے پورٹروں نے بھی رک سیک زمین پر رکھ دیئے اور ہم بھی آرام سے بیٹھ گئے کہ نانگا پربت سامنے نظر آ رہی

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



تھی اور اس کی آس پاس فیری میڈو پوشیدہ تھا اور اب ہم اسے دیکھے بغیر واپس جانے والے نہیں تھے۔

"تو کوفر کو نانگا پربت کا خبط تھا۔ ایک مہم کے دوران اس کا ایک عزیز بھائی ایک برفانی تودے تلے دب کر ہلاک ہو گیا ——— اور تب کوفر نے کہا تھا کہ وہ اس چوٹی کو ہر قیمت پر سر کرے گا۔ چنانچہ جس مہم نے نانگا پربت کو سر کیا اس کا لیڈر کوفر ہی تھا"۔

"لیکن اسے ہرمن بوہل نے فتح کیا تھا؟"

"ہاں..." مشاکلہ حیرت سے بولی "تم ہرمن بوہل کو جانتے ہو...؟"

"تو ڈاکٹر ہرلگ کوفر نے نانگا پربت سے واپسی پر ایک انتہائی حسین چراگاہ دیکھی اور اس نے کہا کہ یہ تو فیری میڈو ہے... بلکہ فیری ٹیل میڈو پریوں کی کہانیوں ایسی چراگاہ ——— جرمنی میں نانگا پربت کو جرمن ماؤنٹین کہا جاتا ہے... تو ہم جرمن ایک جرمن ماؤنٹین دیکھنے جا رہے ہیں"۔

"جو پاکستان میں ہے..." میں فوراً بولا

"تو کیا ہم اکٹھے سفر کریں" وہ اپنے پتھر سے اٹھ بیٹھا۔

"جی نہیں کم از کم میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا میں بہت آہستہ چلتا ہوں... آپ چلیں فیری میڈو میں ملاقات ہو گی۔"

گاڈفرے اور وہ اپنے دونوں پورٹروں کے ہمراہ آگے چلنے لگے۔

"ان کے ہاتھوں میں سفر کی لکیریں تھیں میں نے دیکھ لیا تھا" مطیع نے سر ہلا کر کہا۔

"اندازہ کرو..." میں نے ہنس کر کہا۔

"کیا مطلب" مطیع نے ذرا غصے سے کہا۔

"بس یہی کہ اندازہ کرو..."

دائیں جانب سیاہ جنگل سے ڈھکی پہاڑی کے قدموں میں قدم خان کا گدھا دکھائی دیا' اور پھر وہ درختوں کی اوٹ میں ہو گیا. ہمیں اس پہاڑی پر چڑھنا تھا... لیکن یہاں پتھریلا صحرا نہ تھا چیڑ کے گھنے ہریاول کی خوشبو والے درخت تھے اور درختوں کے نیچے گھاس تھی اور زرد پھول اس میں سے سر نکال کر اپنی زردی کی شوخی سے مسکراتے تھے... لیکن یہاں چڑھائی ایک ایسی سیڑھی کی طرح تھی جس پر پاؤں رکھنے کو جگہ نہ تھی... مجھے یہاں بار بار رکنا پڑا... مطیع قدم خان کے گدھے کے ساتھ آگے جا چکا



تھا اور رحمٰن کی بھی خواہش یہی تھی کہ وہ مجھ سے آگے نکل جائے لیکن میں اسے روکتا "رحمٰن میرے ساتھ رہنا' مجھے پانی کی ضرورت ہے..." پر رحمٰن آگے نکل گیا... میں آہستہ آہستہ اپنا سانس بچاتا جمع کرتا اور خوفناک چڑھائی پر جھکا قدم اٹھاتا رہا... کچھ ایسے مقام تھے جہاں آپ کسی درخت کی جڑ یا پتھر کو تھام کر اوپر چڑھتے... چیڑ کے درختوں کی چھاؤں اور خنک آب و ہوا کا کچھ فائدہ نہ تھا... یہاں بھی حلق سوکھتا تھا اور جہاں جہاں دھوپ تھی وہاں وہ بدن کو سکھاتی تھی... شاید میں نے اپنے آپ کو اپنی حدود سے پرے لے جا کر چڑھنے کی کوشش جاری رکھی' اپنی جسمانی برداشت سے تجاوز کیا' کیونکہ یکدم مجھے سہارا لے کر فوری طور پر بیٹھ جانا پڑا۔ میرا حلق خشک ہو چکا تھا اور آنکھوں کے آگے نیم تاریکی پھیلتی تھی... مجھے احساس ہوا کہ شاید بلندی اور دھوپ کی وجہ سے میں ڈی ہائیڈریشن کا شکار ہونے والا ہوں اور مجھے پانی کی اشد ضرورت تھی... اور پانی کی سپلائی مولوی رحمٰن کے پاس تھی اور رحمٰن "تم مسلمان ہم مسلمان" کا ورد کرتا ہوا اوپر جا چکا تھا... مجھے یہ بھی یقین تھا کہ اگر میں زبردستی چلنے کی کوشش کروں گا تو اس کے نتائج ہولناک ہوں گے چنانچہ میں آرام سے وہیں بیٹھ گیا... تقریباً دس منٹ کے بعد ایک گدھے والا اوپر سے آیا... میں نے پانی کا پوچھا لیکن اس کے پاس پانی نہ تھا... میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ تاتو پہنچ کر کسی بچے کے ہاتھ پانی روانہ کر دے... میری طبیعت بدستور خراب تھی اور میں اس ساری صورت حال کے لئے رحمٰن کو ذمہ دار ٹھہرا رہا تھا کیونکہ پہاڑوں میں یہ دستور ہے کہ آپ کا پورٹر ہمیشہ آپ کو ساتھ لے کر چلتا ہے اور کبھی آپ کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا... اور رحمٰن مجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا... اوپر جنگل میں سے کچھ ایسی آوازیں آئیں جیسے جانوروں کا ایک ریوڑ بے قابو ہو کر نیچے آ رہا ہے... اور یہ دراصل صرف ایک جرمن کوہ پیما تھا جو ایک عجیب خلائی قسم کے لباس میں ملبوس' دستانوں اور عینک سمیت ہاتھوں میں ہائکنگ سٹک لئے اپنے بھاری جوتوں سے تقریباً لڑھکتا ہوا دھپ دھپ نیچے آ رہا تھا۔ میں اگر باقاعدہ شور مچا کر اسے نہ روکتا تو وہ یقیناً مجھے روندتا ہوا گزر جاتا۔ اس کے پیچھے اس کا پورٹر تھا جو ایک چھوٹا سا تھیلا اٹھائے ہوئے تھا اور بقیہ سامان اس جرمن بل ڈوزر کی پشت پر تھا۔ اس نے عینک اتار کر مجھے غور سے دیکھا کہ یہ کیا شے ہے... وہ ایک نوجوان سنہری بالوں والا انسان کم اور مشین زیادہ قسم کا جرمن تھا اور اتنے صاف ستھرے اور نئے نکور لباس میں تھا جیسے کسی سٹور کے شوکیس میں سے نکل کر باہر آ رہا ہو... میں نے

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



پانی کا سوال کیا اور اس نے فوراً اپنی بیلٹ کے ساتھ لگی ہوئی تھرموس کا ڈھکن کھول کر گتے کے گلاس میں مجھے پانی پیش کر دیا۔ یہ پانی میں نے پیا کم اور اپنے چہرے اور باچھوں پر بہایا زیادہ......

"ڈانکاشن" میں نے شکریہ ادا کیا اور وہ ایک لمبا سانس اندر کھینچ کر سٹارٹ ہوا اور پوری رفتار سے نیچے لڑھکنے لگا۔

اب میں بہتر محسوس کر رہا تھا۔ میں اٹھا اور چڑھنے لگا...... لیکن ذرا احتیاط سے اتنی مشقت کے بعد اگر سچ مچ کی جنت بھی مل جائے تو مہنگی ہے...... میں یہی سوچتا دل کڑا کر کے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا چڑھتا جا رہا تھا......

"تارڑ صاحب...... تارڑ صاحب......"

میں نے بمشکل اوپر دیکھا تو مجھ سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر مطیع خان ایک شہتیر پر بیٹھا مجھے پکار رہا تھا...... اور جلدی سے اوپر آنے کو کہہ رہا تھا...... اوپر میں آ تو رہا ہوں بیوقوف آدمی' میں غصے سے بڑبڑایا...... اور جب میں اس کے قریب پہنچا ہوں تو اس کے چہرے پر ایک عجیب سرخوشی تھی اور وہ مسرت کے ان لمحوں میں تھا جب انسان مکمل طور پر نوزائیدہ ہو جاتا ہے...... اور جس شہتیر پر وہ بیٹھا تھا اس شہتیر سے چند قدم کے فاصلے پر وہ سب کچھ تھا جو اس کے چہرے پر عکس ہو رہا تھا...... چڑھائی ختم گئی...... ہوا کی شدت میں اضافہ ہو گیا لیکن یہ خالی اور بے روح ہوا نہ تھی اس میں زندگی تھی ۔اور یہ زندگی کہاں سے آئی؟ ایک وسیع سرسبز خطے کے ہرے بھرے کھیتوں سے اور جنگلی گلاب کی ان جھاڑیوں سے جن کی ٹہنیاں نظر نہیں آتی تھیں اور گمان ہوتا تھا کہ جہاں جہاں ان کی ٹہنیاں تنگی تھیں وہاں کسی نے کاغذ کے پھول ٹانک دیئے ہیں۔ ان گلاب کے ڈھیروں کے نیچے کہیں پوشیدہ اور کہیں ظاہر پانی چلتا تھا جو نانگا پربت سے آتا تھا اور نانگا پربت کا پھیلاؤ اتنا زیادہ تھا کہ یہاں آپ کے سامنے آسمان کم تھا اور نانگا پربت کا برف پوش حجم زیادہ تھا۔ یہاں آسمان کم تھا اور سبزہ اور گلاب اور پانی کا شور اور تیز خنک ہوا زندگی سے لبریز اور نانگا پربت کی برفیں زیادہ تھیں...... میں جانتا ہوں کہ اس وقت جب میں اس منظر کو حیرت سے دیکھتا تھا تو میرے چہرے پر بھی ایک عجیب سی خوشی تھی اور میں مسرت کے ان لمحوں میں تھا جب انسان مکمل طور پر نوزائیدہ ہو جاتا ہے...... اور مجھے معلوم ہوا کہ جب یونانی دیو مالا کا ہیرو جیسن سنہری کھال کی تلاش میں اپنے جہاز آرگو پر نکلا تھا اور جب وہ جادوئی سمندر میں سے کسی طلسمی جزیرے کو ابھرتا ہوا دیکھتا تھا تو اس کے دل کی کیا



حالت ہوتی تھی اور مجھے معلوم ہوا کہ اندھا شاعر ہومر کیسے شاندار مناظر "دیکھتا" تھا کہ صرف انہیں محسوس کر کے اس نے کیسی لازوال شاعری کی......

اور پھر ایک زور دار گڑگڑاہٹ ہوئی...... پتا نہیں کیا تھا...... آسمان پر بادل تو نہیں تھے' ہلکی دھوپ تھی...... لیکن آسمان تو کم تھا اور نانگا پربت کے ایک حصے میں سفید دھول اٹھ رہی تھی اور ہولے ہولے پھیل رہی تھی ......جی ہاں وہاں کوئی برفانی تودہ اپنی جگہ سے کھسکا تھا اور اب برفوں کو سمیٹتا نیچے رائے کوٹ گلیشیر میں گر رہا تھا...... میں اس جنت ارضی کو اب بھی سن سکتا ہوں کیونکہ میں اس کی تیز ہوا کو سنتا ہوں۔ جھاڑیوں اور پگڈنڈیوں کے ساتھ بہنے والے رم جھم پانی کو سنتا ہوں اور نانگا پربت پر گہری گونج کے ساتھ کھسکنے والے تودوں کی آواز سنتا ہوں...... لیکن یہ فیری میڈو نہ تھا...... اس سارے علاقے کا نام فنتوری تھا اور فیری میڈو اس کا ایک حصہ تھا جس کا مقامی نام جنت ہے...... یہ ایک ایسا علاقہ ہے جو رائے کوٹ گلیشیر کے ایک جانب بلند ڈھلوان پر پھیلا ہوا ہے...... اس کے آغاز میں ایک بلند ہموار مقام پر ایک چھوٹا سا لکڑی کا کیبن تھا' اسے تالا لگا ہوا تھا...... یہاں چند پتھر تھے جو گھاس میں سے سر نکالتے تھے۔ مقامی آبادی کا خیال ہے کہ یہاں کافروں کا قلعہ تھا۔ یہاں سے نیچے جھانکیں تو گویا آپ ایک بلند دیوار پر کھڑے جھانکتے ہیں اور نیچے تقریباً آدھے کلومیٹر کے فاصلے پر رائے کوٹ گلیشیر کا وجود ہے اور اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا دریا ہے جو غالباً تاتو نالہ ہے......

اگر یہاں یہ سماں ہے تو آگے فیری میڈو میں کیا حالات ہوں گے...... ہم اپنی تمام تکلیفیں' مصیبتیں اور رنج بھول گئے...... اور ایسے آرام سے چلنے لگے جیسے صبح کی سیر کے لیے آئے ہوں ...... کھیتوں میں عورتیں کام کر رہی تھیں اور وہ دور رہتی تھیں۔ ان کے لباس اور زیور کسی ثقافتی عجائب گھر کی طرح تھے۔ جس راستے پر ہم چل رہے تھے اس کے آس پاس بھی کھیتوں کے کنارے گلاب کی جھاڑیاں تھیں اور سرد پانی کی جو نالی ہمارے راستے کے ساتھ تھی وہ کبھی چھوٹا سا تالاب بنتی اور کبھی ننھی منی سی آبشار کا روپ دھار لیتی...... اور میں ہر چند قدم کے بعد رکتا' اپنا چہرہ پانی سے تر کرتا اور چند گھونٹ پی کر پھر آگے چلتا...... میں تو پانی کو ترسا ہوا تھا...... سامنے سے چند خواتین چلی آ رہی تھیں۔ انہوں نے چارے کے گٹھے سر پر بوجھ کیے ہوئے تھے...... ہم دونوں کو دیکھ کر انہوں نے سرگوشی کی...... ایک کہہ رہی تھی۔ انگریز انگریز...... کیونکہ ان خطوں میں صرف غیر ملکی سیاح ہی جاتے ہیں اور دوسری بی بی سر

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



بلا رہی تھی کہ نہیں مسلمان..... پاکستانی.....

فنتوری ایک ایسا منظر تھا جسے دیکھ کر دکھ بھی دل میں بیٹھتا تھا..... اور ایک نہیں بہت سارے دکھ دل میں جگہ بناتے تھے..... لفظوں کے زیاں کا دکھ ہوتا ہے جو ان مناظر پر کیا جو زندگی میں نظروں کے سامنے آئے انہوں نے مبہوت کیا اور متاثر کیا اور آپ نے جتنے لفظ تھے ان کی شان میں بیان کر دیئے اور جب کہ فنتوری کا علاقہ آپ کے سامنے ہے اور خنک ہوا کے ساتھ برفیلے پانی آپ کے پاؤں میں چلتے ہیں آپ کے پاس اسے بیان کرنے کے لئے کوئی نئے لفظ نہیں ہیں اور پرانے لفظ عرصہ ہوا برتے جا چکے ہیں' بوسیدہ ہو چکے ہیں..... تو اب کیا کریں؟ قارئین کو کیسے وہاں لے جائیں جہاں ہم تھے..... ایک اور دکھ جو دل میں جگہ بناتا ہے وہ اس منظر کو اکیلے دیکھنے کا دکھ ہے..... وہ جو پیارے ہیں ان کو بھی تو اسے دیکھنا چاہئے..... کیونکہ آپ اپنے پیاروں کے لئے دنیا کی خوبصورت ترین چیزوں کی خواہش کرتے ہیں اور یہ یقیناً ان میں سے ایک ہے..... اور ایک اور دکھ اس منظر کے گم ہو جانے کا ہے..... یہ ہو گا اور آپ نہیں ہوں گے..... تو شاید دکھ اپنے گم ہو جانے کا ہوتا ہے..... اس شام میں نے اپنی ڈائری پر جھک کر جو کچھ لکھا وہ بھی ناکافی ہے.....

"فنتوری ایک فینٹیسی تھا۔ ایک جنت گم گشتہ۔ میں کبھی بھی اس کے حسن اور نزاکت اور دل کو چھو نہ سکوں گا اور آنکھوں میں نمی لے آنے والے ماحول کی بات نہ کر سکوں گا۔ ایسے پوشیدہ کنج جن میں برفیلے پانی کا شور گرتا تھا۔ جنگلی گلاب سے گھرے راستے اور نانگا پربت آسمان کو بھرتا ہوا..... دوبار تودہ گرنے کی گڑگڑاہٹ..... مجھے اس حسن کے لئے اس حسن کو آپ تک پہنچانے کے لیے کچھ پاگل پن چاہئے' مجھ میں کچھ ہے پر اتنا نہیں جتنا کہ فنتوری کے حسن کے لئے درکار ہے..... سدا نہ باگیں بلبل بولے سدا نہ باغ بہاراں"

آسمان پر ابھی دھوپ تھی اور ابھی کہیں سے جھکے جھکے سے بادل آئے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی..... ہم نے اس بارش سے بچاؤ نہیں کیا بلکہ چلتے رہے..... ہاں ہم نے یہ محسوس کیا کہ جب کوئی بوند گردن پر گرتی ہے تو ذرا برفیلی ہوتی ہے اور بدن کو کپکپاتی ہے جیسے برف بجتی بجتی رہ گئی ہو..... پودوں اور کھیتوں کی ہریالی کو مزید شوخ کر کے اور فضاء کو تازگی دے کر وہ بارش تھم گئی اور آسمان پھر سے صاف ہو گیا.....



کچھ پرانے مکانوں میں دھوئیں سے سیاہ ہوتے دروازے کھول کر عورتیں ہمیں دیکھتی تھیں اور بچے ہمارے قریب نہ آتے تھے بلکہ دور سے شور مچاتے تھے "چاکلیٹ چاکلیٹ....." وہ ہمیں بھی غیر ملکی کوہ پیما سمجھتے تھے جو انہیں چاکلیٹ کا تحفہ دے کر جاتے تھے.....

راستے کے ساتھ ایک نالہ آ رہا تھا اور ایک مقام پر کسی زندہ دل نے اس کے عین اوپر شہتیروں سے ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنا رکھا تھا۔ رومان اپنی جگہ لیکن ایسے جھونپڑے میں سونا ذرا مشکل ہوتا ہو گا کیونکہ پانی کا بے پناہ شور ہر وقت گونجتا ہے۔ یا پھر یہ جھونپڑا سونے کے لئے نہیں صرف جاگنے کے لئے ہو گا اور ایسے جاگنے کے لئے جس کے پس منظر میں اس قسم کا شور مفید رہتا ہے۔ یہاں سے راستہ ذرا اوپر اٹھتا تھا اور کھیتوں کی بجائے گھنا جنگل آپ کو ڈھانپنے لگتا تھا لیکن زیادہ دیر تک نہیں کیونکہ آپ لکڑی کے بنائے ہوئے ایک بے ڈھبے پھاٹک کو دیکھتے ہیں..... اور اس پھاٹک کے پار فیئری میڈو ہے۔

اور جب اسی پھاٹک کو پار کیا اور فیئری میڈو میں پہنچے تو دل بیٹھ گیا..... کیا یہی فیئری میڈو ہے۔ بڑا شور سنتے تھے کہ نانگا پربت کے پہلو میں فیئری میڈو ہے اور جو پہنچے تو یہ نکلا..... خیال تھا کہ ایک دھند آلود ماحول میں داخل ہوں گے اور جوں جوں دھند تحلیل ہو گی اس میں سے پریاں ناچتی ہوئی برآمد ہوں گی اور..... اور یہاں کوہستانی حضرات کلاشنکوفیں لے کر گھوم رہے تھے اور بکریاں ہاں ہاں کر رہی تھیں اور گھاس پر مینگنیاں اور لید کے تودے تھے اور ذرا ہٹ کر مولوی رحمٰن بیٹھا دانت نکال رہا تھا.....

"بس یہی فیئری میڈو ہے یا آگے جانا ہے" میں نے ایک جانب ایک چھوٹے سے خیمے کو دیکھا جو کسی سیاح کا تھا اور سیاح متجسس بکریوں کو خیمے سے دور کرنے کے لئے "ہو ہو" کر رہا تھا اور ان کوہستانیوں کو دیکھا جو داڑھیوں کو سنوارتے ہماری جانب آ رہے تھے۔

"بس یہی فیئری میڈو ہے؟"

"کیوں نہیں ہے' یہی ہے" رحمٰن مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "ادھر خیمہ لگائے گا؟"

"کیوں لگائے گا خیمہ؟ یہ کوئی جگہ ہے اور مولوی صاحب آپ مجھے اکیلا چھوڑ کر

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



کہاں دفع ہو گئے تھے۔۔۔؟"

"کہاں دفع ہو گیا تھا؟ یہاں دفع ہو گیا تھا۔۔۔" اس نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اور اگر میں پیاس سے نڈھال ہو کر وہاں فوت ہو جاتا تو۔۔۔"

"فوت ہو جاتا؟ کیوں ہو جاتا؟ ہو جاتا تو ہم تمہارے کفن دفن کا بندوبست ادھر کرتا۔۔۔ تم مسلمان ہم مسلمان۔۔۔ ہم تمہارا بھائی۔۔۔ ہم تمہیں نماز جنازہ پڑھا کر دفن کرتا۔۔۔ ادھر کوہستانی جاہل لوگ ہیں۔۔۔ مجھے نماز جنازہ آتا ہے۔۔۔" اور یہ گفتگو رحمٰن کمال سنجیدگی سے کر رہا تھا۔

"تیرا بیڑا غرق رحمٰن۔۔۔" میں نے جھلا کر کہا اور دراصل میں فیری میڈو کی مایوسی کا غصہ رحمٰن پر اتار رہا تھا۔۔۔ ٹھیک ہے یہ ایک وسیع چراگاہ تھی اور اس کے پس منظر میں نانگا پربت یوں دکھائی دیتی ہے جیسے آپ کے صحن میں آ گئی ہے اور ایک گھنا جنگل ہے لیکن۔۔۔ یہاں بکریاں تھیں اور وحشی قسم کے کوہستانی گھوم رہے تھے۔۔۔ میں اس لمحے اس حقیقت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا کہ جس مقام پر پہنچنے کے لئے میں نے ہزار کشٹ کاٹے ہیں وہاں لوگ تو ہوں گے اور چراگاہ میں ظاہر ہے' گائے اور بکریاں وغیرہ بھی چہل قدمی کرتی ہوں گی۔۔۔

"یہ ہم ساتھ بندوق بھی لایا۔۔۔" رحمٰن نے جانے کہاں سے ایک انتہائی دقیانوسی قسم کی بندوق برآمد کر لی "اس کے ساتھ مار خور مارے گا تمہارے لئے۔۔۔ کھائے گا؟"

"کھائے گا؟ کیوں نہیں کھائے گا۔۔۔ ہم مسلمان۔۔۔ تم مسلمان۔۔۔ لیکن خیمہ یہاں نہیں لگائے گا ادھر فنتوری واپس چلتے گا وہ اچھی جگہ ہے۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ سب مسافر لوگ ادھر خیمہ لگاتا ہے۔۔۔"

"ہم مسافر لوگ ادھر خیمہ نہیں لگائے گا۔۔۔" میں نے قدرے گھبرا کر کہا کیونکہ چار پانچ کوہستانی ہمارے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ چکے تھے اور جیسا کہ محاورہ ہے وہ دانتوں تک مسلح تھے۔ مطیع اس دوران اس اکلوتے خیمے کا جائزہ لے کر آ گیا جس کے باہر ایک نوجوان بکریوں کو دور رکھنے کا چارہ کر رہا تھا۔

"اس خیمہ میں ایک ہائے ہائے ایک خوبصورت لڑکی بھی ہے۔" مطیع کہنے لگا "یہیں خیمہ لگا لیتے ہیں۔"



"اور یہاں ہائے ہائے خوبصورت کوہستانی اور ہائے ہائے خوبصورت بکریاں بھی ہیں۔" میں نے بھنا کر کہا۔۔۔ اور ہاں میں معذرت خواہ ہوں کہ میں مطیع کی ایک عادت کا تذکرہ کرنا بھول گیا اور وہ یہ ہے کہ وہ "بہت" یا "بے شمار" یا "انتہائی" کے لئے "ہائے ہائے" کا لفظ استعمال کرتا ہے چنانچہ اب تک جہاں کہیں اس کی گفتگو میں یہ تینوں لفظ آئے ہیں انہیں ہائے ہائے کر لیجئے۔۔۔

چراگاہ کی ہریالی میں چھوٹے چھوٹے زرد رنگ کے پھول تھے جو مجھے اب نظر آئے اور وہ بے شمار تھے۔۔۔ اور درمیان میں ایک چھوٹی سی ندی جو بمشکل ایک میٹر چوڑی ہو گی' جنگل کی جانب سے بہتی آتی تھی اور اس کا پانی بہت شفاف تھا اور یہ بھی اب نظر آئی کیونکہ اس کے پانی کناروں سے ذرا نیچے تھے۔۔۔ چراگاہ کے بائیں جانب ایک بڑا جھونپڑا تھا اور اس کے ساتھ ایک پہاڑی تھی جس پر بے شمار درخت تھے۔۔۔ یہ پہاڑی نانگا پربت کے عین سامنے تھی اور رائے کوٹ گلیشیئر پر جھکی ہوئی تھی۔

"رحمٰن۔۔۔ ادھر۔۔۔ ہم خیمہ ادھر لگائیں گے پہاڑی پر۔"

"پہاڑی پر؟۔۔۔ نہیں لگائیں گے" رحمٰن گھبرا گیا "ادھر ہوا بہت تیز ہوتی ہے رات کو اور ہاں پانی تو نیچے ہے ادھر۔۔۔ اوپر پانی نہیں ہے۔ کیا کرے گا۔۔۔؟ ادھر خیمہ لگاؤ"

"آپ سامان اٹھاؤ۔۔۔" میں جان گیا کہ رحمٰن اب ست پڑ چکا ہے اور سامان اٹھا کر اس پہاڑی پر چڑھنا اسے عذاب لگ رہا ہے۔۔۔ قدم خان کا گدھا بھی واپس جا چکا تھا۔۔۔

ویسے رحمٰن ٹھیک کہتا تھا۔۔۔ اس پہاڑی پر ہوا تیز تھی۔۔۔ یہاں سے پورا فیری میڈو دکھائی دیتا تھا۔۔۔ نانگا پربت اور ہمارے درمیان کچھ نہ تھا لیکن پانی نیچے بہہ رہا تھا۔۔۔ بہرحال ہم یہاں فیری میڈو دیکھنے آئے تھے پانی پینے نہیں آئے تھے۔۔۔ اور یہاں ہمارے لئے ایک خوشگوار حیرت منتظر تھی۔۔۔ تھامس اور مشائلہ کا چھوٹا سا خیمہ بھی یہیں نصب تھا اور وہ ہمیں دیکھ کر بے حد راضی ہوئے۔۔۔ وہ اپنا خیمہ لگا کر ابھی فارغ ہوئے تھے۔۔۔ گاڈفرے نیچے اتر کر ایک پتھر پر بیٹھا رائے کوٹ گلیشیئر کا نظارہ کر رہا تھا۔

"ہیلو۔۔۔ ہم تمہارا انتظام کر رہے تھے۔" تھامس آگے آ گیا "یہاں سے منظر

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



بہت شاندار ہے اور بھیڑ بکریاں بھی نہیں ہیں......"

"ہیلو...." مطیع نے ایک بار پھر دونوں کے ساتھ دست پنجہ لیا اور خاص طور پر مشائلہ سے ......اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "بڑی ہائے ہائے میم ہے چوہدری صاحب۔"

رحمٰن نے خیمہ کھول کر گھاس پر بچھا دیا تھا اور اب اس کی میخیں گاڑ رہا تھا.... میں نے نوٹ کیا کہ خیمے کا چوبی چیڑ کے درختوں کی جانب ہے "اسے اکھاڑ کر اس کا منہ ادھر کرو رحمٰن.... نانگا پربت کی جانب"

"نانگا پربت کی جانب؟ کیوں نہیں نانگا پربت کی جانب...... ادھر سے ایسا ہوا آئے گا برف والا رات کو کہ تم خود برف ہو جائے گا......"

"خیر ہے۔ منہ نانگا پربت کی طرف...."

رحمٰن بڑبڑانے لگا.... "رات کو برف کا ہوا چلے گا تو اس کو پتا چلے گا...." اور میخیں اکھاڑنے لگا.... الگو طرز کا خیمہ چند لمحوں میں ایستادہ ہو گیا۔

فیری میڈو کے کوہستانی ہمارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں بھی آ گئے تھے اور اب ہمارے خیمے سے ذرا ہٹ کر ہماری جانب بظاہر لاپروا ہو کر گلیشیئر کے دوسری جانب منہ کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔ البتہ وہ کبھی کبھار ترچھی نظروں سے ادھر دیکھ لیتے کہ اب کیا ہو رہا ہے۔ ان میں سے ایک بھوری داڑھی والا نوجوان آنکھوں پر دوربین لگائے گلیشیئر کے دوسری جانب بلند ہوتے برزل پاس کو دیکھ رہا تھا۔ یہ دوربین بھی ایک بہانہ تھا۔ وہ ہماری حرکات دلچسپی سے دیکھتے تھے لیکن یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے کہ انہیں ہم سے کسی قسم کی کوئی دلچسپی ہے۔

خیمے میں سامان رکھنے کے بعد رحمٰن نے ایک گرجدار کھنکورا مارا اور کہنے لگا "ہم ادھر سوئے گا نیچے اپنے بھائی کے پاس.... ادھر مکان میں"

جہاں ہم تھے وہاں سے پورا فیری میڈو پوری تفصیل سے نظر آتا تھا اور چونکہ یہ علاقہ تاتو کے لوگوں کی ملکیت ہے اس لئے گرمیوں میں وہ اپنا مال مویشی لے کر اوپر آ جاتے ہیں۔ فیری میڈو کے ایک جانب باقاعدہ گھر ہے اور کھیت ہیں اور ادھر جس پہاڑی پر ہم تھے اس کے برابر میں بھیڑوں کا باڑہ تھا.... جب رحمٰن نے شب بسری کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو میں نے جان لیا کہ وہ کسی نہ کسی بہانے ادھر فیری میڈو میں ٹھہرے گا اور پھر اس قیام کو ہمارے کھاتے میں ڈال کر ہم سے



رقم وصول کرے؟

"مولوی صاحب آپ جاؤ...." میں نے اس کے کندھے کو تھپکا "آپ کا بیوی صاحب اور آٹھ بچے آپ کا انتظار کرتا ہے"

"نہیں ہم بندوق لایا ہے۔ تمہارے لئے شکار کرے گا مارخور کھلائے گا..."

"ہم مارخور نہیں کھاتا...."

"مارخور نہیں کھاتا؟ کیوں نہیں کھاتا؟" اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"ہم کو مردہ مارخور اچھا نہیں لگتا۔ پہاڑوں میں گھومتا زندہ مارخور اچھا لگتا ہے...."

"تو پھر ہم ادھر تمہاری چوکیداری کرے گا بندوق سے ...... ادھر کے لوگ کوہستانی بہت خطرناک ہیں"

میں اس بارے میں بھی معلومات حاصل کر چکا تھا کہ سیاحوں کے خیمے یہاں بالکل محفوظ رہتے ہیں اور کوہستانی اتنے خطرناک نہیں ہوتے جتنے دکھائی دیتے ہیں "مولوی صاحب آپ فکر نہ کرو اور اپنی بیوی صاحب کے پاس جاؤ اور چار دن کے بعد واپس آؤ اور ہمیں نیچے لے جاؤ..."

"چلو قدم خان..." مولوی صاحب نے ناگواری سے ہر حال میں شکر گزار قدم خان کو کہنی مار کر کہا "ہم چار دن میں آئے گا... اگر تم زندہ بچ گیا تو واپس لے جائے گا"

ہم رحمٰن اور قدم خان کو پہاڑی سے اترتا دیکھتے رہے ... وہ فیری میڈو کے میدان میں چلتے تھے.... پھر وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے

کوہستانی حضرات ہم سے روٹھے ہوئے دوسری جانب منہ کر کے ابھی تک براجمان تھے اور بھوری داڑھی والا دوربین سے برزل کو بے دلی سے دیکھتا تھا.... میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا لیکن انہوں نے میرے نہایت پر جوش "السلام علیکم" کا جواب بالکل نہ دیا.....

"کیا حال ہے خان صاحب ......" ان میں سے کسی ایک نے بڑبڑا کر کچھ کہا اور زمین پر تھوکا۔

"یار یہ دوربین تو دکھاؤ..." میں نے دوستی کرنے کے لئے بھوری داڑھی والے کے آگے ہاتھ کر دیا.... اس نے مجھے اک چشم حقارت سے دیکھا کہ یہ منہ اور

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



دوربین اور پھر برزل پاس کی جانب دیکھنے لگا۔

"یار ہم تمہارا مہمان ہے' تمہارے وطن میں آیا ہے ...... کیسا کوہستانی ہے مہمان کو دوربین نہیں دکھاتا!"

اس نے اپنی نیلی آنکھوں میں غصہ بھر کر مجھے دیکھا کہ مہمان کا حوالہ دے کر مجھے بلیک میل کرتا ہے یہ لو دوربین ...... اور اس نے دوربین مجھے تھمانے کی بجائے میرے آگے پھینک دی۔ غصہ تو مجھے بھی بہت آیا کہ یہ حقیر کوہستانی کیا جانے کہ اس کے سامنے اس وقت نیلی ورژن کا ایک سپر سٹار بیٹھا ہے۔ اگرچہ باندر ٹوپی پہننے سے اور مسلسل مسافت اور بے تحاشا بڑھی ہوئی بے ترتیب داڑھی کی وجہ سے فی الحال ایک سپر مسخرہ لگ رہا ہے۔ لیکن میں نے اس لاعلم کوہستانی کو کچھ نہ کہنا مناسب جانا یہ نہیں کہ میں اس کی کلاشنکوف سے خوفزدہ ہو گیا تھا ...... یہ میرا اپنا فیصلہ تھا کہ میں اپنے غصے کو قابو میں رکھوں گا ...... دوربین سے میں نے نانگا پربت پر توجہ مرکوز کی ...... اس کی سفیدی میں اتنی زیادہ تنک تھی کہ آنکھیں چندھیا گئیں ...... ہمارے عین نیچے رائے کوٹ گلیشیر تھا جس کا سلیٹی رنگ کا حجم ایک دریا کی طرح نانگا پربت کے قدموں سے جا ملتا تھا ...... یہ برف کا ایک تھما ہوا دریا تھا لیکن اس کے نیچے اس برف میں پوشیدہ ایک اور دریا تھا جس کی آواز ہم تک پہنچتی تھی۔ اس کے پانی فنتوری کے قریب جا کر برف میں سے ظاہر ہو کر روشنی میں آتے ہیں۔

ایک گڑگڑاہٹ ہوئی اور ایک گونجدار آواز فیئری میڈو پر بہت دیر ٹھہری رہی ...... اور اس لمحے میں نانگا پربت کے اس حصے کو دیکھ رہا تھا جہاں سے یہ گونج سفر کرتی ہوئی ہم تک آئی تھی اور یہ ایک چھوٹا سا ایوالانچ یعنی برفانی طوفان تھا جو سفید دھند کی صورت نیچے آ رہا تھا اور میں نے دیکھا کہ کئی چٹانیں جن کی سیاہی نمایاں تھی اب برف سے ڈھک چکی تھیں۔

میں نے دوربین آنکھوں سے ہٹائی اور نیلی آنکھوں والے کوہستانی کو دے دی ...... "شکریہ ......"

اس نے کچھ نہ کہا ...... اور پھر سب یکدم اٹھے اور سلام دعا کیے بغیر نیچے اترنے لگے ......

میں نے مطیع کی طرف دیکھا تو وہ مشائلہ کی ہتھیلی پر انگلی چلا کر اسے نوید دے رہا تھا کہ تم تین بچوں کی ماں بنو گی اور تم غیر ممالک کے سفر کرو گی ...... تھامس ایک



سوکھے ہوئے تنے پر آئینہ ٹکائے شیو کر رہا تھا ...... اور ہاں اس پہاڑی پر جو چھوٹا سا جنگل تھا اس میں اور جہاں ہمارا خیمہ تھا اس کے آس پاس بے شمار سوکھے ہوئے درخت اور ان کے تنے تھے ...... یہ درخت بارش اور برف کی وجہ سے بالکل کھوکھلے ہو چکے تھے اور مدتوں سے یہاں پڑے تھے صرف اس لئے کہ یہاں کسی کو لکڑی کی ضرورت نہ تھی اور جتنی ضرورت تھی وہ انہیں اپنے جھونپڑوں کے ارد گرد مہیا ہو جاتی تھی۔ ہمارے خیمے کے عین پیچھے ایک بہت بڑا درخت ایک عرصے سے پڑا تھا اور دور سے کسی سیاہ چینی اژدھے کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ آئندہ چند دنوں میں یہ ہمارا ساتھی بنا اور ہم اس کی اوٹ میں کھانا بناتے' کھاتے اور دھوپ سینکتے کیونکہ خیمہ کے پاس' رحمٰن ٹھیک کہتا تھا' ہوا بہت تیز ہوتی تھی۔

گاڈفرے عام جرمنوں کی نسبت پستہ قد تھا۔ تھوڑا سا بجلی لیکن نہایت خوش مزاج شخص ...... وہ سفر کے دوران کم سے کم سامان اٹھانے پر یقین رکھتا تھا چنانچہ ایک سلیپنگ بیگ اور شاید ایک جوڑا کپڑوں کے سوا اس کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ میں نے شب بسری کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگا۔

"میں ہمیشہ کھلے آسمان تلے سونا پسند کرتا ہوں ...... خیمے صرف بزدلوں کے لئے ہوتے ہیں"

"اور اگر بارش آ جائے تو؟"

"تھوڑا سا بھیگ جانے میں کوئی حرج نہیں ......" وہ اپنی داڑھی میں انگلی سے کنگھی کرتا ہوا کہنے لگا "ویسے تھامس نے مجھے اجازت دے دی ہے کہ اگر زیادہ بارش ہو جائے تو میں ان کے خیمے میں پناہ لے سکتا ہوں ......"

"اور ہمارے خیمے میں بھی ......" مطیع نے فوراً کہا۔

"شکریہ ...... کیا آپ کافی پینا پسند کریں گے؟ کیونکہ میرے پاس تھوڑی سی کافی ہے ...... اور یہاں تو کھانا پکانے اور کافی وغیرہ بنانے میں کوئی پرابلم نہیں ہو گی۔ یہاں اتنی زیادہ لکڑی ہے ...... میں نے دیکھا ہے کہ لکڑی اتنی خشک ہے کہ یہ بہت اچھی طرح جلے گی ......" گاڈفرے نیچے اتر کر خشک لکڑی جمع کرنے لگا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ نیچے سے فیئری میڈو سے "ہم مسلمان تم مسلمان" رحمٰن صاحب پھر چلے آ رہے ہیں ...... ان کے ساتھ قدم خان بھی ہے اور ایک بچہ ٹین اٹھائے ہوئے ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہم تک پہنچے تو ہانپ رہے تھے ...... اس پہاڑی پر خیمہ زن ہونے کا یہ فائدہ بھی ہوا

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



کہ جو کوئی بھی ہمیں ملنے آتا تھا راستے میں کم از کم ایک مرتبہ سانس درست کرنے کے لئے رکتا تھا اور پھر جب ہم تک پہنچتا تھا تو قدرے توقف کر کے سلسلہ کلام کا آغاز کرتا تھا۔

"ہم پھر آگیا۔۔" رحمٰن نے اپنی داڑھی پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ "ہم پانی بھول گیا تھا۔۔۔"

"کونسا پانی؟"

" وہ پانی ۔۔۔۔ نیچے فیئری میڈو میں۔ ندی کا پانی ۔۔۔۔ ادھر سے ادھر کیسے لائے گا؟ ہم نستوری میں پہنچا تو یاد آیا کہ صاحب کے پاس پانی نہیں ہے۔۔۔ کیسے لائے گا؟۔۔ وہاں سے ادھر واپس آیا۔۔۔۔"

میرا جی چاہا کہ میں رحمٰن کو جپھا ڈال کر کہوں مولوی صاحب ہم مسلمان تم مسلمان تھینک یو وری مچ۔۔۔ کیونکہ وہ درست کہتا تھا۔ نانگا پربت کو دیکھنے میں ہم سب ایسے گم ہوئے تھے کہ ہمیں قطعی طور پر یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ ہمیں کافی یا چائے بنانے' پینے اور دیگر ضروریات کے لئے پانی کی ضرورت پڑے گی اور پانی۔۔۔ وہ نیچے تھا۔۔۔

"قدم خان۔۔۔ پانی لاؤ" رحمٰن نے اپنی مذہبی سربراہی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قدم خان کو پلاسٹک کا بڑا کین دیتے ہوئے حکم دیا۔ قدم خان نے سر جھکا کر کین تھاما اور نیچے اترنے لگا۔ تب رحمٰن نے ہمیں دوسری سرپرائز دی۔۔۔ اس بچے کو ٹین سمیت پیش کیا گیا جو اب تک ایک طرف بیٹھا اپنی ناک میں انگلی چلا رہا تھا۔

"یہ تمہارے لئے لسی لایا ہے۔۔۔"

رحمٰن نے ٹین کو فخریہ انداز میں ہمارے سامنے رکھ دیا۔۔۔ اور اس ٹین میں سفید گاڑھا دہی تھا اور اس کی سفیدی میں کوئی سیاہی نہ تیرتی تھی اور اگر تھی تو کہیں اس کی گہرائی میں تھی اور مجھے پیاس لگ رہی تھی ۔۔۔۔۔ میں نے سامان میں سے چینی نکال کر دہی پر چھڑکی اور سب کو دعوت دی کہ ہم مسلمان تم مسلمان ۔۔۔۔ جب کسی نے بھی اس دعوت پر لبیک نہ کہا تو میں نے ٹین اٹھا کر منہ سے لگا لیا اور آہستہ آہستہ اس شاندار اور میٹھے دہی کو پینے اور کھانے لگا۔۔۔ اور آج پھر میری تھکاوٹ زائل ہوئی۔ میرا گڑگڑاتا ہوا پیٹ درست ہوا اور وہ نامعلوم کین تے آور قسم کا سرور بھی زائل ہو گیا جو فیئری میڈو میں پہنچتے ہی شروع ہو گیا تھا۔۔۔ یہاں ذرا کچھ بلندی کا



حساب کتاب ہو جائے۔ سندھ پر رائے کوٹ پل سطح سمندر سے گیارہ سو چورانوے میٹر اونچا ہے۔ تاتو کی بلندی دو ہزار تین سو میٹر ہے اور فیئری میڈو تین ہزار دو سو میٹر پر واقع ہے اور جہاں ہمارا خیمہ واقع تھا یہ مقام تقریباً ساڑھے تین ہزار میٹر کی بلندی پر تھا یعنی دس گیارہ ہزار فٹ کی اونچائی ۔۔۔۔ اور یہ اونچائی بہت زیادہ ہوتی ہے اور انسانی جسم اور دماغ پر اثرانداز ہوتی ہے ۔۔۔ اونچائی کی اس بیماری کا واحد علاج دہی ہے۔۔۔ اور یہ آزمودہ نسخہ ہے۔

میں نے دہی کے عوض کچھ رقم اس بچے کو دینی چاہی تو رحمٰن نے ایک بہت اچھی بات کی۔ کہنے لگا "پیسہ مت دو۔ ابھی یہ کسی مہمان سمجھ کر لایا ہے۔ اگر پیسہ دو گے تو بعد میں سب ٹورسٹ کو گاہک سمجھ کر لائے گا۔ لالچ کرے گا" چنانچہ میں نے بچے کو چند بسکٹ اور چیونگم کا ایک پیکٹ دے کر رخصت کر دیا۔۔۔ بچے نے چیونگم کے پیکٹ کو غور سے دیکھا اور کہنے لگا "یہ دیسی ہے۔ ہم تو جرمن چیونگم کھاتا ہے۔۔" میں نے بے حد معذرت کی کہ فی الحال میرے پاس تو یہی ہے۔۔۔

قدم خان جیری کین بھر کر لا چکا تھا۔ گاڈفرے کا چولہا خوب دھڑا دھڑ جل رہا تھا اور اس پر رکھی کیتلی میں پانی ابل رہا تھا۔

رحمٰن اور قدم خان چار روز بعد آنے کا وعدہ کر کے پھر نیچے اتر گئے۔۔۔

اور پھر تیز ہوا۔ سامنے نانگا پربت۔ دھواں گی گرم کافی اور خیمے کا پھڑپھڑاتا ہوا پردہ۔۔۔ ایک بوڑھا چرواہا رسی بٹتا ہوا اوپر آگیا۔۔۔ ہمیں دیکھ کر مسکراتا رہا۔۔۔ ہم نے اسے بیٹھنے کو کہا۔۔۔ وہ اردو بہت کم سمجھتا تھا۔۔۔ تھا اس کا ارادہ تھا کہ وہ اگلی صبح نانگا پربت کے بیس کیمپ تک جائے اور وہ اس کے راستے کے بارے میں بابے سے پوچھنے لگا۔۔۔ بابے نے بتایا کہ نیچے یہ جو گھنا جنگل ہے اس میں سے راستہ جاتا ہے۔ جنگلی جانور کوئی ایسا نہیں جو نقصان پہنچا سکے۔ بھیڑیئے ہیں تو سہی لیکن انسان سے ڈرتے ہیں اور پھر ادھر بیال کیمپ سے آگے گلیشیئر کے ساتھ چل کر بیس کیمپ آتا ہے۔۔۔ صرف احتیاط یہ چاہئے کہ گلیشیئر کے بعد جو نالہ ہے وہ صبح سویرے آسانی سے پار کیا جا سکتا ہے لیکن دو بجے کے بعد برف پگھلنے کی وجہ سے ناقابل عبور ہو جاتا ہے اس لئے جو کوئی بھی ادھر جاتا ہے دو بجے سے پہلے نالہ پار کر کے ادھر آ جاتا ہے ورنہ رات ادھر بسر کرنا پڑتی ہے اور رات کو ادھر اتنی سردی ہو جاتی ہے کہ چھوٹے موٹے نالے بھی جم جاتے ہیں۔۔۔ بابے نے یہ بتایا کہ وہ ہمیں دو سو روپے میں ایک چھوٹی سی

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



بھیڑ بھوننے کے لئے دے دے گا۔

میں نے اگلی صبح تھامس اینڈ کمپنی کے ساتھ نانگا پربت کے بیس کیمپ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ملیح سے پوچھا تو کہنے لگا "پہلے سے ٹانگیں اکڑی ہوئی ہیں اب صبح سویرے پھر چڑھائی مجھ سے نہیں ہو گی لیکن مجھے جگا دینا میں کوشش کروں گا۔۔۔"

ادھر برزل پاس تھا۔ ادھر گھنے جنگلوں کے علاقے تھے ادھر نانگا پربت کی بلندی تھی چنانچہ شام بڑی تیزی سے فیری میڈو میں اترنے لگی۔ وہاں اندھیرا پھیلتا گیا لیکن ہمارے سامنے نانگا پربت کی سفید دیوار پر دھوپ سرخ ہو رہی تھی۔۔۔ جیسے وادی چلو کے گھر میں ایک لڑکی نے باہر جھانکا اور ہمیں دیکھ کر اس کے گال ہمارے دیکھتے دیکھتے سرخ ہو گئے تھے پھر وہ سرخی مدھم ہونے لگی۔۔۔

"میرے پاس رات کے کھانے کے لئے تھوڑی سی کشمش اور خوبانی کے بادام ہیں۔۔۔" گاڈفرے کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پوٹلی تھی۔۔۔

"تم صرف یہ کھاؤ گے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں ساتھ پانی بھی پیوں گا۔۔۔"

میں نے خیمے سے اپنی خوراک کا مکمل ذخیرہ نکال کر اس کے سامنے ڈھیر کر دیا

"تم ہمارے مہمان ہو۔۔۔ جو جی چاہے کھاؤ"

گاڈفرے کی آنکھیں کھل گئیں "اوہ مائی گاڈ۔۔۔ سوچ فوڈ۔۔۔ سوپ۔۔۔ مچھلی۔۔۔ گوشت۔۔۔ پنیر۔۔۔ چاول اور۔۔۔ سیون اپ۔۔۔ میری ایک پیشکش ہے۔۔۔ میں بہت زبردست کک ہوں۔۔۔ خوراک تمہاری ہو گی اور اسے پکاؤں گا میں۔۔۔ اور تھوڑا سا میں بھی کھاؤں گا؟"

"یہ طے پا گیا۔۔۔" میں نے ہنس کر کہا اور اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا۔۔۔

ہم سب خنکی کے باوجود بھاری سویٹر پہنے ہوئے نانگا پربت کی جانب منہ کئے ہوئے بیٹھے رہے۔۔۔ وہ اب تاریکی کے باوجود صاف نظر آ رہی تھی۔ رائے کوٹ گلیشیئر کے نیچے چلنے والے دریا کا شور کم ہو گیا تھا کیونکہ اب سردی کی وجہ سے چھوٹے موٹے نالے بھی جم چکے تھے اور برف نہیں پگھل رہی تھی۔۔۔ اور نانگا پربت ایسی دکھائی دیتی تھی جیسے ٹیلی وژن آف کر دیں تو اس کی سکرین اندھیرے میں بھی نظر آتی رہتی ہے۔۔۔



گاڈفرے بڑے تنے کی اوٹ میں آگ جلا رہا تھا اور اس کی کیتلی میں چکن نوڈل سوپ ابل رہا تھا' اس کے بعد آملیٹ بھی تیار ہونا تھا۔۔۔

تھامس اور مشائلہ بھی ذرا کھلے اور اپنے بارے میں گفتگو کرنے لگے "ہم تبت میں تھے۔ کوہ کیلاش دیکھنے گئے۔ لاسہ اور کھٹمنڈو بھی دیکھا لیکن۔۔۔ ہمیں معلوم نہ تھا پاکستان میں یہ بھی ہے" اور "یہ" سے ان کی مراد وہ سب کچھ تھا جس کے حصار میں ہم بیٹھے تھے جو ہمارے آس پاس بلند تھا' جو اندھیرے میں بھی نظر آتا تھا۔۔۔

کھانے کے بعد ہمارے جرمن کک نے کافی کے گرم مگ ہماری ہتھیلیوں کے درمیان میں رکھ دیئے۔۔۔

گاڈفرے اپنے سلیپنگ بیگ میں لیٹ گیا اور سر کے نیچے بازو رکھ کر بولا۔ وہ ہم سے کچھ دور تھا اس لئے اندھیرے میں اس کی آواز آئی "اوپر دیکھو"

اوپر آسمان تاروں سے بھرا ہوا تھا۔۔۔

"او مائی گاڈ" مشائلہ تھامس کے بازو پر جھکی ہوئی بولی "یہ تارے تو اتنے نزدیک ہیں یہاں سے۔۔۔ تھامس میں قسم کھاتی ہوں یہ نیچے گر پڑیں گے۔۔۔" وہ بے حد سنجیدہ تھی۔۔۔

"اگر یہ نیچے گر پڑیں گے تو ہم انہیں اٹھا لیں گے۔۔۔" گاڈفرے کی ہنستی ہوئی آواز آئی اور "پھر انہیں اپنی جیبوں میں سنبھال لیں گے اور جب بھی اداس ہوں گے تو چپکے سے اپنی جیب میں جھانک لیا کریں گے۔۔۔ تم نے وہ گیت نہیں سنا کہ ایک ستارے کو سنبھال لو۔۔۔ اپنی جیب میں سنبھال لو برے وقتوں کے لئے۔۔۔"

"سنا ہے۔۔۔"

میں بھی منہ اٹھائے تاروں کو دیکھتا جاتا تھا۔۔۔ اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ اگر آپ نانگا پربت کی جانب دیکھتے رہیں تو تارے اس کے پیچھے سے طلوع ہوتے رہتے ہیں۔۔۔

"درختوں کی طرف دیکھو۔۔۔" گاڈفرے پھر بولا۔

اور چیڑ کے درختوں پر جو آسمان تھا اس میں بہت سارے ستارے یکدم ٹوٹ کر روشنی پھیلاتے گم ہو رہے تھے۔۔۔ ایک اور تارے نے سفید دودھیا راستہ بنایا۔

"اوہ۔۔۔" گاڈفرے یکدم بولا "تم نے ستارہ ٹوٹتے دیکھ کر کوئی خواہش کی؟"

"ہاں۔۔۔" میں نے اندھیرے میں سر ہلایا اور اندھیرے میں آنکھوں کی نمی نظر

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



نہیں آتی "میں نے خواہش کی کہ میں اپنے بچوں سے ملوں.... آج انہیں دیکھے مجھے دس روز ہو گئے ہیں"

فیری میڈو کے چرواہوں کے کتے زور زور سے بھونکنے لگے۔

---



# "بیس کیمپ نانگا پربت"

رات بہت گہری نیند آئی۔

ہمارے سلیپنگ بیگ بلندیوں کے آزمودہ تھے کیونکہ یہ کے ٹو کے بیس کیمپ سے ہو کر آئے تھے اور میجر مبشر کے تھے۔ اور ہمارا اگلو خیمہ مکمل طور پر ہوا بند تھا اور ہم اس کے اندر نہایت آرام سے تھے اور کبھی کبھار اس کا کپڑا ہوا کے زور سے بجتا' یہ احساس دلانے کے لئے کہ باہر موسم سرد ہے.... جب میں سلیپنگ بیگ میں گھس کر لیتا ہوں تو مجھے کچھ الجھن سی محسوس ہوئی.... جیسے سانس لینے میں دقت ہوتی ہو اور ہوا بدن میں کھینچنے کے لئے معمول سے زیادہ زور لگانا پڑتا ہو لیکن یہ بلندی کی وجہ سے تھا اور اس کا کوئی علاج نہ تھا۔ دوسری الجھن خاموشی کی تھی۔ ایک سناٹا--- اور اس سناٹے میں صرف رائے کوٹ گلیشئر کے نیچے پوشیدہ دریا چلنے کی آواز--- خیمے کا کپڑا پھڑپھڑاتا ہوا--- مطیع کے مسلسل خراٹے--- تو اس نا آشنا خاموشی سے الجھن ہوتی.... لیکن اس رات نیند بہت گہری آئی اور ایسی آئی کہ دل و دماغ کے اندر ان کی تہ میں گہری ہو کر بیٹھ گئی۔

ہاں رات کے پچھلے پہر میں جاگ گیا۔ کچھ ہوا تھا۔ کوئی تبدیلی تھی۔ کیا ہوا تھا؟.... شاید دریا کا شور میرے کانوں تک نہیں آ رہا تھا کیونکہ سناٹا مکمل ہو چکا تھا۔ کیا دریا بند ہو گیا ہے؟ میرا نیم خوابیدہ ذہن سگنل بھیج رہا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دریا رک جائے.... لیکن کچھ تو ہوا تھا کیونکہ دریا کے چلنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے جب اس خاموشی کو قبول کر لیا تو ایک ہلکا سا دھماکہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی دریا کی آواز پھر سے میرے کانوں میں آنے لگی.... اور اس رات یہ عمل دو تین بار ہوا۔ دریا کی آواز بند ہو جاتی اور تھوڑی دیر کے بعد پھر سے جاری ہو جاتی۔ اگلے روز ایک مقامی چرواہے نے بتایا کہ دراصل زیر برف بہنے والے دریا کے راستے

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



میں کبھی کبھار بہت بڑا تودا گر جاتا ہے اور اسے بند کر دیتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ پانی کا دباؤ بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے راستے میں آئے ہوئے برفانی تودے کو دھکیل کر حسب معمول بہنے لگتا ہے۔

باہر ہلکی سی روشنی ہوئی تو میں نے ٹارچ جلا کر وقت دیکھا۔ ساڑھے چار بج رہے تھے۔ میں نے خیمے کے پردے کی زپ اتاری اور باہر جھانکا۔ نانگا پربت ایک صاف آسمان میں اور نانگا پربت سے مراد صرف ایک چوٹی یا پہاڑ نہیں ہے بلکہ نانگا پربت کا سلسلہ کوہ ہے جس میں کئی چوٹیاں اور درے شامل ہیں۔ برف کے قلعے اور سفید دیواریں۔ رائے کوٹ چوٹی کی جانب سے برف کا ایک چھوٹا سا حصہ دھوپ میں آ رہا تھا..... میں خیمے سے باہر آیا اور ربڑ میٹرس بچھا کر بیٹھ گیا۔ سردی تھی لیکن بے آرام نہیں کرتی تھی' صرف اپنے ہونے کا پتہ بتاتی تھی۔ نانگا پربت ایک پکچر پوسٹ کارڈ کی طرح سفید اور شفاف اور ایک ایک تفصیل کے ساتھ دکھائی دے رہی تھی..... اس صبح وہاں اور کوئی نہ تھا جو اسے دیکھتا تھا۔ فیئری میڈو میں گھنے جنگل اور رائے کوٹ گلیشیئر کے آس پاس کوئی نہ تھا جو میری طرح اس پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

یہ علاقہ وہی تھا جسے قدیم زمانہ میں دردستان کہتے تھے۔ یہ عظیم ہمالیہ کا وہ مغربی حصہ ہے جو وادئ کشمیر سے کھسکتا ہوا دریائے سندھ کے قریب قراقرم کے سامنے آ جاتا ہے۔ اور ہمالیہ کا یہ حصہ نانگا پربت کی عظیم چوٹی کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔ آج ان علاقوں کو دیامر کہتے ہیں۔ ننگا پہاڑ ---- اور یہی نانگا پربت کا مقامی نام ہے..... اسے دیاموری بھی کہتے ہیں۔ اسے قاتل چوٹی اس لئے کہا گیا کہ اب تک پچاس کے قریب کوہ پیما اسے زیر کرنے کی خواہش میں خود زیرزمین جا چکے ہیں۔ بلکہ زیر برف کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ اور اس قتل کا آغاز پہلی برطانوی مہم کے لیڈر ممری سے ہوا جو ۱۸۹۷ء میں نانگا پربت کی جانب آئی۔ ممری کے ایک ساتھی نارمن کولی نے حادثے کے بعد اپنی ڈائری میں لکھا۔

"سورج کی روشنی اور خوبصورتی ختم ہو گئی۔ وحشی' ظالم اور دھتکارتی ہوئی نانگا پربت..... اس اجنبی سرزمین میں صرف خوف اور وحشت ہے۔ اور سب سے زیادہ خوفناک احساس یہ ہے کہ ---- یہ چیز آپ کے سامنے ننگی کھڑی ہے اور اسے پرواہ تک نہیں ---- کچھ بھی پوشیدہ نہیں ---- اس کی پتھریلی بدتمیزی' اس کی ظالمانہ وحشت اور انسان کی کوششوں سے مکمل لاپروائی ایسی چیزیں ہیں کہ انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ جگہ کسی اور دنیا میں واقع ہے ----"

اور یہ درست ہے ---- آپ نانگا پربت کو لاپروائی یا پیار سے نہیں دیکھتے بلکہ



ذرا خوفزدہ ہو کر' احتیاط سے اور مرعوبیت سے دیکھتے ہیں کہ اس پر ایک نظر آپ کو حقیر بنا کر رکھ دیتی ہے..... یہ آپ سے پرے اپنی الگ دنیا میں ہے اور آپ اس دنیا میں داخل نہیں ہو سکتے..... مجھے آج اس دنیا کے کنارے تک جانا تھا یعنی بیس کیمپ تک..... دھوپ دیکھتے دیکھتے برف پر کھسکتی ہوئے آگے ہو رہی تھی..... ایک چھوٹا سا بادل کہیں سے نمودار ہو کر نانگا پربت کی چوٹی کے گرد لپٹنے کی کوشش میں تھا۔

میرے سامنے نانگا پربت کی چوٹی تھی اور یہ آٹھ ہزار ایک سو چھبیس میٹر بلند تھی..... اس کے دائیں جانب ذرا نیچے گنالو کی چوٹی تھی جس کی بلندی سات ہزار میٹر کے قریب ہے۔ نانگا پربت کے بائیں جانب تین خوبصورت چوٹیاں یکے بعد دیگرے نظر آتی ہیں یعنی سلور پیک۔ شاید اسے چاندی کی چوٹی اس لئے کہا جاتا ہو کہ دھوپ ادھر سے آتی ہے اور اس کی برفوں کو چاندی کی طرح چمکاتی ہے۔ سلور کوٹ کے بعد رائے کوٹ پیک ہے اور پھر چنگورہ پیک ہے۔

دریا ایک مرتبہ پھر رک گیا تھا۔

نانگا پربت کی بالائی جگہیں مکمل دھوپ میں آ چکی تھیں لیکن رائے کوٹ گلیشیئر' بزل پاس' فیئری میڈو اور جنگل سب کے سب ابھی گہرے سائے میں تھے۔

"کیا یہ تم ہو مسٹ آنسر ----" یہ تھامس کی آواز تھی۔ شاید میں کھانسا تھا۔

"ہاں ----"

تھامس کے خیمے کے قریب گاڈفرے سویا ہوا تھا۔ اس نے کروٹ بدلی اور وہ سویا ہوا نہیں تھا۔ "یہ بالکل مسٹ آنسر ہے تھامس اور یہ پچھلے آدھ گھنٹے سے یہاں بدھ بھکشوؤں کی طرح بیٹھا نانگا پربت کو دیکھ رہا ہے۔ اور میں اسے دیکھ رہا تھا"

"ادھر آ جاؤ گاڈفرے ----" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں اپنے سلیپنگ بیگ کی گرمی اور اپنے چہرے کو نچ کرتی سردی سے لطف اندوز ہو رہا ہوں ----"

"رات کیسی گزری؟"

"بہت شاندار ----" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے داڑھی میں زور سے کھجلی کی اور سلیپنگ بیگ کو لپیٹ کر میرے پاس آ گیا۔ "مجھے یاد آیا کہ آج ہم نے بیس کیمپ تک جانا ہے۔ اور رات بہت شاندار تھی..... یورپ میں لوگ کھلی فضا میں سونے کے مزے کو بالکل نہیں جانتے..... کروڑوں لوگ ہیں جو آج تک باہر گھاس پر یا اپنے فارم کے کسی کھیت میں کھلی فضا میں نہیں سوئے..... وہ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی خطرناک بات ہے۔ میں بھی یہی سمجھتا تھا۔ پھر میں آسٹریلیا گیا تو وہاں پہلی بار اپنی

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



بھیڑوں کے فارم پر باہر سویا- اور میں تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ تو ایک بالکل نئی زندگی تھی- اور مسٹ آخر کھلی فضا میں سونے سے آپ اپنے چہرے پر موسم بدلتے ہوئے محسوس کرتے ہیں- جب ہوا آتی ہے- جب اوس پڑتی ہے- جب دھوپ چمکتی ہے- تو یہ سب کچھ تم خود محسوس کرتے ہو- کئی بار ایسا ہوا کہ اوس پڑ رہی تھی تو میں جاگ گیا اور پھر اس کی نمی کی پھوار کو محسوس کرتا مسکراتا رہا--- میں تمہارے لئے کافی بناؤں؟"

"نہیں نہیں- شکریہ"

"لیکن میں تو تمہارا آفیشل کک ہوں--- کک گاڈفرے" وہ اٹھ کر درختوں کی جانب چلا گیا....

مشاکلہ نے خیمے میں سے سر باہر نکالا "گڈ مارننگ"

"گٹن مارگن---"

"آہ تم جرمن بولتے ہو---"

"بس اتنی سی ہی--- کیا ہم روانہ ہو رہے ہیں یا نہیں---؟"

اس کا سر خیمے کے اندر ہوا- پھر باہر آیا "بس پانچ منٹ---"

پانچ منٹ میں کک گاڈفرے نے کافی تیار کر لی.... اور پانچ منٹ میں تھامس اور مشاکلہ تیار ہو کر خیمے سے باہر آ گئے- مطیع نیند میں تھا اور اس نے نیند میں ہی اعلان کیا تھا کہ "سکیوں ٹھنڈ لگ وسی" اس یادگار صبح کی ایک تصویر میرے سامنے ہے جو گاڈفرے نے اتاری تھی.... ہم تینوں اتنے گہرے سائے میں ہیں کہ بمشکل نظر آتے ہیں پہاڑی سے اتر رہے ہیں' مشاکلہ نے ایک چھوٹا سا رک سیک اٹھا رکھا ہے جس پر اس کے سنہری بالوں کے چوٹی آرام کر رہی ہے اور وہ ہائکنگ سٹک کے سہارے اتر رہی ہے- تھامس کے پاس پانی کی بوتل ہے اور اس کی عینک کے شیشے گہرے سائے میں بھی چمکتے ہیں اور ان کے آگے میں ہوں' قدرے جھکا ہوا ہائکنگ سٹک تھامے- شلوار قمیض اور ایک ہلکے سویٹر اور سفید پی کیپ میں--- لیکن اس تصویر میں یہ کردار اہم نہیں اس کا اصل جلال سائے سے نیچے رائے کوٹ گلیشیئر کے سرمئی دریا اور پھر مکمل طور پر دھوپ سے روشن نانگا پربت میں ہے.... یوں لگتا ہے ان برفوں میں دوپہر ہو چکی ہے-

ہم چاروں اپنی چھڑیوں پر بوجھ ڈالتے نیچے فیری میڈو میں آ گئے.... یہاں ابھی تک تنہائی تھی.... اور خالی ہونے کی بنا پر اب یہ خاصا بڑا لگ رہا تھا.... اور اس صبح میں نے جانا کہ فیری میڈو کیا ہے--- نانگا پربت سیاہ جنگل کے اوپر ایک سفید جہاں



کی طرح امڈی ہوئی تھی اور چراگاہ کے درمیان بہنے والے پانی صبح کی روشنی میں ایسے تھے جیسے پارے کی ندی ہو.... دائیں جانب کے پہاڑوں سے برف کی منجمد ندیاں نیچے تک آ رہی تھیں....

ہم جنگل میں داخل ہو گئے.... بلکہ جنگل ہمارے اندر آیا اور رس بس گیا کیونکہ اگلے ایک گھنٹے کے لئے ہم اس کا ایک حصہ تھے.... چیڑ کے بلند درختوں کے نیچے چیڑ کے خشک بال ڈھیروں کی صورت میں پڑے تھے- تنوں کے گرد باریک پتوں کی بیلیں سبز سانپوں کی طرح لپٹی ہوئی تھیں اور یہ درخت بے حد قدیم تھے.... مشاکلہ چلتے چلتے جھکی--- "تھامس---" تھامس اس کی قریب ہوا "تھامس جنگل کے فرش پر بچھے ہوئے یہ پودے دیکھو--- کیا زرد مرکز اور سفید پتیوں والا یہ پھول سٹرابری کا نہیں ہے؟"

تھامس نے جھک کر ان لاتعداد پھولوں کو دیکھا جو فرش کے ساتھ بچھے ہوئے تھے.... "تم درست کہتی ہو یہ سٹرابری کے پودے ہیں--- لیکن اتنے زیادہ--- پورا جنگل بھرا پڑا ہے...."

میں نے سٹرابری کے پودے کو بڑھتے اور پھول کے بعد پھل بنتے دیکھا تھا اور میں جانتا تھا کہ اگلے پانچ چھ ہفتوں کے اندر اندر اس پورے جنگل میں سرخ سٹرابری بچھی ہو گی....

جنگل میں ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی اور اس کے پانیوں کے اندر بھی سبزہ تھا کہ اس کی گہرائی کہیں بھی ایک دو فٹ سے زیادہ نہ تھی.... اور اس کے پانیوں میں چیڑ اور برچ کے سفید درخت جانے کن صدیوں سے گرتے تھے اور کھوکھلے ہو کر دھیرے دھیرے ختم ہو جاتے تھے.... یہ اس کے سفید اور سبز پانیوں میں آڑے ترچھے اور بے بس ہو کر سفید اور سیاہ ڈھانچوں کی طرح پڑے تھے- ان ڈھانچوں کو با آسانی اٹھایا جا سکتا تھا کہ یہ مسلسل بارش اور برف باری سے کھوکھلے ہو چکے تھے.... ان گرے ہوئے درختوں میں سے نئے درخت اور پودے پھوٹ رہے تھے ...... یہ جنگل مختلف تھا--- اس لئے کہ جب سے یہ وجود میں آیا تھا تب سے یہاں کوئی لکڑہارا داخل نہیں ہوا تھا.... یہاں قدرت کا ایک نظام اپنے حساب سے جاری و ساری تھا.... درخت اگتے تھے' اپنی طبعی عمر کو پہنچتے تھے اور پھر یا تو کسی طوفان یا تیز ہوا کے باعث گر جاتے تھے اور یا پھر وہیں کھڑے کھڑے سوکھ جاتے تھے اور ذرا سی ہوا سے بھی چرچراتے تھے اور ہم جیسے مسافروں کو ڈراتے تھے کہ ہم گر سکتے ہیں.... اور ہمارے

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



سامنے ایسا ہوا... چنانچہ ہم ذرا خوف میں بھی چلتے تھے۔ یہاں ہم زمین پر نہیں چلتے تھے' کیونکہ یہاں زمین تھی نہیں ——— ہزاروں برسوں سے جو پتے' ٹہنیاں اور تنے گرتے تھے وہ ایک مسامدار نیم سیاہ برادے کی صورت میں تہہ در تہہ جمتے چلے جاتے تھے... اس برادے میں پانی آسانی سے جذب ہوتا تھا اور اس میں سے گھاس اور پھول نکلتے تھے... یہ فوم کی طرح نرم تھا اور اس پر چلنے سے پاؤں کو آرام ملتا تھا۔ میں نے کبھی ایسا منظر نہیں دیکھا تھا۔ سورج کی روشنی ادھریوں بھی کم آتی تھی اور ابھی تو یہ جنگل سائے میں تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ ادھر سے کوہ پیما گزرتے رہتے ہیں اور یہ چراگاہ کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ایسا لگتا تھا کہ ہم پہلے انسان ہیں جو اس کی ہزاروں برس کی تنہائی میں مخل ہوئے ہیں... یہ قدرت کا ایک معبد تھا اور ہم اس میں جوتوں سمیت چلے آئے تھے... جیسے یہ نانگا پربت سے اترنے والی روایتی پریوں کا باغ تھا... برف کی پریاں مینڈک اور سفید اژدھے اس کے مکین تھے... جہاں جہاں پانی چلتا تھا وہاں کناروں کے ساتھ چیڑ کے جو چھوٹے درخت تھے ان پر بانسائی درختوں کا گمان ہوتا تھا یعنی چھوٹے چھوٹے لیکن جزئیات میں مکمل... جیسے کسی جادوگر نے انہیں چھوٹا بنا دیا تھا... ہمارا راستہ جنگل میں سے نکل کر اس بلندی پر آ گیا جہاں رائے کوٹ گلیشیئر گہرائی میں تھا اور ابھی سائے میں تھا۔ البتہ اس پر عمودی کھڑی چٹانوں میں سے گھاس اور سرخ پھولوں کی لڑیاں لٹکتی تھیں اور ان لڑیوں اور نیچے برف کے درمیان سینکڑوں میٹر کا فاصلہ تھا... دھوپ اس چٹان پر اترنے کو تھی۔

یہاں سے ایک راستہ' بلکہ چھوٹی سی پگڈنڈی اترتی تھی۔ ہم بے حد احتیاط سے اس پر اترنے لگے... اور یہیں سے بیال کیمپ کا علاقہ شروع ہوتا تھا۔ اس کے درمیان میں بھی ایک ندی چلتی تھی لیکن یہ ایک باقاعدہ ندی تھی اور اس میں تیزی بھی تھی اور گہرائی بھی۔ لیکن یہ نظر کم آتی تھی کیونکہ ہم اپنے ہی قد کے چھوٹے چھوٹے چیڑ کی درختوں میں چلتے تھے۔ موٹے موٹے مور پنکھ کے درختوں کے بیچوں بیچ چلتے تھے اور اگرچہ ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلتے تھے لیکن ایک دوسرے کو نظر نہیں آتے تھے اور ہر شخص اپنے آپ کے ساتھ تنہا تھا۔ یہ علاقہ ایک جاپانی باغ کی طرح تھا... اس میں درخت پودے اور جھاڑیاں ایسی تھیں جیسے باقاعدہ منصوبہ بندی سے لگائی گئی ہوں... اور یہ سب چیزیں مختصر تھیں۔ بیال کیمپ کا یہ حصہ خوبصورتی کی ہیٹ ٹرک تھا... پہلے کستوری۔ پھر قدیم جنگل اور اب یہ جاپانی باغ۔



ہم سانس لینے کے لئے رکے اور ندی سے پانی پینے کی کوشش کی... لیکن پانی کو لبوں تک لانے سے پیشتر ہی ہتھیلی سن ہو جاتی اور ہم پیاسے رہ جاتے... اور ہاں کئی بار مور پنکھ کے گھنے درخت یوں لگتے جیسے موٹے موٹے سبز ریچھ دونوں ٹانگوں پر بیٹھے ہمیں دیکھ رہے ہیں اور ہم ٹھٹک جاتے... اور یہاں پرندے بہت کم دکھائی دیتے... شنید تھا کہ مارخور کے علاوہ ان خطوں میں رام چکور اور مرغ زریں پایا جاتا ہے... مارخور تو ظاہر ہے' ادھر بزنل پاس کے آس پاس ہوتا ہو گا اور ادھر اگر مرغ زریں تھا تو فی الحال کسی کنج میں پوشیدہ' خوابیدہ تھا اسے احساس نہ تھا کہ صبح ہو چکی ہے اور چند مسافر ادھر سے گزرتے ہیں۔

بیال کیمپ کے جاپانی باغ کے بعد درخت ذرا کم ہو گئے اور ایک سرسبز ڈھلوان اور بیال کیمپ کے ویران گاؤں کے اوپر ایک بار پھر نانگا پربت کسی منہ زور سیلاب کی طرح یکدم رکی ہوئی نظر آئی... جیسے یہ اب ہمارے اوپر آ گرے گی... بیال کیمپ بھی تاتو اور مطانتھ کے باشندوں کا سمر کیمپ ہے... وہ یہاں اپنے مویشی چرانے آتے ہیں اور پھر سردیوں میں واپس چلے جاتے ہیں... ہم گاؤں کے جھونپڑوں کے پاس سے گزرے تو وہاں بالکل ویرانی تھی... پھر ایک بچہ دوڑتا ہوا ہمارے پاس آیا اور اپنی بند مٹھی ہماری آنکھوں کے پاس لا کر کھول دی... اس میں پتھر کے چند ٹکڑے تھے۔ وہ اپنی زبان میں کچھ کہتا تھا جو ہماری سمجھ سے باہر تھا... ہم سب نے اس کے ساتھ زبردستی ہاتھ ملایا تو وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ گیا... بیال کیمپ سے آگے تھوڑی چڑھائی تھی اور یہاں دو چرواہے جو ہمیں دور سے دیکھتے تھے میرے بلانے پر قریب آ گئے۔ ان کے ساتھ ساتھ ان کی کل بکریاں بھی ہمارے قریب آ گئیں... مشاکلہ نے "ہاؤ سویٹ" کہہ کر ان کو باری باری پیار کرنا شروع کر دیا... بلکہ ایک بکری جو یقیناً بکرا تھا مشاکلہ کی زانوں پر منہ رکھ کر تقریباً مست ہو گیا... اس پر سب نے تھامس کو ذرا چھیڑا کہ بڑے میاں یہ بکرے آپ کے رقیب ہو گئے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ جب بھی تھامس مشاکلہ کے قریب جاتا تو وہ بکرا اسے ٹکر مارنے کے لئے پوزیشن لے لیتا...

یہ بیال کیمپ کا آخر تھا... اور سبزے اور خوبصورتی کا بھی... کیونکہ آگے نانگا پربت تھی... سیاہ اور خطرناک چٹانیں... بھربھرے پہاڑ اور گلیشیئر...

میں نے نوجوان چرواہے سے بیس کیمپ جانے والے راستے کے بارے میں دریافت کیا... وہ ہمیں اس مقام پر لے گیا جہاں ایک بہت بڑی چٹان تھی' جہاں سے

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



دہشت کا آغاز ہوتا تھا... نیچے ہمارے قدموں میں رائے کوٹ گلیشیئر کے سرمئی اہرام تھے... اہرام اس لئے کہ مسلسل پھیلاؤ اور سکڑنے کے باعث اس کی برفوں کی شکل ٹکڑوں میں بٹ چکی تھی اور یہ سینکڑوں بھاری برفیلی ٹکڑیں آہستہ آہستہ حرکت کرتی تھیں اور ان میں سے آواز آتی تھی۔ یہاں زندگی میں میں نے پہلی بار گلیشیئر کی آواز سنی... ایک کڑکڑاہٹ... جیسے کچھ ٹوٹ رہا ہو اور یہ آواز دل کو خوف سے بھرتی تھی... تو ہمارے قدموں میں تقریباً آدھ کلومیٹر نیچے سرد سرمئی اہراموں کا ایک منجمد دریا تھا جو کڑکڑاتا تھا اور شاید اپنی جگہ بدلتا تھا اور جہاں یہ ختم ہوتا تھا وہاں سے نانگا پربت کے سفید گلیشیئر شروع ہو جاتے تھے... اور نانگا پربت پر دھوپ کم ہونے لگی تھی اور ایک گہری دھند نیچے آ رہی تھی... صرف میں نہیں سب لوگ اس منظر کو دیکھ کر خاصے دہشت زدہ ہو گئے... ہمیں تو آگے جانے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن چرواہے نے ایک کچی لکیر کی طرف اشارہ کیا جو ہمارے نیچے رائے کوٹ گلیشیئر سے تقریباً دو سو میٹر کی بلندی پر اس بھربھری پہاڑی میں نظر آ رہی تھی جو گلیشیئر کے ساتھ ایک سو بیس ڈگری کا زاویہ بنا رہی تھی۔

"ہا..." گاڈفرے نے سر ہلایا "یہ راستہ میرے لئے نہیں ہے"

"کیا تم ڈر گئے ہو؟" میں نے ایک مردہ مسکراہٹ سے بہادر بننے کی کوشش کی۔

"ہاں" گاڈفرے نے صرف اتنا کہا۔

نوجوان چرواہے کو ہم نے اشارہ کیا کہ وہ چلا جائے کیونکہ ہم اس کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتے تھے...

"یہ راستہ میرے لئے بھی نہیں ہے..." خاصی دیر بعد مشائلہ بولی۔

"کیا تم بھی ڈر گئی ہو؟" میری آواز بیٹھنے لگی۔

"ہاں، میں اس کچے راستے میں گر کر گلیشیئر میں غائب ہونا پسند نہیں کروں گی..."

"واپس چلیں" میں نے فوراً کہا...

تھامس نے عینک اتار کر اس کے شیشے صاف کئے اور پھر اپنی ٹھوڑی پکڑ کر بولا "یہ راستہ اتنا خطرناک نہیں جتنا کہ دکھائی دیتا ہے... سب لوگ ادھر سے ہی آتے ہیں اور اتنی دور آ کر بیس کیمپ تک نہ جانا، عمر بھر کا پچھتاوا ہو گا..."

"ہاں یہ بھی ہے..." مشائلہ دانت بھینچ کر کہنے لگی "تم چلو گے؟"



"کون میں؟" میں نے بدک کر کہا... "ہاں کیوں نہیں..." اور یہ میں نے سوچے سمجھے بغیر کہا تھا۔

"تو پھر فیری میڈو میں آج شام ملاقات ہو گی... میں نے جتنی نانگا پربت دیکھنا تھی دیکھ لی... میرے لئے یہی کافی ہے..." گاڈفرے نے ہم تینوں سے ہاتھ ملایا اور سیٹی بجاتا ہوا ان چرواہوں کے پاس چلا گیا جو دور کھڑے ہمارا تماشا دیکھ رہے تھے۔

"آؤ..." تھامس نے کہا۔

ہم اس پہاڑی سے ذرا نیچے گئے اور پھر کچی پگڈنڈی پر آگے پیچھے چلنے لگے... اور یہ راستہ اتنا ہی خطرناک تھا جتنا کہ یہ اوپر سے دکھائی دیتا تھا۔ ہمارے اور رائے کوٹ گلیشیئر کے درمیان کچھ نہ تھا... پاؤں تلے جتنے کنکر آئے اور لڑھکے وہ دو سو میٹر کی ڈھلوان پر بلا روک ٹوک رفتار پکڑتے نیچے گلیشیئر کی گہرائی میں گم ہوئے... راستے میں روکنے کے لئے نہ کوئی جھاڑی تھی نہ کوئی پتھر... صرف بھربھرے سنگریزے تھے... میں نے صرف ایک بار رک کر نانگا پربت کو اپنے اوپر امڈتے دیکھا وہاں دھند اتر رہی تھی لیکن یہاں ابھی دھوپ تھی اور یہ ایک نہایت شاندار اور عظیم الشان منظر ہوتا اگر میں اسے اپنے گھر میں کافی پیتے ہوئے ٹیلی ویژن پر دیکھتا... لیکن یہ میرے سامنے تھا اور میں ایک بھربھری پہاڑی پر معلق تھا اور نیچے رائے کوٹ گلیشیئر مسلسل چٹختا تھا۔ بولتا تھا جیسے بلاتا ہو... اور اس کے نیچے جو پوشیدہ دریا تھا اس کا شور بھی ہم تک پہنچتا تھا اور اس وقت ہم نانگا پربت کے دامن کی وسعت میں اکیلے تھے اور نہ کوئی ہمیں دیکھتا تھا اور نہ ہم کسی کو دیکھتے تھے... تو دائیں ہاتھ پر رائے کوٹ گلیشیئر کا نوکیلا شہر نیچے تھا اور بائیں ہاتھ پر بھری بھری سنگریزوں والی پہاڑی آسمان کو جاتی تھی اور اس کی ڈھلوان پر کہیں کہیں صرف گھاس سرسراتی تھی...

اوپر ہمارے سروں کے عین اوپر نانگا پربت پر ایک مدھم سی گڑگڑاہٹ ہوئی... اور یہ کوئی برفانی تودہ نہ تھا بلکہ گہرے بادل تھے جو گھنے ہو رہے تھے...

ہم تینوں صرف کچے راستے کو دیکھتے تھے اور ہماری احتیاط ہمارے قدموں میں تھی... یہاں احساس ہوا کہ ایسے علاقے کے لئے جاگر شوز نہایت بے کار ہوتے ہیں اور خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ بھربھری جگہوں اور سنگریزوں پر نہیں ٹھہرتے... یہاں کے لئے ہائیکنگ بوٹ ازحد ضروری ہیں... عجیب بات تھی کہ پسینہ صرف میرے پاؤں میں تھا چہرے پر نہ تھا... بادل زیادہ گرجنے لگے اور ان کی آواز

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



گلیشیئر کے چٹخنے کی ساتھ مل کر زیادہ ڈراؤنی لگتی تھی......... اس لمحے میرے اندر اس عظیم الشان پہاڑ سے لطف اندوز ہونے کا احساس ختم ہو گیا اور میں اس سے خوفزدہ ہونے لگا.... میری خواہش تھی کہ میں واپس چلا جاؤں.... لیکن اس چھوٹے سے راستے سے مڑنا بھی دشوار تھا....

بیس کیمپ اب دور نہیں تھا۔ چوٹی کے عین نیچے جہاں گلیشیئر ختم ہو رہا تھا اس کے دامن میں.... زیادہ سے زیادہ ایک کلومیٹر دور....

رائے کوٹ گلیشیئر یکدم بل کھا کر مڑا.... ہمارا راستہ نیچے ہوا اور تھوڑی دیر میں ہم اس کے کنارے پر چلنے لگے اور یہاں کوئی خطرہ نہ تھا.... یہیں پر وہ نالہ ہمارے سامنے آیا جسے ہم نے واپسی پر دو بجے سے پیشتر عبور کرنا تھا۔ ابھی اس میں پانی خاصا کم تھا۔ ہم پتھروں کو پھلانگتے پار چلے گئے۔

"ویسے یہ نالہ تھوڑی دیر میں ناقابل عبور ہو سکتا ہے کیونکہ بہاؤ میں تیزی آ رہی ہے---" تھامس کہنے لگا.... لیکن اب ہم ایک اطمینان کی کیفیت میں چلتے تھے اور ہمارے، دل میں صرف ایک ڈر تھا کہ واپسی پر ہمیں اسی کچے راستے پر چلنا ہو گا۔

اور پھر جیسے پلک جھپکتے ہی موسم بدل گیا--- ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی--- ہمارے اوپر چوٹی دھند اور سیاہ بادلوں میں گھری ہوئی تھی اور یہ گہری دھند ذرا نیچے ہونے لگی اور پھر بوندا باندی شروع ہو گئی۔ اور یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ یہ بوندیں تقریباً برف ہی تھیں.... اور مجھے اپنی ایک اور حماقت کا بھی احساس ہوا کہ میں صرف ایک باریک سویٹر نما جرسی ساتھ لایا تھا اور میرے پاس بھاری جیکٹ ہونی چاہئے تھی.... تھامس اور مشائلہ پورا بندوبست کر کے نکلے تھے چنانچہ انہوں نے رک کر بیگ میں سے جیکٹس نکال کر پہنیں اور ان پر بارش سے بچانے کے لئے برساتیاں اوڑھ لیں.... اور میں شلوار قمیض ...... میں چلا جا رہا ہوں خدا کے سہارے.......

اور پھر گلیشیئر ہمارے راستے میں آ گیا.... ہم تینوں رک گئے.... یہ تقریباً سو میٹر چوڑا تھا اور ہمیں اسے عبور کر کے دوسری طرف جانا تھا جہاں بیس کیمپ تھا.... چند پتھر ان مقامات کی نشاندہی کر رہے تھے جہاں سے گلیشیئر قابل عبور تھا.... ہم رکے رہے کیونکہ گلیشیئر کے ساتھ خرمستیاں نہیں کی جا سکتیں.... اس میں دراڑیں ہوتی ہیں جن میں پھسل کر آپ ایک عظیم اور اندھیرے آئس بکس میں جا گرتے ہیں اور پانچ منٹ کے اندر اندر گلیشیئر کا حصہ بن جاتے ہیں اور جہاں سے گلیشیئر نرم ہو جائے وہ ایک طرح کی برفانی دلدل ہوتی ہے اور ہم تو پہلے سے خاصے دہشت زدہ ہو



چکے تھے اور اوپر سے بادل نانگا پربت سے نیچے آ رہے تھے۔

"کیا خیال ہے!" میں نے چھڑی سے گلیشیئر کی نرم برف کو محسوس کرتے ہوئے تھامس سے پوچھا اور اس لمحے نانگا پربت سے ایک تیز ہوا میرے چہرے تک آئی تھی اور اسے یخ کرتی تھی.... بوندا باندی کم ہو چکی تھی۔

"گلیشیئر عبور کرنے کا میرا کوئی تجربہ نہیں---" وہ فکرمندی سے بولا۔

"جہاں جہاں برف پر پتھر پڑے ہیں وہ راستہ ہو گا--- یہاں کے لوگوں نے رکھے ہوں گے---"

"یہاں رہتا کون ہے--- نہیں میں تو رسک نہیں لے سکتا"۔ تھامس نے فیصلہ دے دیا....

"ہم بیس کیمپ نہیں دیکھ سکیں گے---" مشائلہ روہانسی ہو گئی۔

"یہ ضروری تو نہیں کہ بیس کیمپ کو ہاتھ لگا کر دیکھا جائے.... یہ سامنے ہی تو ہے.... واپس چلیں؟" تھامس نے مجھ سے پوچھا اور اس سے پیشتر میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ کچھ ہو جائے میں اس مخدوش گلیشیئر پر قدم نہیں رکھوں گا اور اگر تھامس اینڈ مشائلہ جاتے ہیں تو جائیں میں ان کا یہیں بیٹھ کر انتظار کروں گا--- چنانچہ میں نے بظاہر لاپروائی سے کہا "ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی.... ویسے میرے خیال میں اس گلیشیئر کو آسانی سے عبور کیا جا سکتا ہے---"

"ٹھیک ہے---" تھامس ایک پتھر پر بیٹھ گیا "تم ہو آؤ ہم یہاں انتظار کرتے ہیں---" اور وہ ہنس رہا تھا اور وہ جانتا تھا کہ میں کتنا خوفزدہ ہو چکا ہوں--- تب میں نے بھی ہنسنا شروع کر دیا اور مشائلہ بھی نہ رہ سکی اور ہماری اس ہنسی میں شامل ہو گئی جو ہماری نانگا پربت سے قریب ترین ہنسی تھی.... اوپر موسم زیادہ خراب ہو رہا تھا اور ہمیں واپس جانا تھا.... بادل اور دھند اس گلیشیئر تک آ چکے تھے جسے ہم چوم کے چھوڑ رہے تھے....

"اور ہاں---" تھامس ہنستا ہوا رک گیا۔ "کم از کم میں اس کچے راستے سے واپس نہیں جاؤں گا۔ وہ کچھ زیادہ ہی خطرناک ہے---"

"اس کے علاوہ اور کون سا راستہ ہے؟" میں نے اس کی جانب دیکھا اور وہ اوپر پہاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا....

"ہم اگر کسی طرح اس پہاڑی پر چڑھ جائیں تو دوسری جانب یقیناً بیال کیمپ ہو گا.... ہم ادھر اتر جائیں گے---"

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



"لیکن اس پر کوئی راستہ نہیں ہے اور راستے کے بغیر پہاڑوں میں شارٹ کٹ کرنا دانشمندی نہیں ہے۔۔۔"

"یہ دانشمندی نہیں ہے اور جس راستے پر سے ہم آئے ہیں اسی پر سے واپس جانا انتہائی بے وقوفی ہے۔۔۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا لیکن میں نیچے چٹختے ہوئے گلیشیئر سے اتنا خوفزدہ تھا کہ میں بول نہیں سکتا تھا اور میری ٹانگوں میں سکت نہیں تھی۔۔۔ میں اس راستے سے واپس نہیں جاؤں گا"۔

"یہ پہاڑی بھی تو خاصی سٹیپ دکھائی دیتی ہے اور سیدھی چلی جا رہی ہے بغیر کسی جھاڑی یا پتھر کی رکاوٹ کے۔۔۔"

میں بھی اس راستے سے نہیں لوٹنا چاہتا تھا لیکن اس پہاڑی کے تیور بھی مجھے اچھے نظر نہیں آ رہے تھے۔۔۔

"تھامس مجھے بھوک لگی ہے۔۔۔ ہم پہلے لنچ کیوں نہ کر لیں؟" مشائلہ نے کہا۔۔۔

"یہ تمہارا آخری لنچ ہو گا۔۔۔" تھامس نے سر ہلایا "یہاں نہیں۔۔۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔۔۔"

اور واقعی یہ ایک عجیب' اس دنیا سے باہر کی جگہ تھی۔۔۔ یہاں کوئی نہ تھا سوائے پہاڑوں کی آخری عظمت اور خوف کے۔۔۔ بادل کی گرج اگرچہ کہیں سے آتی تھی لیکن مسلسل تھی اور تاریکی بڑھ رہی تھی اور ابھی صرف ڈیڑھ بجا تھا۔۔۔ مشائلہ اپنے سویٹر سے کمر بستہ ہوئی اور ہائیکنگ سٹک سے پہاڑی کو تھپک تھپک کر یکدم اوپر چڑھنے لگی۔۔۔ وہ جہاں جہاں قدم رکھتی تھی وہاں سے سنگریزے حرکت کرتے ہوئے نیچے آنے لگتے لیکن وہ بہت تیزی سے اوپر گئی۔۔۔ تقریباً بیس فٹ اوپر جا کر اس نے آس پاس کی صورت حال کا جائزہ لیا اور کہنے لگی "آگے زیادہ مشکل نہیں ہے۔۔۔ آ جاؤ"۔

پہلے تھامس گیا اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ مشکل سے گیا۔۔۔ اور ہاں اس مقام پر بھی رائے کوٹ گلیشیئر نیچے سے چیخ رہا تھا اور اوپر سے جتنے چھوٹے چھوٹے پتھر اپنی جگہ چھوڑ رہے تھے وہ سیدھے گلیشیئر میں ہی جا رہے تھے چنانچہ اگر آپ لڑھکتے ہیں تو ان پتھروں کے نقش قدم پر لڑھکتے گلیشیئر کو جاتے ہیں بہرحال اب کوئی چارہ نہ تھا۔۔۔ میں نے ہمت کی اور مشائلہ کی ہدایات کے مطابق اور وہ بھی جہاں کھڑی تھی مشکل سے کھڑی تھی اور مسلسل ہدایات دیئے جا رہی تھی اور میں ان پر عمل کرتا تیزی سے



اوپر چڑھنے لگا۔ لیکن مجھے میرے پہلے قدم نے بتا دیا کہ بھائی جان آپ نے حماقت کی ہے۔۔۔ اس پہاڑی پر صرف گھاس اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھیں اور بھربھرے سنگریزے تھے چنانچہ قدم تو کہیں نہ جمتا تھا۔ یوں بھی ڈھلوان کی وجہ سے قدم ٹیڑھا پڑتا تھا اور پورے جسم کا زاویہ معلق سی حالت میں بنتا تھا۔ یہ بہت مشکل کوہ پیمائی تھی اور میں اس کے لئے ذہنی طور پر کم اور جسمانی طور پر زیادہ ناموزوں تھا۔۔۔ تھامس اور مشائلہ مجھ سے کم عمر تھے اور ان کے بدن ریس کے گھوڑے کی طرح کے ہوئے تھے۔۔۔ بہرحال میں نے ایک دانشمندی کی کہ کہیں رکا نہیں اور گرتا پڑتا اس مقام پر پہنچ گیا جو نیچے سے تقریباً بیس فٹ کی بلندی پر تھا۔۔۔ مشائلہ فوراً آگے چل دی۔۔۔ اور تھامس بھی۔۔۔ انہوں نے خاصی بلندی پر جا کر کہا کہ بس آگے تو میدان ہے۔ ہمت کرو اور آ جاؤ۔۔۔

"میں واپس جاؤں گا۔۔۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور میں جانتا تھا کہ میں واپس نہیں جا سکتا۔

"نہیں۔۔۔ اب بہت بہتر ہے" مشائلہ اپنی سٹک سے دوسری جانب اشارہ کر رہی تھی اور ایسے اشارہ کر رہی تھی جیسے دوسری جانب پنجاب کے میدان ہیں "اب بہت بہتر ہے۔۔۔ آ جاؤ"۔

اور بہتر یہ تھا کہ اب سنگریزوں کی بجائے گول گول پتھر تھے جن پر پاؤں رکھتا تو وہ رولر سکیٹس کی طرح چلنے لگتے اور سیدھے کھائی میں جا کر خوفناک آوازیں نکالنے لگتے۔۔۔ ایک بار دونوں پاؤں پر کھڑا تھا اور نیچے سے پتھر کھسک رہے تھے اور میں تقریباً چار فٹ اسی حالت میں نیچے گیا لیکن لڑھکنے سے بچ گیا۔ ہم تینوں اب ایک دوسرے پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ جیسے رسوں سے بندھے ہوں۔۔۔ ایک کا پاؤں پھسلتا تو دوسرا سنبھلنے کی کوشش کرتا۔۔۔ ہمیں کچھ پتا نہ تھا کہ آس پاس کیا ہے اور ہم کہاں ہیں۔ ہم صرف یہ جانتے تھے کہ ہم ایک مشکل میں ہیں اور دھوپ جا چکی ہے اور سرد نوکیلی ہوا نانگا پربت سے سیدھی آ رہی ہے اور ہم اس کے راستے میں ہیں اور وہ ہمیں ہٹا دینا چاہتی ہے۔۔۔ اور ہم ہٹ نہیں سکتے کہ ہٹ کر جائیں کہاں۔۔۔

پہاڑی میں ایک نالے کی خشک گزرگاہ سامنے آ گئی۔۔۔ ریت اور چھوٹے چھوٹے پتھر اور اس کا زاویہ ایک سو پچیس کے لگ بھگ تھا۔۔۔ اور ظاہر ہے کہ پہاڑی کی نسبت گزرگاہ تو ذرا زیادہ شتابی سے دھڑام سے نیچے جا رہی تھی۔۔۔ اس کی چوڑائی چھ سات فٹ سے زیادہ نہ تھی۔۔۔ پہلے تھامس گیا اور پتہ نہیں کس طرح گیا اور پھر

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



مشائلہ... وہ قدرے جھجکی لیکن دوسری جانب چلی گئی۔

"اگر تم تیزی سے رکے بغیر جلدی سے آ جاؤ تو کوئی مسئلہ نہیں۔۔۔" تھامس بولا۔

"مجھ سے نہیں ہو گا۔۔۔" اور مجھے یقین تھا کہ میں پھسل جاؤں گا... وہاں پاؤں رکھنے کو تو جگہ نہ تھی۔۔۔ "میں واپس جاؤں گا" حالانکہ کہاں جا سکتا تھا۔

"اب ہم خاصی بلندی پر ہیں۔۔۔" تھامس کے لہجے میں تاسف تھا' معذرت تھی "تم نیچے نہیں جا سکتے۔ آئی ایم سوری یہ میرا قصور ہے... وہ کچا راستہ اس کی نسبت بہت بہتر تھا..."

میں نے کافی عرصہ کے بعد نیچے دیکھنے کی کوشش کی اور وہ ٹھیک کہتا تھا' نیچے اترنا ناممکن تھا... برساتی نالے کی اس خشک ترچھی اور نیچے گہرائیوں میں گم ہوتی گزرگاہ کو میں نے جیسے عبور کیا ہے وہ میں نہیں جانتا... یہ اندھیرے میں ایک چھلانگ تھی... میں کچھ دیر ایک معلق حالت میں شاید ہوا میں سے گزرتا ہوا دوسری جانب تھا... اور میرا سانس بے ربط تھا۔ یہاں فیئری میڈو کی نسبت بلندی بھی زیادہ تھی بلکہ ہم اپنے سفر کے بلند ترین مقام پر پہنچ چکے تھے' تقریباً بارہ ہزار پانچ سو فٹ کی بلندی پر... اور کوشش کر رہے تھے کہ آہستہ آہستہ نیچے آئیں۔ لڑکھڑاتے ہوئے نہ آئیں... ایک اور مشکل یہ تھی کہ آرام کرنے کے لئے یا سانس درست کرنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی... ڈھلوان اتنی تھی کہ آپ پہاڑ پر منہ رکھ کر ہاتھ پھیلا کر تھوڑی دیر اس حالت میں اگر رہ سکتے تھے تو بس یہی آرام تھا... اور میں اس حالت میں پھولے ہوئے سانس کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔ تب دھند مزید تاریک ہو گئی اور پھر بوندا باندی شروع ہوئی... اور تھوڑی دیر میں یہ بوندیں اولوں کی شکل اختیار کر گئیں... سردی کی شدت میں یکدم اضافہ ہو گیا اور میں کانپنے لگا...

"یہاں سے نکلنا چاہئے مسٹ آنسر۔۔۔" مشائلہ نے آواز دی اور وہ ذرا آگے تھی "اگر شام ہو گئی تو ہم منجمد ہو جائیں گے"۔

میں پھر چلنے لگا۔۔۔ لیکن اب ذرا بہتر طریقے سے کیونکہ اب میں نے اپنی چھڑی پھینک دی تھی اور ہاتھوں کا پورا استعمال کر رہا تھا اور اکثر خطرے میں گھرے جانور کی طرح اپنے چاروں ہاتھ پاؤں پر چلنے لگتا... اسی حالت میں میں نے ایک اور نالہ عبور کیا...

دور کچھ بڑی چٹانیں نظر آ رہی تھیں اور ہمارا خیال تھا کہ ان کے دوسری



جانب بیال کیمپ ہو گا لیکن ابھی یہ چٹانیں بہت دور تھیں......

پہاڑ جیسے ہمیں صرف اپنے آپ پر سے گرانے کے لئے اور سیدھا ہو گیا اور ہم تقریباً اس سے لپٹ لپٹ کر چلنے لگے... نیچے رائے کوٹ گلیشیئر تو تھا لیکن یہاں سے نظر نہیں آتا تھا البتہ جتنے پتھر لڑھکتے ان کی گونج بتاتی کہ وہ بہت نیچے گئے ہیں اور بہت گہرے گئے ہیں۔

تب میرے سامنے ایک اور خشک گزرگاہ تھی... سامنے تو نہیں تھی بلکہ نظروں کے سامنے ترچھی ہو کر نیچے گر رہی تھی... تھامس دوسری جانب پہنچ چکا تھا۔

"یہ ذرا خطرناک ہے لیکن مشکل نہیں" وہ کہہ رہا تھا... اور ژالہ باری ہلکی برف باری میں بدل رہی تھی اور یہ برف میرے بدن پر گرتی تھی اور اسے یخ بستہ کرتی تھی...

یہ خشک گزرگاہ زیادہ سے زیادہ چھ سات فٹ چوڑی تھی لیکن اتنی سٹیپ تھی کہ اسے پار کرنے کے لئے ایک چھوٹا سا پل درکار تھا۔ اس کے درمیان میں تھامس کے بوٹوں کے نشان تھے... "تم جلدی سے ان پر قدم رکھ کے آ جاؤ۔ اتنی جلدی کہ تم گر نہ سکو..." اور جیسے مجھے اپنی موت کا یقین ہے ایسے اس لمحے جب ہر سو دھند کی تاریکی پھیل رہی تھی اور ہلکی برف باری ہو رہی تھی اور نیچے رائے کوٹ گلیشیئر ہمیں بلاتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں کبھی بھی اس پل صراط کو عبور نہیں کر سکتا۔

"۔۔۔۔ تھامس میں دوسری طرف نہیں آ سکوں گا۔۔۔ میں جانتا ہوں"۔

تھامس کا بڑھا ہوا ہاتھ نیچے ہو گیا۔۔۔ وہ مجھے سہارا بھی نہیں دے سکتا تھا کیونکہ فاصلہ زیادہ تھا... میرا بدن سردی کی شدت سے کانپتا چلا جا رہا تھا... "میں یہاں بیٹھتا ہوں تم کہیں سے مدد لے کر آؤ" میں ڈھلوان کے ساتھ ٹیک لگا کر اس طرح بیٹھا کہ ہر لمحے آگے کو جھکتا جاتا تھا...

تھامس بہت دیر تک چپ رہا۔ اس دوران مشائلہ جرمن میں نہ جانے اسے کیا کہتی رہی... میری پلکوں پر برف کے گالے گر کر پانی ہو رہے تھے اور یہ سرد پانی میرے چہرے پر سے نیچے اتر کر گردن کے اندر جاتا تھا... مجھے معلوم تھا کہ مدد کہیں سے نہیں آ سکتی۔۔۔ نزدیک ترین جگہ بیال کیمپ تھی جہاں ہم صرف دو چرواہوں سے ملے تھے اور وہ بھی شاید اب تک فیئری میڈو لوٹ گئے ہوں گے۔ اور فیئری میڈو اتنے فاصلے پر تھا کہ وہاں پہنچ کر اگر واپس آیا جاتا تو رات ہو جاتی... بلکہ خاصی رات ہو جاتی۔۔۔ اور کھلی فضا میں' برف باری میں' نانگا پربت کے دامن میں' رات

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



گزرتی نہیں بندہ گزر جاتا ہے... میں اٹھ کھڑا ہوا "میں کوشش کرتا ہوں ——"

"ونڈ بار ——" تھامس چیخا۔ "بس جہاں میرے بوٹوں کے نشان ہیں وہاں سختی سے قدم جما کر آ جاؤ' مشکل نہیں ہے۔" میں احتیاط سے آگے بڑھا... تھامس نے اپنا بازو پھیلا رکھا تھا اور اس کی ہتھیلی کھلی تھی... میری کوشش یہ تھی کہ خطرناک حصہ عبور کرنے سے پیشتر تھامس کا ہاتھ پکڑ لوں... میں کھسکتا ہوا آگے ہوا نیچے دیکھے بغیر اور بالآخر تھامس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا... "مجھے مضبوطی سے پکڑنا"۔

"تم فکر نہ کرو"۔

اسی لمحے میں نے قدم آگے بڑھایا۔ تھامس کے بوٹوں کے نشان پر رکھا اور دوسرا قدم اٹھانے سے پیشتر کچھ ہوا... یہی ہوا کہ میرے قدموں کے تلے سے زمین نکل گئی اور سنگریزے اور پتھر شور مچاتے نیچے گہرائی میں جا رہے تھے اور میں —— رائے کوٹ گلیشیئر کے اوپر کہیں لٹک رہا تھا۔

"ہاتھ مت چھوڑنا ——" تھامس میرے اوپر کہیں تھا اور کہہ رہا تھا... جب میں گرا ہوں تو میری کلائی میں اتنی شدت سے درد ہوا کہ میں نے تھامس کا ہاتھ تقریباً چھوڑ دیا تھا۔

"کیا تم نے مجھے مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے؟" یہ فقرہ میں نے ایک خلا میں کہا تھا۔ میرا دل خالی ہو چکا تھا... مجھے اب تھوڑی دیر میں رائے کوٹ گلیشیئر پر گرنا تھا... کتنی دور تک گرنا تھا یہ میں نہیں جانتا تھا اور میں صرف لٹک نہیں رہا تھا۔ تھامس کا دایاں ہاتھ میرے دائیں ہاتھ میں تھا اور میں اپنے بائیں ہاتھ اور دونوں پاؤں کو ہر جانب پُخ رہا تھا اور چلا رہا تھا... تھامس کچھ کہہ رہا تھا لیکن پتہ نہیں کیا کہہ رہا تھا۔ اور عجیب بات ہے کہ اس حالت میں جب میرے اور موت کے درمیان شاید کچھ سیکنڈ کا فاصلہ تھا... وہ فاصلہ جو مجھے نیچے گرتے ہوئے لگتا... میں زیادہ نروس نہیں تھا... شاید یقینی موت انسان کو اطمینان بھی دیتی ہے۔ میں ایک ایسے شخص کی طرح تھا جو کسی سکائی سکریپر کی کھڑکی کو پکڑے ایک ہاتھ سے لٹک رہا ہے اور تب اس لمحے میں نے اوپر دیکھا اور وہاں نانگا پربت تھی بادلوں اور دھند میں... کلر ماؤنٹین... مار ڈالنے والی چوٹی... قاتل پہاڑ... اور میں اس کی ایک کھائی کے اوپر لٹک رہا تھا... اور میں ان تمام کوہ پیماؤں کا آخری لمحوں کا حصہ دار بن گیا جن کو اس نے ہلاک کر دیا تھا... انہوں نے بھی برف کے طوفانوں میں دبتے یا کسی ایسی ہی کھائی میں گرتے اسی طرح آخری بار نانگا پربت کو اوپر دیکھا ہو گا' سیاہ اور دہشت ناک...... مجھے معلوم



ہو گیا کہ انہیں کیا محسوس ہوا ہو گا..... میں لٹک رہا تھا اور میری ناک کے عین سامنے کوئی تیز مہک والا پودا تھا اور وہ میری ناک کو چھوتا آگے پیچھے ہوتا تھا اور اس کی مہک اب بھی مجھے یاد ہے... اس وقت وہ آخری مہک تھی.... اور میں کتنی دیر تھامس کا ہاتھ پکڑ سکتا تھا یا اس میں کتنی ہمت تھی کہ وہ ایک شخص کو صرف ایک ہاتھ سے یوں پکڑے رکھے... وہ کچھ کہہ رہا تھا... اور مسلسل کہہ رہا تھا... اور چونکہ وہ انگریزی میں کہہ رہا تھا اس لئے میرا ذہن اسے فوراً نہیں سمجھ رہا تھا اور مجھے یہ سمجھنے میں خاصی دیر لگی کہ وہ کہہ رہا ہے "گریب..... گریب وِد یور لیفٹ ہینڈ اینڈ کِک وِد یور رائٹ لیگ"

یہی بات اگر وہ پنجابی میں کہہ رہا ہوتا کہ "کھبا ہتھ اور سجی لت" تو میں بغیر سمجھے اسے سمجھ جاتا اور میرے ریفلکسز فوراً کام کرنے لگتے.... میں نے اس کی ہدایت کے مطابق اپنے بائیں ہاتھ سے ہر شے کو پکڑنا شروع کر دیا۔ گھاس' سنگریزے' مٹی کوئی بھی شے اور دائیں ٹانگ سے پہاڑی کو کِک کرنا شروع کر دیا..... ہاتھ میں کچھ نہ آیا... پاؤں کے نیچے بوٹ مارنے کی وجہ سے تھوڑی سے جگہ بنی اور میں نے فوراً کہا "مجھے کھینچ لو..." جہاں میں نے پاؤں رکھنے کو جگہ بنائی تھی وہ جگہ چند سیکنڈ کے لئے رہی اور پھر ڈھے گئی لیکن اتنی دیر میں تھامس مجھے اوپر کھینچ چکا تھا اور میں پہاڑی پر تیز مہک کے پودوں کے اوپر اوندھا پڑا تھا اور مجھ پر برف سفید ہو رہی تھی.... میرا منہ کھلا تھا اور ہونٹ مٹی پر تھے..... اور میرا بدن گزر جانے والے لمحے کے خوف سے اب کانپ رہا تھا.... میرا سارا بدن سرد ہو رہا تھا لیکن قمیض کی جیب کے اندر ایک چھوٹی سی جگہ تھی جہاں سے گرمی پھیلتی تھی... جیب میں بٹوے کے اندر میرے بچوں کی ایک تصویر تھی..... اور اس تصویر کو نکال کر دیکھنے کی اب مجھے ضرورت نہ تھی وہ میرے سامنے تھی۔ ان کا ایک ایک نقش میرے سامنے تھا اور میرے سر پر' بالوں پر جو برف گرتی تھی اور پگھلتی تھی اور اس کا سرد پانی میرے چہرے پر راستے بناتا تھا' اس سرد پانی میں چند گرم بوندیں بھی شامل ہوتی تھیں کہ میں ان سے دوبارہ ملوں گا.... میں واپس آؤں گا۔

"ہم آرام نہیں کر سکتے ——— آجاؤ" تھامس نے پھر ہاتھ آگے کر دیا۔

اس کے بعد دو اور خشک نالے آئے جو خطرناکی میں کم نہ تھے لیکن میں اب کچھ نڈر اور کچھ لاپروا سا ہو چکا تھا.... اب میں نانگا پربت کے ہاتھ آنے والا نہیں...... کئی بار تھامس نے مجھے احتیاط سے چلنے کی تلقین کی....

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



پھر وہ بڑے پتھر آ گئے اور ہم ان پر چلنے لگے...... ان کے پار دوسری جانب نیچے کہیں بیال کیمپ تھا...... لیکن ہم ان جانے میں برچ کے سفید درختوں کے ایک چھوٹے سے ذخیرے میں آ نکلے تھے...... برچ صرف اسی بلندی پر ہوتا ہے نیچے فیئری میڈو بھی اس کے لئے بہت گرم ہے۔ یہ ایک ڈھلوان تھی۔۔ سرسبز صرف وہاں جہاں وہ الپائن پھولوں کے ڈھیروں اور جونیپر کے خوبصورت پودوں سے ڈھکی ہوئی نہیں تھی...... کہیں کہیں سفید پتھر تھے جیسے سجا کر رکھے گئے ہیں...... سفید برچ...... الپائن پھولوں کے درجنوں رنگ اور جانے کیسے کیسے ان دیکھے پودے اور رنگین پتوں والی جھاڑیاں...... یہاں بھی نانگا پربت عین اوپر تھی لیکن ہم اس کی برفباری اور دھند کی زد سے باہر آ چکے تھے...... یہاں ڈھلتی دھوپ تھی اور دائیں جانب رائے کوٹ گلیشیئر تھا۔ سامنے برزل پاس تھا اور ان سے پرے فیئری میڈو...... نتھوری اور تاتو سے پرے بلکہ دریائے سندھ سے پرے اتنے طویل فاصلے کے باوجود یہاں سے راکاپوشی صاف نظر آ رہی تھی...... ہم سینکڑوں کلومیٹر پھیلے ہوئے اس عظیم منظر کے گواہ تھے......

ہم یہاں سے جانا نہیں چاہتے تھے...... اور ہم مختلف پتھروں پر بیٹھ گئے... الگ الگ...... جزیروں کی طرح...... نانگا پربت سے منہ موڑ کر...... سامنے سینکڑوں کلومیٹر تک پھیلے ہوئے اس عظیم منظر کو دیکھتے رہے...... اور نامعلوم جھاڑیوں کی مہک تیز ہوئی... اور ہم یہاں سے جانا نہیں چاہتے تھے۔ اور ہم بھول چکے تھے کہ تھوڑی دیر پہلے ہم گھر سے نکل کر جنگل میں کھو جانے والے بچوں کی طرح بے آسرا اور بے بس بھٹکتے تھے اور نانگا پربت ہمیں ابدی آرام دینے کے لئے دھند میں لپٹتی تھی اور برف ہمارے جسموں پر سفید ہوتی تھی...... میں ڈر سے خالی تھا اور میرا بدن پرسکون تھا...... میرا خوف ان پھولوں کے اندر رہ گیا تھا جو گلیشیئر پر لٹکتے ہوئے میری ناک کے آگے آتے تھے اور اپنی جنگلی مہک چھوڑتے تھے۔



## "فیئری میڈو کا جنگل، مارخور اور برفانی انسان اور آخری آلاؤ"

ہم وہاں بیٹھے رہے اور تب میں نے تھامس سے کہا "...... جان بچانے کا شکریہ"

"نہیں نہیں تم خطرے میں نہیں تھے......" وہ میری طرف نہیں دیکھتا تھا اور ادھر دیکھتا تھا جدھر سینکڑوں کلومیٹر طویل منظر سامنے تھا اور اس کے آخر میں راکاپوشی اور دوسری بلند چوٹیاں نظر آ رہی تھیں...... "میں نے تمہیں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور میں خود بھی مضبوط تھا...... ویسے بھی تم گرتے تو دس بیس میٹر کے بعد ٹھہر جاتے......"

"اور شاید نہ ٹھہرتا......"

"شاید...... لیکن مجھے یقین ہے کہ تم مرتے نہیں صرف ہڈیاں ٹوٹتیں......"

"اور اگر ایسا ہو جاتا تو تم مجھے اٹھا کر فیئری میڈو تک لے جاتے..."

"ہاں کیوں نہیں...... دوست کس لئے ہوتے ہیں...... لیکن ایسا ہوا نہیں...... اور جو ہوا نہیں اس کا کیا غم......"

دھوپ مدھم ہو کر قدرے سرد ہونے لگی اور ہم اٹھ کھڑے ہوئے......

واپسی پر بھی ہم جزیروں کی طرح رہے...... الگ الگ...... خاموش...... اور اپنے آپ میں گم...... صرف بیال کیمپ کے جاپانی باغ میں ہم ذرا قریب رہے تاکہ گم نہ ہو جائیں کیونکہ یہاں مور پنکھ کے سبز ریچھ بیٹھے تھے اور کوئی راستہ نہ تھا اور ہم بھٹک سکتے تھے...... قدیم جنگل میں بھی خنکی بڑھ چکی تھی اور پانی کے چلنے کی آواز تیز ہو

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



چکی تھی... خنک درخت ہوا سے ہلتے تھے اور چرچراتے تھے.... صرف ایک بار ہم سے
دور ایک درخت گرا اور دیر تک اس کے کڑکڑانے کی آواز آتی رہی... جب فرش پر
سٹرابیری کے پھول دکھائی دیئے تو ہم فیئری میڈو کے قریب ہو چکے تھے.... اور یہاں
فیئری میڈو کے کنارے پر جنگل میں منگل تھا....

آسٹرین گروپ آچکا تھا۔

درختوں رنگا رنگ خیمے چیڑ کے تناور درختوں تلے ایستادہ تھے.... ایک قنات دو
تنوں کے درمیان اس طرح باندھی گئی تھا کہ اس کی نیچے ایک سٹنگ روم بن گیا تھا
اور یہاں مختلف لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ایک عارضی باورچی خانے میں
خوراک پک رہی تھی اور اس کی خوشبو ہم تک آ رہی تھی... پہلی نظر میں ہم نے
دیکھا کہ بیشتر سیاح عمر رسیدہ تھے۔ انہوں نے نہایت بیش قیمت ٹریکنگ سوٹ پہنے
ہوئے تھے اور ان کے بوٹ نئے اور چمکیلے تھے۔ ایک نوجوان گروہ میں سے جو
درختوں کے نیچے براجمان تھا ایک دبلا بھورے بالوں اور آنکھوں والا شخص اٹھا اور
ہمیں غور سے دیکھتا ہمارے پاس آگیا....

"تارڑ صاحب ہم بہت فکر مند تھے.... بیس کیمپ کو جانے والے شام سے
بہت پہلے واپس آجاتے ہیں اور آپ نے تو بہت دیر کر دی... میرا نام رحمت نبی ہے
اور میں اس آسٹرین گروپ کو لے کر آیا ہوں' ایک سیاحتی ادارے میں ملازم
ہوں...."

"گلگت میں اکرام صاحب نے آپ کا ذکر کیا تھا...." میں نے رحمت سے ہاتھ ملا
کر اس کا تعارف اپنے ساتھیوں سے کروایا۔ "آپ کون سے راستے سے یہاں آئے
ہیں؟"

"ہم سڑک کی جانب سے تاتو پہنچے اور بڑی مشکل سے پہنچے...." رحمت نبی بے
حد چست اور پھرتیلا شخص تھا.... وہ ٹھہر ٹھہر کر بات کرتا تھا اور کم بات کرتا تھا "لیکن
آئیے ناں آپ کو گرم گرم کافی پلائی جائے...."

گرم گرم کافی... مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا.... اس جنگل میں نانگا پربت
سے واپسی پر گرم گرم کافی.... ہم مسکراتے اور سرہلاتے اس کے ساتھ چلے گئے اور
ایک قنات کے نیچے بیٹھ گئے جہاں چند دوسرے سیاح بھی براجمان تھے.... مطیع یہاں
ہم سے پہلے موجود تھا اور ایک آسٹرین لڑکی کا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا....

"یہ جناب مارتا ہے۔" اس نے فوراً تعارف کروایا۔ "کہتی ہے آسٹریا آؤ....



اسے میں نے صدپارہ گولڈ کی پوٹلی دکھائی ہے بہت متاثر ہوئی ہے...."

مارتا نیلی جین' سفید بلاؤز اور سرخ زری والے دوپٹے میں تھی اور یہ دوپٹہ اس
نے جانے کہاں سے لیا تھا۔ اس کے ساتھی بہن بھائی ارسلا اور رولینڈ یورپی کی
بجائے بہت زیادہ ایشائی لگتے تھے کیونکہ وہ دونوں بے حد شرمائے شرمائے سے رہتے
تھے اور بہت کم بولتے تھے....

کافی آگئی..... اور اس میں وہ گرم طاقت تھی جس نے مجھے کسی حد تک بحال
کر دیا...

"بیس کیمپ تو ان دنوں پھولوں سے ڈھکا ہوتا ہے... آپ نے وہ بورڈ دیکھا جو
نانگا پربت کو سر کرنے والے جرمن ہرمن بوہل کی یاد میں آویزاں کیا گیا تھا۔"

"ہم وہاں تک نہیں پہنچ سکے...."

مشاغلہ نے کہا کیونکہ میں اور تھامس چپکے سے کافی پیتے رہے اور مسکراتے
رہے۔

"کیوں؟......"

پہلے کوئی نہیں بولتا تھا اور اب ہم تینوں بولنے لگے... اور جب ہم بول چکے اور
ہم نے اپنی داستان بیان کر لی تو گویا وہ تجربہ ماضی کا حصہ بن گیا' ہم اس سے فوری
طور پر الگ ہو گئے اور اس کی دہشت ہم سے الگ ہو گئی اور وہ احساس کی سطح پر
ہماری زندگی کی کتاب پر لکھا گیا اور وہ ورق پلٹا گیا۔

"آپ کو ہمارے علاقے میں کون سی جگہ سب سے اچھی لگی؟" رحمت نبی نے
مجھ سے پوچھا...

"وہاں تاتو سے آتے ہوئے جب چڑھائی ختم ہوتی ہے اور فنتوری کا علاقہ
شروع ہوتا ہے وہاں بائیں ہاتھ پر رائٹ کوٹ گلیشیئر کے عین اوپر ایک بلند سطح پر
لکڑی کے شہتیروں سے بنا ہوا ایک چھوٹا سا کیبن ہے مجھے اس کے آس پاس کا علاقہ
پسند آیا...."

"اور اس کیبن کے دروازے پر ایک چھوٹا سا تالا لگا ہوا ہے؟"

"ہاں مجھے یاد تو پڑتا ہے"

"وہ کیبن میرا ہے۔ آپ جب چاہیں آئیں اور اس میں جتنے دن چاہیں قیام
کریں...."

وہ کیبن اب بھی ان بہت ساری جگہوں میں سے ایک ہے جو میں نے جمع کر

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



رکھی ہیں کہ ایک دن وہاں جاؤں گا اور زندگی کے چند دن گزاروں گا اور ظاہر ہے کہ میں جا نہیں سکوں گا لیکن ایسی جگہوں کو جمع کر لینے میں تو کوئی حرج نہیں۔۔۔ اس ہوا' رائے کوٹ گلیشیئر میں بہنے والے پوشیدہ دریا کے شور' فنتوری کے سبزے اور رنگ اور نانگا پربت کی چوٹی سے مدہم گڑگڑاہٹ کے ساتھ اترتے برفانی طوفانوں کی سفید دھول کو جمع کر لینے میں کیا حرج ہے۔۔۔۔

رحمت نبی کے گروپ کا بلتی باورچی حسین بار بار مجھ سے رات کے کھانے کے بارے میں پوچھتا کہ صاحب کیا کھاؤ گے اور میں ذرا شرمندہ سا محسوس کرتا کہ میں کس طرح ان پر بوجھ ہوں۔۔۔۔ ہمارے پاس بہت خوارک ہے۔۔۔۔ میں بار بار کہتا اور ہمارے پاس واقعی بہت خوارک تھی۔ لیکن رحمت نبی کہتا "میں تاتو کا رہنے والا ہوں۔ آپ میرے مہمان ہیں۔ آپ جتنے روز بھی فیری میڈو میں ٹھہریں گے میرے مہمان ہوں گے۔۔۔ آپ جس کھانے کی خواہش کریں گے' حسین آپ کو بنا دے گا۔۔۔۔"

رحمت نبی کے گروپ کے بوڑھے سیاح سب کے سب اپنے آپ میں گمن تھے۔۔۔۔ وہ بہت زیادہ حرکت نہیں کرتے تھے۔۔۔۔ وہ مجھے بہت تنہا اور اداس اور بغیر خواہش کے لگے۔۔۔۔ خلاء میں گھورتے ہوئے اور اوپر دیکھتے ہوئے۔ کسی پتھر پر بیٹھے ہوئے' کافی پیتے ہوئے' میں نے ان کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔۔۔۔

"آپ نے کیسے جانا کہ وہاں ملک پاکستان کے شمال میں شاہراہ ریشم ہے اور اس پر ایک پل رائے کوٹ نام کا ہے جسے آپ سب رکھیوٹ کہتے ہیں اور اس پل سے دو دن کی سخت مسافت کے بعد فیری میڈو آتا ہے۔۔۔ آپ نے کیسے جانا؟" میں نے مارتا سے دریافت کیا۔

"میں آسٹریا میں ایک پرائیوٹ فرم میں کام کرتی ہوں۔۔۔ میں جب بھی اپنے باس کے کمرے جاتی' وہاں اس کی کرسی کے پیچھے ایک بہت بڑی پینٹنگ کو دیکھتی۔۔۔۔ اس پینٹنگ میں ایک وسیع سبزہ زار ہے' جنگل ہے اور ایک خوبصورت سفید پہاڑ ہے۔۔۔۔ میں اپنے باس سے کہتی کہ کیا یہ ممکن ہے کہ کہیں دنیا میں کوئی ایسی جگہ ہو اور وہ کہتا "نہیں مارتا یہ تو ایک خوبصورت تخیل ہے' ایک پینٹنگ ہے۔۔۔۔" اور میں اسے دیکھتی رہتی۔۔۔۔ پھر ایک روز میری سالگرہ تھی اور میں ظاہر ہے دفتر سے چھٹی تو کر نہیں سکتی تھی اس لئے ذرا بن سنور کے چلی گئی۔۔۔۔ میرے باس کو معلوم تھا کہ اس روز میری سالگرہ ہے اور وہ کہنے لگا۔۔۔ "مارتا میں تمہیں ایک عجیب و غریب تحفہ



دینا چاہتا ہوں۔۔۔۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ یہ پینٹنگ نہیں ہے۔۔۔۔ ایک تصویر ہے اور۔۔۔۔ ایک جگہ ہے۔۔۔۔ اس دنیا میں ہے۔۔۔۔ پاکستان میں ہے۔۔۔۔ اور اس کا نام فیری میڈو ہے۔" میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں یہاں آؤں گی۔۔۔۔ اور اب میں یہاں ہوں اس پینٹنگ میں"

اس دوران ایک مرتبہ پھر ہرمن بوہل کے بارے میں گفتگو شروع ہو گئی۔۔۔۔۔ ایک نفیس اور خوبصورت بوڑھا جو ایک پرانے کوٹ میں ملبوس تھا بہت دیر سے رسی بٹنے میں مصروف تھا۔۔۔۔ وہ ذرا قریب آگیا۔۔۔۔ رحمت نبی نے بتایا کہ یہ میرے چاچا ہیں۔۔۔ چاچا کہنے لگے "مجھے یاد ہے جب جرمنوں نے نانگا پربت کو فتح کیا تھا۔۔۔۔ ہرمن بوہل نے یہاں فیری میڈو میں چوٹی پر چڑھنے کی خوشی میں بہت بڑا دعوت کیا تھا۔ گائے بیل کو بھی کھانا ملا تھا۔۔۔۔ پھر دو سال پہلے اس کی بیوی ادھر آئی تھی۔۔۔ بیس کیمپ میں جا کر اس کی یاد میں جو بورڈ ہے اسے دیکھ کر بہت روئی۔۔۔۔ اور وہ بہت اونچا اونچا روئی نانگا پربت کے پاس۔۔۔۔ وہ ان ساری جگہوں پر گئی جہاں اس کا خاوند گیا تھا"

"بابا جی۔۔۔۔ وہ جو ہے میسنر وہ بھی تو ادھر آیا تھا۔۔۔۔۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں وہ بھی آیا تھا۔۔۔۔ میسنر کا بھائی بھی کو ہ پیا تھا اور وہ نانگا پربت پر مرا تھا۔۔۔۔ اور جب میسنر اکیلا چوٹی پر پہنچا تو وہاں سے گرا۔۔۔۔ تیز ہوا کی وجہ سے۔۔۔۔ اور ادھر بونر کی طرف گرا۔۔۔۔ نیچے تک گرتا گیا۔۔۔۔ پھر ایک چرواہے نے اسے کراہتے ہوئے دیکھا اور اسے اٹھا کر نیچے گاؤں بونر فارم میں لے گیا اور علاج کیا۔۔۔۔"

"ہمارے ساتھ ڈاکٹر فرٹز گارنز بھی ہے۔۔۔۔" رحمت نبی کہنے لگا "فیری میڈو کے بارے میں کتاب لکھ رہا ہے۔۔۔۔ خاص طور پر یہاں کے پھولوں اور پودوں کے بارے میں۔۔۔۔ اس وقت پریوں کے ساتھ ہے ورنہ ملاقات کرواتے۔۔۔۔"

"پریوں کے ساتھ؟"

"ہاں۔۔۔۔" رحمت نبی مسکرانے لگا "وہ اپنے خیمے میں ہے پریوں کے ساتھ۔۔۔۔"

رحمت نبی کے گروپ کے چند لوگ شام کے کھانے کے لئے کسی سوپ کی خواہش لے کر آئے اور وہ ان سے باتیں کرنے لگا۔۔۔۔ ہم نے اس کی کافی کا شکریہ ادا کیا اور جنگل سے نکل کر اپنی پہاڑی پر چڑھنے لگے۔۔۔۔ یہاں مجھے نقاہت سی محسوس ہوئی اور مجھے متعدد بار رک کر سانس درست کرنا پڑا۔۔۔۔ اوپر خیمے کے باہر گاڈ فرے ایک مطمئن انسان کی طرح بیٹھا مسکرا رہا تھا۔۔۔۔ "میں تم لوگوں کے لئے کافی بنا کر لا تا

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



ہوں"......

"تھینک یو گاڈفرے......" مشاگلہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "ہم کافی پی کر آئے ہیں......"

جب اسے ہماری مہم جوئی کے بارے میں علم ہوا تو اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی "مسٹانسر میں پہاڑوں کو جانتا ہوں.... ان کے یہ بظاہر آسان راستے موت کے پھندے ہوتے ہیں- میں کبھی رسک نہیں لیتا.... میں نے وہ راستہ دیکھا تو جان لیا کہ اس میں خطرہ ہے.... تمہیں پتہ ہے کہ جو لوگ بھی پہاڑوں پر چڑھتے ہیں وہ اسی طرح مرتے ہیں.... ایک جھوٹی انا کی تسلی کے لئے' لوگ انہیں ڈرپوک نہ کہیں اور وہ دل کی آواز پر کان نہیں دھرتے اور کسی موت کے پھندے والے راستے پر قدم رکھ دیتے ہیں...."

مجھے ایک بے چینی کا احساس ہو رہا تھا.... یہ زکام اور بخار کی آمد تھی- ناک میں چلبلاہٹ اور ایک پر لطف احساس والی حدت- میرا ماتھا بے حد گرم تھا اور آنکھیں جلتی تھیں.... یہ اس سرد موسم کا شاخسانہ تھا جو نانگا پربت کے دامن میں تھا اور اس برف باری کا نتیجہ تھا جس میں' میں تیز مہک کی جڑی بوٹیوں پر اوندھا پڑا تھا اور مجھ پر برف کے گالے گرتے تھے.... میں نے اپنی میڈیکل کٹ نکالی جو ڈاکٹر محمد رمضان کے مشورے سے تیار کی گئی تھی...... وہاں ایک کاغذ پر زکام اور بخار کے آگے جن دوائیوں کا تذکرہ تھا وہ میں نے فوری طور پر نگلیں اور خیمے میں سے ربڑ میٹرس نکال کر اس میں ہوا بھر کر وہیں کھلی فضا میں لیٹ گیا- مشاگلہ اور تھامس اپنے خیمے میں جا چکے تھے..... گاڈفرے پانی لینے کے لئے نیچے فیری میڈو چلا گیا.....

میں کچھ دیر اونگھتا رہا.... ادھر شام اتر چکی تھی لیکن نانگا پربت حسب معمول ابھی دھوپ میں تھی..... میری آنکھیں بند تھیں اور میں دراصل اپنے اس ہلکے بخار اور زکام سے لطف اندوز ہو رہا تھا.. کسی کے کھانسنے کی آواز پر میں نے آنکھیں کھول دیں... نیلی آنکھوں والا کوہستانی اور اس کا ایک ساتھی بظاہر مجھ سے بے پرواہ بزل پاس کو تکے جا رہے تھے.... انہیں دیکھ کر میں اپنی مسکراہٹ قابو میں نہ رکھ سکا..... وہ جاننا چاہتے تھے باہر کی دنیا کے بارے میں' ہمارے بارے میں' لیکن ان کی انا بہت اونچی تھی' نانگا پربت سے بھی اونچی' اور وہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے اور اپنے بھولپن کی وجہ سے ظاہر کر دیتے تھے..... نیلی آنکھوں والے کے کمبل کے نیچے ایک



بندوق تھی..... میں اپنی میٹرس سے اٹھا اور ان کے قریب جا بیٹھا..... وہ حسب توقع لاتعلق بیٹھے رہے اور میں نے سرد مہری کی برف توڑنے کے لئے ایک مرتبہ پھر دوربین مانگی.. اس بار نیلی آنکھوں نے دوربین میری طرف پھینکی نہیں بلکہ ہاتھ بڑھا کر آگے کر دی..... لیکن اس بار بھی اس نے میری طرف دیکھنا گوارہ نہیں کیا بلکہ بظاہر بے دلی سے دوسری جانب دیکھتا رہا.. میں نے دوربین کو آنکھوں سے لگا کر رائے کوٹ گلیشیئر کو دیکھا جس کے ادھر کچا راستہ تھا.... وہ ایک اور دنیا تھی..... نوکیلے اہراموں کی سرد اور یہاں سے بے آواز دنیا' اور اس کے اوپر نانگا پربت تقریباً سائے میں جا چکی تھی..... دوربین واپس کر کے میں نے ہیں کیمپ کے سفر کی داستان شروع کر دی' میں اپنے آپ سے جیسے مخاطب تھا.... وہ سنتے تھے لیکن اپنی دلچسپی ظاہر نہیں کرتے تھے.... جب میں نے اپنے بخار اور زکام کا بتایا اور وہ اس کی علامات میرے چہرے اور آنکھوں میں دیکھ بھی سکتے تھے تو انہوں نے پہلی بار مجھ پر نگاہ کی..

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے نیلی آنکھوں والے سے پوچھا اور وہ ایک نہایت دلکش نین نقش والا نوجوان تھا-

"تیمور خان ....." اس نے غصے سے کہا-

"اور تمہارا؟" میں نے دوسرے کوہستانی سے دریافت کیا-

"یہ میرا بھائی ہے ...." تیمور خان ایسے بولا جیسے کہہ رہا ہو کہ نظر نہیں آ رہا یہ میرا بھائی ہے.....

گاڈفرے نیچے سے پانی لے آیا اور چائے کے لئے کیتلی آگ پر رکھ دی ... میں نے اسے اشارہ کیا اور وہ سمجھ گیا... جب چائے آئی تو تین مگ تھے .... "یہ تمہارے لئے ہے تیمور...... اور تمہارے ساتھی کے لئے......"

وہ گھبرا گیا "نہیں نہیں ....."

"تم ہمارے خیمے کے باہر آ کر بیٹھے ہو' ہمارے مہمان ہو .... چائے پیو..... تم تو اپنے مہمانوں سے بولتے بھی نہیں لیکن ہم ایسے نہیں' چائے پیو"

یہ فقرہ تیمور پر بہت ساری بجلیاں بن کر گرا- وہ بھسم ہو گیا' اس کی دنیا برباد ہو گئی کیونکہ کوہستانی بھی پٹھانوں کی طرح مہمان نوازی کے بارے میں بے حد حساس ہیں... میں نے اس کے علاوہ کچھ نہیں کہا اور اگر میں کچھ کہتا تو شاید وہ مجھے وہیں قتل کر دیتا..... لیکن وہ نرم پڑ گیا اور میرے آس پاس بننے لگا "کہاں سے آئے ہو؟ کیا

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



کرتے ہو؟ کیوں آئے ہو؟"

جب دوستی ذرا مستحکم ہو گئی تو وہ ذرا آزاد ہو گیا "یہ جو انگریز مرد اور عورت ہیں..." اس نے تھامس کے خیمے کی طرف دیکھا "یہ ..." اور ایک فحش اشارہ کیا۔

"نہیں نہیں ..." میں نے گھبرا کر کہا "میاں بیوی ہیں..."

لیکن تیمور یورپی مردوں اور عورتوں کے اخلاق کے بارے میں مخصوص نظریات پر شدت سے قائم تھا... "یہ سب ادھر عیاشی کرنے آتا ہے..." اور یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں بھی عیاشی چھلکتی تھی... میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اس قسم کی حرکتیں یہ لوگ۔ اپنے گھروں میں، گلیوں بازاروں اور میزوں کرسیوں پر بھی کر سکتے ہیں انہیں صرف اس کام کی غرض سے یورپ چھوڑ کر گلگت اور پھر دو دن پہاڑوں میں مشقت کر کے فیری میڈو پہنچنے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن... تیمور بار بار اسی اشارے کی گردان کر رہا تھا "تمہیں کیسے پتہ ہے کہ یہ میاں بیوی ہے... تم نے نکاح نامہ دیکھا ہے؟"

"نہیں... لیکن وہ دونوں ایک دوسرے سے اتنے بیزار ہیں کہ میاں بیوی ہی ہو سکتے ہیں..."

ادھر نیچے جو گورا اور گوری تھا فرانس سے آیا تھا... سارا دن خیمے سے باہر نہیں آتا تھا... کیا کرتا تھا خیمے میں؟"

"پتہ نہیں یار..." میں نے تنگ آ کر کہا... اور پھر موضوع بدلنے کی خاطر اس کے ساتھی کی بندوق کے بارے میں گفتگو شروع کر دی "اس بندوق سے کیا کرتا ہے؟"

"فائر کرتا ہے... آپ فائر کرے گا" اس نے بندوق میری طرف بڑھائی۔

"نہیں ... کس پر کرے گا؟"

"ادھر..." اس نے پھر خیمے کی طرف اشارہ کیا "اس پر کرو ... کافر لوگ ہے۔ عیاشی کرتا ہے"

شام ہو چکی تھی۔ نیچے فیری میڈو میں آج خوب رونق تھی۔ دس بارہ بچے فٹ بال کھیل رہے تھے اور ان کی چیخوں اور شور کی آواز کبھی کبھی اوپر ہم تک بھی آ جاتی تھی... کچھ آسٹرین بوڑھے بھی ادھر ادھر ٹہل رہے تھے لیکن الگ الگ... یہ سب کچھ تھوڑی ہی دیر میں تاریکی کی نذر ہو گیا۔ میں نے رحمٰن کی لالٹین خیمے سے



نکال کر روشن کی اور اپنے پاس رکھ لی... نیچے سے کوئی ادھر آیا اور وہ لالٹین کی روشنی سے پرے تھا تو ہم پہچانتے رہے اور جب اس کی زد میں آیا تو یہ بلتی ٹک حسین تھا، وہ ایک ٹفن کیریئر اٹھائے ہوئے تھا "رحمت نبی نے آپ کے لئے شام کا کھانا بھیجا ہے..." اس نے کیریئر میرے آگے رکھا اور سلام کر کے پھر نیچے اترنے لگا...

"آؤ تیمور کھانا کھاؤ..."

اور یہ تیمور کی برداشت سے باہر تھا کہ میں اسے کھانا بھی پیش کروں چنانچہ وہ سر ہلاتا اٹھ کھڑا ہوا...

"تم کیا کرتے ہو تیمور؟"

وہ چار پانچ قدم نیچے جا چکا تھا جب میں نے یہ سوال کیا اور وہ ادھر اندھیرے میں سے بولا "ہم شکاری ہیں"

"یار کیسا شکاری ہے کہ مہمان کو شکار نہیں کھلاتا..."

"کیا کھائے گا؟"

"مارخور..."

"اچھا..." اس کی تیز آواز آئی اور وہ اپنے ساتھی سمیت تاریکی میں اتر گیا۔

رات کے کھانے میں گرم سوپ، آلو قیمہ اور چاول تھے...

مجھے اگرچہ بخار تھا زکام تھا لیکن میں کوہ پیماؤں والی ایک گرم ترین جیکٹ میں تھا اور بالکل محفوظ تھا... صرف میرے چہرے پر سرد ہوا تھی اور مجھے وہ بھلی لگتی تھی...

لالٹین کی روشنی کا گھیرا جب مختصر ہونے لگا تو میں نے اس کی لو اونچی نہیں کی ... اس کا شیشہ اوپر کر کے بجھا دیا...

"شکریہ ..." گاڈ فرے کی آواز آئی جو اپنے سلیپنگ بیگ میں لیٹ چکا تھا۔ "میں تمہاری لالٹین کی روشنی کی وجہ سے ستارے نہیں دیکھ سکتا تھا... اب دیکھ سکتا ہوں"

نیچے جنگل میں جہاں رحمت نبی کا گروپ خیمہ زن تھا وہاں چیڑ کے درختوں کی تاریکی ہولے ہولے دہکنے لگی لو دینے لگی، روشن ہونے لگی... نیچے جنگل میں انسوں

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



نے الاؤ روشن کر رکھا تھا۔

اس رات مجھے بخار بہت تھا اور زکام بہت تھا...... اور میں کروٹیں بدلتا رہا...... میرے بدن میں بھی درد تھا۔ خاص طور پر دونوں کندھوں کے جوڑوں میں...... اور یہ رائے کوٹ گلیشیئر پر لٹکنے کا نتیجہ تھا.... بخار کی حدت میں ایک ست مزہ بھی تھا اس لئے میں بے مزہ نہ ہوا... رات کے پچھلے پہر میں نے بہتر محسوس کیا۔ ایسے لگا جیسے میرے بدن پر رکھا ہوا بوجھ کسی نے اٹھا لیا ہو..... میں گہری نیند میں چلا گیا اور پھر جانے کیا وقت تھا کہ میں نے گہری نیند میں ایک برا خواب دیکھا کہ میرے خیمے کا پردہ چاک ہو رہا ہے خنجر سے اور پھر اس چاک شدہ حصے سے تیمور خان کا سر باہر آتا ہے اور کہتا ہے..... "اوئے.... اوئے سوتا ہے؟".... لیکن یہ سچ مچ تیمور خان کا سر تھا جو خیمے کے پردے میں سے اندر آ کر کہہ رہا تھا۔

"اوئے....... اوئے سوتا ہے؟"

میں کچھ ٹھنڈا ہو گیا.... رات کے اس پہر یہ کوہستانی کیا چاہتا ہے.... میرے پاس جو ایک عدد خان تھا وہ اس وقت خراٹے مار خان تھا اور بے خبر سوتا تھا......

"کیا ہے؟" میں نے اپنی آواز ناراض بنانے کی کوشش کی۔

اس نے جواب میں اپنی بندوق خیمے کے اندر کر دی "یہ ہے...."

یہ ہے؟ میں لرزنے لگا..... یا اللہ ...."یہ یہ..... کیا ہے؟"

"بندوق ہے...." وہ بولا "اس سے تمہارے لئے مارخور مار کر لائے گا.... اوپر برزل پاس سے..... رات ادھر رہے گا۔ کل آئے گا..... صرف تمہارے لئے جاتا ہے.... انتظار کرنا...." خیمے کا پردہ برابر ہو گیا اور وہ چلا گیا......"

میں نے وقت دیکھا تو پانچ بجنے کو تھے.... تھوڑی دیر کروٹیں بدلنے کے بعد میں خیمے سے باہر آ کر میٹرس پر بیٹھ گیا.....

سردی شدید تھی.... نانگا پربت کا ایک چھوٹا سا حصہ پہلی دھوپ میں تھا.... گاڈفرے آنکھیں ملتا ہوا آ گیا "تمہارا خیال ہے کہ تم اگر نانگا پربت سے آنکھیں اٹھاؤ گے تو یہ اوجھل ہو جائے گی.... اس وقت فیری میڈو بالکل سنسان پڑا ہے.... آؤ کچھ تصویریں اتار لیں...."

میں نے جاگر پہنے اور ہم نیچے اترنے لگے۔

فیری میڈو کی گھاس میں سے چھوٹے چھوٹے پھولوں کی سفیدی اور زردی اس



وقت زیادہ نمایاں تھی۔ ہم نے اس کی چھوٹی سی ندی پر جھک کر منہ ہاتھ دھویا اور پانی کی یخ بستگی نے ہمارے چہروں کو چوکنا کر دیا.... پھر ہم اسی ندی کو پھلانگ کر اس مقام تک گئے جہاں سے جنگل' نانگا پربت اور فیری میڈو کا پورا میدان نظر آتا ہے.... ہم تصویریں اتارتے رہے اور بے مقصد ادھر ادھر گھومتے رہے.... صبح کی خنکی میں فیری میڈو کی تنہائی نے میری بیماری کو تقریباً زائل کر دیا.... یہاں سے ہمارا نیلا خیمہ نانگا پربت کی سفیدی کے سامنے ایک دھبے کی صورت نظر آ رہا تھا.... فیری میڈو میں گشت کرنے کے بعد ہم جنگل میں چلے گئے.... اور وہاں ناشتے کے لئے برتنوں کی آوازیں آ رہی تھیں.... دھواں اٹھ رہا تھا....

"میں آپ کا ناشتہ پہاڑی پر بھیجنے والا تھا.... اچھا ہوا آپ آ گئے.... حسین.... کارن فلیکس لاؤ مہمانوں کے لئے...." رحمت نبی ہمیں دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا....

ہم اس کے ساتھ قنات کے نیچے بیٹھ گئے.... چند پورٹر آگ جلائے بیٹھے تھے.... اس کی گرمی ہم تک بھی آتی تھی....

"آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟ ٹھیک ہے؟ ویسے ہمارے ساتھ ایک ڈاکٹر بھی ہے...."

آسٹرین سیاح اپنے خیموں سے نکل کر ناشتے کے لئے آنے لگے.... ان میں مارتا' ارسلا اور رولینڈ بھی تھے.... مارتا ایک بہت دوست اور ملنسار قسم کی لڑکی تھی.... اس کے سیاسی خیالات بے حد ترقی پسندانہ تھے اور وہ ہمہ وقت اپنے گروپ کے بزرگوں سے الجھتی رہتی تھی.... اس کے آتے ہی آسٹرین صدر کرٹ والڈ ہائم پر عائد کردہ الزام پر بحث شروع ہو گئی کہ کیا دوسری جنگ عظیم میں وہ واقعی نازیوں کا آلۂ کار تھا اور یہودیوں کے قتل عام میں شریک تھا.... مارتا کا خیال تھا کہ ایسا تھا اور بزرگوں کا خیال تھا کہ اگر ایسا تھا تو پھر کیا ہوا.... ارسلا اور رولینڈ صرف مسکراتے تھے.... اس دوران ایک شخص ناشتے کے لئے آیا جو آسٹرین کسانوں کے مخصوص لباس میں تھا.... پائپ کے کش لگاتا ہوا وہ گھاس پر بیٹھ گیا۔

"یہ ڈاکٹر فرنز گارٹز ہیں.... جو فیری میڈو پر کتاب لکھ رہے ہیں...." مارتا نے تعارف کرایا۔

"جن سے کل ملاقات اس لئے نہ ہو سکی کہ یہ اپنے خیمے میں پریوں کی ساتھ تھے....؟"

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



ڈاکٹر گارنر نے مجھ پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور پھر قہقہہ مار کر ہنس دیا۔۔۔

"آپ کا کیا پروفیشن ہے؟"

"آوارہ گردی۔۔۔" میں نے بھی ہنس کر کہا۔

"آ۔۔۔ اے وگابانڈ۔۔۔ وہ تو ہم سب ہیں ورنہ ہم یہاں نہ ہوتے۔۔۔ لیکن جناب کیا شاندار ملک ہے آپ کا' آپ خوش قسمت ہیں جو اس ملک میں رہتے ہیں۔۔۔"

"ہم یقیناً ہیں ڈاکٹر گارنر۔۔۔ اور کیا آپ واقعی فیئری میڈو پر کتاب لکھ رہے ہیں؟"

"ایک لمحہ۔۔۔" اس نے انگلی کھڑی کی پھر اٹھا اور اپنے خیمے کی طرف چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے پاس ایک فائل تھی جس میں کچھ فوٹوسٹیٹ شدہ کاغذات تھے۔۔۔ اور یہ اس کی کتاب کے کچھ ورق تھے جو چھپ چکے تھے۔ ان میں فیئری میڈو اور نانگا پربت کے دامن میں اگنے والے پھولوں اور درختوں کی تفصیل تھی۔۔۔

"میں ایک سکول ٹیچر ہوں اور بیالوجسٹ ہوں۔۔۔ فیئری میڈو اور اس کے آس پاس کا علاقہ میرا جانا پہچانا ہے' میں اپنی کتاب کے سلسلے میں تین ماہ یہاں اکیلا گھومتا رہا۔۔۔ یہاں پائے جانے والے پھول' پودے اور تتلیاں ایک عجوبہ ہیں اس لئے کہ ان میں ایشیائی' ترکی اور یورپی اقسام موجود ہیں۔ دنیا میں میں نے تو کم از کم کہیں بھی' کسی ایک مقام پر ان تینوں اقسام کو اگتے اور اڑتے نہیں پایا۔۔۔"

ایک بوڑھا آسٹرین جو پہلے ہی بہت بیزار بیٹھا تھا ڈاکٹر کی گفتگو سننے کے لئے آگے آیا اور پھر مسکرا کر کہنے لگا "دراصل یہی وہ شخص ہے جو اس علاقے کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کر دیتا ہے اور مجھ جیسے ریٹائرڈ بوڑھوں کو اولڈ پیپل ہوم سے نکال کر یہاں لے آتا ہے۔۔۔"

بعد میں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر گارنر ایک کامیاب ٹریول ایجنٹ بھی ہے اور لوگوں کو ٹور پر یہاں لے کر آتا ہے۔ اس کے علاوہ فیئری میڈو سے تتلیاں پکڑ کر یورپ کے عجائب گھروں کو سپلائی کرتا ہے۔۔۔

"کیا تمہیں پودوں اور درختوں سے دلچسپی ہے؟" ڈاکٹر گارنر نے مجھ سے پوچھا۔

"میرے والد رحمت خان تارڑ ایک معروف ماہر زراعت ہیں اور انہوں نے زراعت کے موضوع پر درجنوں کتابیں تحقیق و تصنیف کی ہیں۔ میں بھی بہت عرصہ



اس شعبہ سے منسلک رہا ہوں۔۔۔"

"ہا۔۔۔" ڈاکٹر بے حد خوش ہوا "پھر تو تم میری زبان سمجھ سکتے ہو۔۔۔ یہاں تو ایسے ایسے پودے ہیں کہ میں کیا بیان کروں۔ یہ فیئری میڈو والے کوہستانی مجھے خبطی سمجھتے ہیں کیونکہ میں اکثر کسی تتلی کے پیچھے بھاگتا ہوا اسے جال میں لانے کی کوشش کر رہا ہوتا ہوں یا کیمرے کے ساتھ کسی خطرناک چٹان کے ساتھ لٹک کر کسی پھول کی تصویر اتار رہا ہوتا ہوں۔۔۔ تم جانتے ہو کہ یہاں پائنس گیرارڈیانہ بھی پایا جاتا ہے؟" ڈاکٹر کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ مجھے ستائش چاہنے والی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔۔۔

"نہیں میں نہیں جانتا تھا۔۔۔" میں نے جھینپ کر کہا۔

"اور جناب یہاں تمارکس گالیکا بھی ہے۔۔۔"

"اچھا۔۔۔" میں نے کان کھجا کر کہا "کمال ہے۔۔۔"

"میرے قریب آ کر میری بات سنو۔۔۔" وہ اب پودوں کی دنیا میں تھا اور بے حد خوش تھا کہ اسے مجھ جیسا "پودہ ایکسپرٹ" مل گیا ہے "یہاں جونپرس یہی گلوبوسا اتنا زیادہ پایا جاتا ہے کہ تم یقین نہیں کر سکتے۔۔۔"

"کیا واقعی؟"

"اور آرٹیمیا میری تیما' کوچیا' روزا و بیانہ' کولوٹیا' بربرس اور لونی سیرا تو بے حد عام ہیں۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ زراعت کے پاکستانی ماہرین ان علاقوں کی نباتات پر بے شمار کتابیں تحریر کر چکے ہوں گے۔۔۔"

زراعت کے پاکستانی ماہرین عام طور پر اپنے اسلام آباد کے دفتروں سے باہر نکل کر اپنے لان میں کھلے ہوئے پھول اور پودے بھی نہیں دیکھتے۔۔۔ لیکن میں نے اسے یہ نہیں بتایا بلکہ کندھے اچکا کر ایک مسکراہٹ کے ساتھ اس کا جواب دے دیا جو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے ڈاکٹر فرنز کی کتاب کے اوراق پر ایک نظر ڈالی۔۔۔ اس نے رائے کوٹ سے لے کر نانگا پربت کے دامن تک کے علاقے کے نقشے نباتاتی حوالے سے بنا کر شامل کر رکھے تھے اور ادھر اگنے والا پتہ پتہ بوٹا بوٹا اس میں درج تھا۔۔۔

اس نے مجھے نانگا پربت کی ایک ایسی تصویر دکھائی جو حیران کن تھی۔۔۔ ایک وسیع جھیل میں نانگا پربت سورج ڈوبنے کے بعد گلابی رنگ میں۔۔۔ "میں لوگوں کو

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



فیری میڈو کی یہ تصویر دکھاتا ہوں اور وہ کھنچے چلے آتے ہیں....."

"لیکن یہ منظر میں نے تو ادھر نہیں دیکھا.... فیری میڈو میں جھیل کہاں سے آ گئی؟"

"اس کی ایک کہانی ہے.... میں ایک روز جنگل میں تھا کہ شدید بارش شروع ہو گئی.... ادھر فیری میڈو کی طرف آیا تو ادھر داخلے کے پاس ایک جگہ پر تھوڑا سا پانی جمع ہو چکا تھا.... بس میں نے ایک خاص زاویئے سے نانگا پربت کی تصویر ایسے اتاری کہ اس تھوڑے سے پانی میں وہ نظر آنے لگی.... بس یہی وہ جھیل ہے.... تھوڑی سی دیر بعد پانی خشک ہو گیا اور جھیل غائب۔ اب جو سیاح ادھر آتے ہیں تو مجھ سے پوچھتے ہیں کہ فیری میڈو کی جھیل کہاں ہے تو میں کہتا ہوں یہ طلسمی چراگاہ ہے، جھیل غائب ہو گئی ہے"۔

"ویسے ادھر جھیل تو ہے....."

"ہاں.... وہیں داخلے کے ساتھ ذرا نیچے ایک عام سی جھیل ہے.... کبھی کبھار جب میں پریوں کے ساتھ تنہا ہونا چاہتا ہوں تو وہاں چلا جاتا ہوں....."

"پریوں کے ساتھ..... انہی پریوں کے ساتھ جو....."

"ہاں وہی.... پریاں" وہ پھر ہنسنے لگا۔

"آج شام اگر فرصت ہو تو میرے خیمے میں چلے آنا تمہاری ملاقات کروا دوں گا.... پھر ملیں گے میں بیال کیمپ جا رہا ہوں" وہ اسی طرح خوش و خرم ہاتھ ملتا ہوا چلا گیا۔

"یہ کس قسم کی پریوں کی بات کر رہا تھا؟" میں نے مارتا سے پوچھا جو ڈاکٹر کی گفتگو کے دوران مسلسل مسکرائے چلی جا رہی تھی۔

"یہ اس قسم کی پریوں کی بات کر رہا تھا جو کہ آدھی بوتل وہسکی پینے کے بعد ہر ایک کو نظر آنے لگتی ہیں.... سارا دن جنگل میں گھومتا رہتا ہے اور شام ہوتے ہی اپنے خیمے میں بند ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ وقت پریوں کے لئے ہے اور پھر کبھی کبھی اس کے گانے کی آواز بھی آتی ہے....."

ہم جہاں بیٹھے تھے وہ جنگل کا شروع تھا.... یہاں سے ایک جانب تو فیری میڈو کا کچھ حصہ نظر آتا تھا اور دوسری جانب وہ گہری خاموشی تھی جو ادھر سے آتی تھی، جدھر خاموش ندی میں برچ کے سینکڑوں برس قدیم تنے پڑے تھے اور پانی کے زور



سے جب چلتے تھے تو زندہ لگتے تھے.... میں مسلسل ادھر دیکھ رہا تھا اور مجھے مسلسل ادھر سے بلاوا آتا تھا....

"تم اور تمہارے دوست بھی ہماری پہاڑی پر آؤ۔ نانگا پربت کا حسین ترین روپ تو ادھر سے ہی دکھائی دیتا ہے....."

"ہم آئیں گے...." مارتا نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور پھر سر جھٹک کر کہنے لگی "تم بہت عجیب مرد ہو....."

"کیوں؟"

"پتہ نہیں...." اس نے پھر سر جھٹکا.... "لیکن تم ہو...."

جنگل کے اندر وہی خاموشی تھی اور اس خاموشی کے اندر وہی سرسراہٹ تھی اور میں اس کے اندر ایک ایلس کی طرح حیرت میں گھومتا تھا اور وہ ایک ونڈر لینڈ تھی...

اس روز اور اس سے اگلے روز میں اسی ونڈر لینڈ میں رہا.... میں بہت کم فیری میڈو کی طرف آتا.... کبھی میں جنگل کی تنہائی میں خوفزدہ ہو جاتا اور گھبراہٹ میں پرانے تنوں کو پھلانگتا اور پانی میں چلتا واپس فیری میڈو میں آ جاتا.... لیکن یہ بہت کم ہوتا۔ میں اکثر اس میں گم رہتا.... اور اس جنگل کے گم اسرار میں چلتے ہوئے مجھے مارکیز کے ناول "سو برس کی تنہائی" کا خیال آتا رہتا.... اس کے جنگل کا خیال آتا رہتا.... ایک روز میں جھیل کی طرف بھی گیا جو ایک بڑا تالاب تھا جہاں مویشی پانی پینے کے لئے آتے تھے.... اس کے باوجود اس میں خاموشی اور تنہائی کا حسن تھا.... اس کے کنارے بھی گرے ہوئے درخت تھے، بوسیدہ تنے اور کڑکڑاتی ٹہنیاں۔ اور جیسا کہ ہوتا ہے مجھے فیری میڈو کی عادت ہو گئی اس پہاڑی پر ایستادہ خیمے، قریب پڑے درخت کے تنے، رائے کوٹ گلیشیئر میں پوشیدہ دریا کی آواز اور نانگا پربت کی صبح اور دوپہر اور شام کی عادت ہو گئی....

اور جب عادت ہو جاتی ہے تو اس سے اگلے روز کوچ کرنا ہوتا ہے۔

جسے عادت ہو جائے وہ خانہ بدوش نہیں رہتا.... اس کے خیمے کے آس پاس گھاس بلند نہیں ہونی چاہئے.... تو اگلے روز رحمن اور قدم خان نے آنا تھا اور ہمیں فیری میڈو سے کوچ کرنا تھا۔

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



ہماری آخری شام کی دھوپ تھی جو ڈھل رہی تھی اور ہم اپنے خیموں سے باہر بیٹھے نانگا پربت کو دیکھتے تھے اور ہمارے دل میں اس ظالم پہاڑ کے لئے بھی نرم گوشہ پیدا ہوتا تھا اور ہم بچھڑ جانے سے پیشتر والی اداسی کا شکار ہوتے تھے۔ شام گہری ہونے لگی تو گاڈفرے نے آگ جلائی اور ہمارے آخری کھانے کا بندوبست کرنے لگا... لکڑیوں کا دھواں اس تازہ اور تیز سرد ہوا میں نتھنوں میں جاتا تھا تو بھلا لگتا تھا...

نیچے سے کچھ لوگ اوپر آ رہے تھے... رحمت نبی' مارتا' ارسلا' رولینڈ اور کچھ کوہستانی اور کچھ آسٹرین بوڑھے...

"تم نے کہا تھا ناں کہ کبھی ہماری پہاڑی پر آنا..." مارتا ہانپتی ہوئی میرے پاس بیٹھ گئی... "اوہ مائی گاڈ... تم درست کہتے تھے... یہاں سے تو نانگا پربت... تم درست کہتے تھے..."

گاڈفرے نے ایک اچھے باورچی کی طرح مہمانوں کے لئے جلدی سے کافی بنا لی... اور جو کافی نہیں پیتے تھے ان کے لئے بسکٹ...

"تیمور خان تو ابھی نہیں آیا؟" رحمت نبی نے مجھ سے پوچھا "وہ آپ کے لئے مارخور شکار کرنے گیا ہوا ہے..."

"کیا واقعی ادھر مارخور ہے؟"

"ادھر برزل پاس میں تو اب بھی ہے..." رحمت نبی کہنے لگا... "لیکن پہلے ہمارے دادا کے زمانے میں ادھر بھی بہت تھا... میرے پردادا جن کا نام خوش ملک تھا ادھر شکار کرنے آئے تھے... وہ چلاس کی جانب سے گونر فارم کے راستے ادھر آئے... اور پہلی بار سامنے والی پہاڑی پر پہنچے اور انہوں نے نیچے دیکھا تو نیچے... یہ فیری میڈو تھا۔ اس میں لمبی لمبی گھاس تھی اور گھاس میں جلی ہوئی سیاہ لکڑیاں تھیں جو کسی مسافر نے شاید رات گزارنے کے لئے جلائی تھیں... پھر تارڑ صاحب وہ سیاہ لکڑیاں حرکت میں آ گئیں... کیونکہ وہ تو بہت سارے مارخوروں کے سینگ تھے جو گھاس میں بیٹھے تھے اور اوپر سے ان کے صرف سینگ نظر آتے تھے... مارخور اٹھے اور ادھر جنگل میں چلے گئے' پورا ریوڑ... پردادا خوش ملک کو ایسی چراگاہ کی تلاش تھی جہاں کچھ میدان ہو پانی ہو... انہوں نے واپس جا کر برطانوی حکومت سے اجازت لی اور اس زمین کا مالیہ دے کر اسے اپنی چراگاہ بنا لیا..."



"اور اب سنا ہے کہ فیری میڈو میں ایک ہوٹل بن رہا ہے... شنگریلا قسم کا... یہ پہاڑی جس پر ہم بیٹھے ہیں فروخت ہو چکی ہے..." مارتا نے سر جھٹک کر کہا اور بہت بے بسی سے کہا "آپ لوگ ایسا کیوں کرتے ہو؟ اور یہ بھی سنا ہے کہ آپ جنگل فروخت کر رہے ہیں... جب سڑک بن جائے گی تو یہ جنگل کٹ جائے گا اور بقول ڈاکٹر گارنر اگر جنگل کٹ گیا تو فیری میڈو ختم ہو جائے گا اور یہاں سیلاب کے پانی آ جائیں گے..."

"لوگوں کو روزگار ملے گا۔ ترقی ہو گی... کیوں تارڑ صاحب آپ کا کیا خیال ہے؟"

"ترقی تو ہونی چاہئے..." میں نے بھی بے بسی سے کہا "لیکن زمین پر کچھ جگہیں تو ایسی ہونی چاہئیں جہاں خانہ بدوش جا سکیں... اور اگر فیری میڈو نہ ہو گا تو خانہ بدوش کہاں جائیں گے..."

تاریکی گہری ہونے لگی تو مطیع لالٹین جلا کر لے آیا اور اسے ہمارے درمیان رکھ دیا...

ارسلا جو ہمیشہ چپ بیٹھی رہتی تھی ذرا جھجک کر بولی "میں نے سنا ہے کہ نانگا پربت کے علاقوں میں برف کے انسان بھی ہوتے ہیں... کیا یہ سچ ہے؟"

"اگر یہ سچ ہے تو بھی کوئی کچھ نہ کہے کیونکہ تھوڑی دیر میں تو آپ چلے جائیں گے اور ہمارے لئے فیری میڈو میں اپنی آخری رات گزارنا مشکل ہو جائے گا... برف کے انسان غالباً خاصے خونخوار ہوتے ہیں..." مطیع ہنسنے لگا۔ وہ یوں بھی مارتا کی موجودگی میں کچھ زیادہ ہنستا تھا۔

"کیوں چاچا..." رحمت نبی نے اپنے چاچا کی طرف دیکھا...

"ہاں..." چاچا نے سر ہلایا... "ہوتا ہے..."

"ہیں" ارسلا خوفزدہ ہو گئی "واقعی ہوتا ہے؟"

"کدھر ہوتا ہے بھئی؟" مطیع کی ہنسی منجمد ہو گئی... مجھ پر بھی کچھ کپکپی سی طاری ہو گئی۔

"اس کو ہم برہنڈو کہتے ہیں... بن مانس کی طرح ہوتا ہے۔ ہمارے دادا کا اس سے لڑائی ہوا تھا... ادھر فیری میڈو میں... ہمارے دادا کا بندوق ٹوٹ گیا تھا... بہت لوگوں نے ادھر سے دیکھا... انہوں نے سمجھا کہ شاید دو بڑے کتے لڑ رہے ہیں... ہاں

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



برفنڈو تو ہوتا ہے..."

"اس کی کچھ تفصیل بتائیں..." میں نے چاچا سے پوچھا...

"نہیں نہیں تفصیل نہیں چاہئے..." مارینا ہاتھ اٹھا کر بولی "اس وقت نہیں... اگرچہ مجھے یقین ہے کہ سنو مین کا وجود نہیں ہے لیکن ان ہمالین علاقوں کا کچھ پتہ نہیں..."

"آپ یہاں الاؤ کیوں نہیں روشن کرتے؟" رحمت نبی کہنے لگا "چلو بھئی سب لوگ اپنے حصے کی لکڑی لے کر آئیں..."

اور حیرت انگیز حد تک لکڑی بے حد خشک تھی اور چند لمحوں کے اندر ہمارے خیموں کے سامنے الاؤ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اور اس کی روشنی میں ہمارے چہرے تمتما رہے تھے... مطیع بڑے بڑے تنے کھینچتا ہوا لا رہا تھا اور الاؤ کی بلندی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا... آس پاس جو کچھ دکھائی دیتا تھا وہ آگ نے ختم کر دیا اور اب ہمارے چہرے تھے جو چمکتے تھے...

"ہوا کے رخ کا دھیان رکھنا کہیں خیمے زد میں نہ آ جائیں..." کسی نے کہا...

تاریکی میں سے یکدم کچھ سامنے آ گیا... مارینا اور ارسلا نے ہلکی سی چیخیں ماریں اور ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ ہمارے سانس بھی نیچے کے نیچے اور اوپر کے اوپر' کیونکہ سنو مین کی دہشت ہم میں تھی۔ لیکن یہ تیمور خان تھا... تھکا ہوا اور پژمردہ... اس کا بھائی بھی ہمراہ تھا۔ وہ ہمارے قریب آ کر بیٹھ گئے "نہیں ملا سور کا بچہ..." تیمور نے زمین پر تھوکا "ہم صبح چلے اور رات کو ادھر برزل پاس کی چٹانوں پر پہنچے... رات آگ جلا کر بیٹھے اور صبح سویرے پورے سات مارخور دیکھے... ہمارے سامنے تھے پر ہاتھ نہیں آئے... جتنی دیر میں نشانہ لیا وہ غائب ہو گئے۔ بہت تلاش کیا یارا... فکر نہ کرو ہم پھر جائے گا اور تم کو ضرور مارخور کھلائے گا..."

"ہم تو صبح جا رہے ہیں تیمور..."

"پر کیوں یارا... یہ اچھا جگہ ہے ادھر ٹھہرو..."

خیموں کے پیچھے جو بڑا تنا تھا جس کے ساتھ ٹیک لگا کر ہم بیٹھتے تھے' منہ ہاتھ دھوتے تھے اور ہوا سے بچاؤ کر کے چولہا جلاتے تھے مطیع اس تنے کو الاؤ تک لانے کی کوشش کر رہا تھا...

"نہیں مطیع... اسے رہنے دو... ہمارے بعد کوئی اور بھی تو آئیں گے... اسے



رہنے دو"

الاؤ سے ذرا پیچھے ہٹتے تو شدید سردی کا احساس ہوتا...

"تارڑ صاحب نانگا پربت کی دوسری جانب ایک وادی ہے۔ وادی ء روپل... اور ایک وسیع میدان ہے لاتوبو... چوٹی کے عین نیچے' وہ بھی بے حد خوبصورت ہیں... کبھی ادھر بھی جایئے گا..." رحمت نبی اٹھتے ہوئے بولا "صبح ملاقات ہو گی..."

اور وہ اپنے چاچا کے ہمراہ نیچے اترنے لگا... باقی لوگ بھی رخصت ہونے لگے... تھامس اور مشائلہ اپنے خیمے میں جا چکے تھے۔ مطیع بھی اٹھا اور خیمے میں چلا گیا... میں گھٹنوں پر سر رکھے آگ میں دیکھتا رہا۔ الاؤ مدھم ہونے لگتا تو میں اس میں مزید لکڑی ڈال دیتا...

آواز صرف لکڑی کے جلنے کی تھی' پوشیدہ دریا کی تھی اور تیز ہوا کی تھی...

یکدم دریا رک گیا اس کا شور ختم گیا۔

"مستانسر..." گاڈفرے نے پکارا۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر کھلی فضا میں اپنے سلیپنگ بیگ میں لیٹا ہوا تھا "الاؤ میں مزید لکڑی نہ ڈالنا۔ آگ کی روشنی ہوتی ہے تو مجھے ستارے نظر نہیں آتے..."

چونکہ شدید سردی تھی اس لئے الاؤ بڑی تیزی سے ٹھنڈا ہونے لگا... ہمارے آس پاس اندھیرا ہوا تو نانگا پربت کی سفیدی کچھ کچھ دکھائی دینے لگی...

اوپر آسمان پر ستارے نظر آنے لگے...

---

نیچے زمین پر فیری میڈو کا راستہ نظر آ رہا تھا۔

دو پہاڑوں کے درمیان جو لکیر تھی وہ تاتو نالہ تھا جس کے آخر میں رائے کوٹ گلیشیر لیٹا تھا اور اس پر نانگا پربت سایہ فگن تھی...

رائے کوٹ گلیشیر پر ایک سرسبز حصہ جھکا دکھائی دیتا تھا جو فیری میڈو تھا اور یہیں دو برس پیشتر اپنے قیام کی آخری رات ہم نے ایک الاؤ روشن کیا تھا اور گاڈفرے نے کہا تھا اسے بجھا دو مجھے ستارے نظر نہیں آتے...

ہمارا فوکر طیارہ اسلام آباد سے گلگت جا رہا تھا اور ہم اس وقت دریائے سندھ کے اوپر پرواز کرتے ہوئے رائے کوٹ پل کے قریب آ چکے تھے اور میں نے واضح طور پر اس سپاٹ کی نشاندہی کی جہاں پل کے پہلو میں ریتلی زمین پر دو برس پیشتر میں

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



نے اور مطیع نے اپنا خیمہ نصب کر کے رات گزاری تھی۔

میں ایک بار پھر دیوسائی میدان عبور کرنے کی غرض سے گھر سے نکلا تھا۔

اور اس سفر میں میرا چھوٹا بیٹا سمیر اور میرا مصور دوست منصور راہی تھے۔۔۔

اور ہم فیری میڈو کے اوپر سے گزر رہے تھے۔

اور نانگا پربت کی بلندی جیسے جہاز کو چھونے کو آتی تھی، ہم بے حد نزدیک تھے۔۔۔ میں اور سمیر طیارے کی چھوٹے سے کاک پٹ میں جھکے ہوئے کھڑے تھے اور ہم گلگت جا رہے تھے۔

# دُوسرا سفر

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



## "گلگت گیم"

نیچے زمین پر فیری میڈو کا راستہ نظر آ رہا تھا۔
یہیں دو برس پیشتر' اپنے قیام کی آخری رات ہم نے ایک الاؤ روشن کیا تھا اور گاڈفرے نے کہا تھا' اسے بجھا دو مجھے ستارے نظر نہیں آتے۔۔۔
دو برس پیشتر۔۔۔
اور اب نانگا پربت کی بلند ترین چوٹی جیسے جہاز کے پر کو چھونے آتی تھی ہم بے حد نزدیک تھے اور کاک پٹ میں جھکے ہوئے کھڑے تھے اور ہم گلگت جا رہے تھے۔
اور وہاں سے استور۔ ترشنگ۔ وادی روپل اور نانگا پربت کی روپل سائڈ۔۔۔ اور پھر وہاں سے دیوسائی کے میدان عبور کر کے سکردو۔۔۔ کم از کم ہماری منصوبہ بندی تو یہی تھی۔۔۔ اور اس بار میں نے خصوصی طور پر اگست کے آغاز کا چناؤ کیا تھا کہ ان دنوں بہر صورت دیوسائی کی برفیں پگھل جاتی تھیں۔۔۔۔
کیپٹن زبیر کا کہنا تھا کہ ایک مرتبہ دیوسائی میدان کے اوپر پرواز کرتے ہوئے میں نے ایک حیران کر دینے والا منظر دیکھا۔ دیوسائی کی ایک جھیل اوپر سے اتنی شفاف اور صاف تھی کہ اس کے پانی دکھائی نہ دیتے تھے اور جھیل کی تہہ اور کنارے بالکل خالی نظر آتے تھے۔
اس دیوسائی پر دھوپ نکلے تو گرمی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اور اگر دھوپ کے آگے چھوٹا سا بادل آ جائے تو اس کے سائے میں درجہ حرارت منفی ہو جاتا ہے۔۔۔۔
دو برس پیشتر اس عظیم میدان نے مجھے راستہ نہیں دیا تھا کہ اس راستے کی برفیں جولائی کے آخر تک نہیں پگھلی تھیں۔۔۔ اور اب تو اگست کا آغاز تھا۔۔۔ وہاں میرے لیے راستہ ہو گا۔۔۔

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



اس سفر میں میرے ساتھی نظامی اور خان کی بجائے میرا چھوٹا بیٹا سمیر اور مصور منصور راہی تھے۔۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں ایک ایسے جہاز میں سوار ہوں جو صاف موسموں میں گلگت کی جانب پرواز کر رہا ہے۔۔ ہر مہماتی سفر کی طرح اس سفر کی منصوبہ بندی اور تیاری پر بھی بہت پسینہ بہا تھا' بہت دنوں سے مشقت ہو رہی تھی۔۔ صبح کی نشریات سے رخصت کا بندوبست۔ رک سیک۔ سلیپنگ بیگ۔ کھانے پینے کا مکمل انتظام۔ راستے کے بارے میں معلومات اور ان کے سوا ایک ہزار ایک باتیں۔۔ سوال اور ان کے جواب جو کبھی ملتے اور کبھی نہ ملتے۔۔ گلگت کے لیے نشستیں پی آئی اے کے ناردرن ایریا دفتر سے بک ہوتی ہیں۔۔۔ وہاں زیدی صاحب نے فوری طور پر نشستوں کا انتظام کر دیا اور کہنے لگے "اب آپ موسم کے ہاتھ میں ہیں۔۔۔ کتنے دن سے فلائٹ نہیں گئی۔۔۔ شاید اس روز چلی جائے۔۔" پھر کچھ سوچ کر مسکرائے "ویسے تمام آوارہ گردوں کے چہرے ایک جیسے ہوتے ہیں۔۔۔ پر شوق اور تمتماتے ہوئے۔۔۔ پی آئی اے میں بھی ایک پائلٹ ہیں زبیر۔۔۔ وہ بھی پہاڑوں میں دھکے کھانے کے بڑے شوقین ہیں۔۔۔ پچھلے دنوں دیوسائی میدان بھی گئے تھے۔۔"

دیوسائی کا نام سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔۔۔ میری فرمائش پر زیدی صاحب نے زبیر صاحب کو فون کیا' معلوم ہوا نماز پڑھ رہے ہیں۔۔۔ شام کو ہوٹل پہنچ کر میں نے پھر کوشش کی۔۔۔ زبیر صاحب سے بات ہوئی۔۔۔ کہنے لگے' چند روز ٹھہر جائیں تو میں پھر جانے کو تیار ہوں۔۔۔ اگلے پانچ روز روزانہ زبیر صاحب سے گفتگو ہوئی اور ان کی پہاڑوں میں آوارہ گردی کے حوالے سے ہوئی۔۔۔ (اگست ۱۹۸۸ء میں پی آئی اے کا ایک فوکر جہاز گلگت سے اسلام آباد آتے ہوئے نانگا پربت اور دیوسائی کے علاقوں میں لاپتہ ہو گیا۔ کیپٹن زبیر اس جہاز کے پائلٹ تھے۔)

اور سمیر کے ساتھ میرا وعدہ تھا کہ جب وہ آٹھویں جماعت میں جائے گا تو میں اسے اپنے ہمراہ ٹریکنگ پر لے جاؤں گا اور اب وہ نویں جماعت کا طالب علم تھا۔۔۔ مجھ سے زیادہ بلند ہو چکا تھا۔۔۔ منصور راہی بھی پہاڑوں کا ڈسا ہوا تھا۔۔۔ صبح کی نشریات میں بچوں کو مصوری سکھاتا تھا۔۔۔ بنگالی تھا لیکن ایک نستعلیق لکھنوی انداز کی خاتون سے شادی شدہ تھا اور ہر سانس کے ساتھ اس کے نام کی مالا جپتا تھا۔۔۔ اگر آپ اس سے پوچھیں کہ راہی آج موسم کیسا ہے تو وہ اپنی معصوم مسکراہٹ کے ساتھ کہے گا۔۔۔۔ باجرہ! اور آج موسم بہت برا تھا۔۔۔

ہماری فلائٹ ساڑھے دس بجے صبح تھی ۔۔۔ ہمارے رک سیک ٹیلی ویژن کی سوزوکی وین میں پڑے تھے اور میں پورے پاکستان کو "السلام و علیکم خواتین و حضرات



اور صبح بخیر سارے پاکستان اور پیارے پاکستان" کہہ رہا تھا اور اس وقت پورے سات بجے تھے اور ہم سٹوڈیو میں بھیگتے ہوئے پہنچے تھے اور ابھی تک چھما چھم بارش برس رہی تھی ۔۔۔ اور میں بے حد گھبرایا ہوا تھا۔ اگر آج فلائٹ نہ گئی تو کیا ہو گا۔۔۔۔ میرے پاس بے حد مختصر وقت تھا۔ چند روز مری جان صرف چند روز اور ان میں جتنے دن کم ہوں گے اتنے ہی سانس کم ہوں گے ۔۔۔ میں اگلا پروگرام اناؤنس کرتا اور جب پروگرام آن ائیر جاتا تو میزبان کی کرسی چھوڑ کر گلے میں سے مائک اتار کر بھاگتا ہوا سٹوڈیوز سے باہر جاتا اور اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکتا۔ باہر بارش اور تیز بارش۔ اور میں مایوسی میں نچڑتا ہوا پھر واپس آ جاتا اس یقین کے ساتھ کہ نہیں آج نہیں ۔۔۔ پروگرام کا اختتام ہوا تو میں نے ناظرین کو اپنے سفر کے بارے میں بتایا اور "آپ کے لیے اور پورے پاکستان کے لیے ایک خوش نصیب دن کی خواہش کے ساتھ" اجازت لے کر سٹوڈیوز سے باہر آ گیا۔۔۔ بارش رک چکی تھی لیکن بادل ابھی تک گھنے تھے ۔۔۔

ایئرپورٹ لاؤنج میں ایک ایئر ہوسٹس میرے پاس آئی "تارڑ صاحب میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟"

"آپ میرے لیے دعا کر سکتی ہیں" میں نے سر ہلا کر کہا "یہ دعا کہ آج گلگت کی فلائٹ چلی جائے"

"ابھی تو بادل ہیں اور گلگت کی فلائٹ ۔۔۔ خیر میں دعا کروں گی۔۔" وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی اور اسی لمحے سلمان رشید وارد ہو گیا "السلام و علیکم بھائی جان۔۔۔ میں سلمان رشید ہوں"

"اچھا؟" میں نے ایک بوسیدہ مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا۔ میں اس قسم کے کرداروں سے سخت بیزار تھا جو فی الفور فری ہو جاتے ہیں اور آپ کو بھائی جان۔ چاچا جی۔ بابا جی وغیرہ بنا لیتے ہیں ۔۔۔۔ یہ صاحب ایک چیک شرٹ اور جین کے علاوہ ایک بہت بڑی مسکراہٹ میں ملبوس تھے "میں بھی گلگت جا رہا ہوں"

"ہوں!" اور میں نے سر ہلایا "اگر فلائٹ گئی تو۔۔"

"بھائی جان فلائٹ جائے ہی جائے" اس نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔

"ہو نہ جائے ہی جائے" میں نے اتنی ہی بے یقینی کے ساتھ کہا اور اسی وقت لاؤنج کے بڑے شیشوں میں سے میں نے دیکھا کہ ایک موٹر ٹرالی سامان سے بھری ایک جانب کھڑے فوکر جہاز کی طرف چلی جا رہی ہے۔ اور اس پر ہمارے نیلے اور سرخ رک سیک رکھے ہوئے ہیں۔ اگر سامان لد رہا ہے تو فلائٹ جا رہی ہے۔۔

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



"مبشر کا کیا حال ہے؟" اس کردار سلمان رشید نے پوچھا "بھائی جان ہم دونوں کاکول اکیڈمی میں اکٹھے تھے۔ آج کل کہاں ہے؟"

"میجر مبشر؟۔۔۔ وہ ان دنوں ترکی کی پہاڑیوں میں ہے۔ لیکن آپ۔۔۔"

"میں نے آرمی چھوڑ دی ہے کیونکہ مجھے آوارہ گردی کا شوق ہے بھائی جان۔۔۔" سلمان رشید کی شکل سے بالکل یہ مترشح نہیں ہوتا تھا کہ وہ کبھی آرمی ڈسپلن کا بھی پابند رہا ہے۔ "مجھے یاد ہے کہ میں نے کامیو کی پہلی کتاب مبشر سے لے کر پڑھی تھی اور اس پر آپ کا نام لکھا تھا"

"لیکن تم اب کیا کرتے ہو؟"

"آوارہ گردی بھائی جان۔ گلگت سے میں سکردو جاؤں گا ایک ٹریک پر۔۔۔ اور پھر اخباروں میں سفرنامہ لکھ کر روزی کماؤں گا۔ بس میں اور کچھ نہیں کرتا"

لاؤنج میں نصب شدہ سپیکرز میں کچھ گونج سی پیدا ہوئی اور پھر وہ اعلان سنائی دیا جو ہم سنا چاہتے تھے "خواتین و حضرات گلگت کے لیے ہماری پرواز روانگی کے لیے تیار ہے ۔۔۔ آپ سے التماس ہے کہ گیٹ نمبر ۲ سے جہاز پر تشریف لے جائیں اور لاؤنج سے نکلتے ہوئے اپنے سگریٹ بجھا دیں۔۔۔ شکریہ"

جیٹ ہوائی جہازوں کے بعد فوکر طیارہ ایک کھلونا ہے۔۔۔ ایک ایسا کھلونا جو ہمیں بچپن میں لے جاتا ہے جب جادوئی قالین آسمانوں پر اڑتے ہیں اور ہم ان پر سوار حیرت سے دنیا کو گزرتا دیکھتے ہیں۔

راہی مسلسل کیمرے سے آنکھ لگائے تصویریں اتار رہا تھا۔ سمیر کے چہرے پر وہ مسرت اور حیرت تھی جو پہلی پرواز کے دوران ہر چہرے پر ہوتی ہے۔ جہاز اڑا اور مرگلہ کی پہاڑیوں کو عبور کر کے تھوڑی دیر کے لیے جانی پہچانی لینڈ سکیپ سے گزرا اور پھر ہمارے نیچے قراقرم اور ہمالیہ کے برف زار تھے۔۔۔

ہماری درخواست پر ہمیں کاک پٹ میں بلا لیا گیا۔ یہ اتنا چھوٹا تھا کہ ہم جھک کر بمشکل اپنے آپ کو اس میں قائم رکھتے تھے۔ صرف ایک شخص ذرا اونچا ہو کر پائلٹ کے کندھے پر سے جھانک کر اس منظر کو دیکھ سکتا تھا جو شاید وہاں نہ تھا بلکہ کہیں اور کسی اور دنیا اور کائنات اور سیارے میں تھا یا شاید کوئی فلم تھی یا سوتے جاگتے میں کوئی لمحہ تھا یا موت کے بعد کوئی وادی تھی جو بند آنکھوں کے اندر تھی اور جو کوئی اس وادی کو دیکھتا تھا واپس نہیں جا سکتا تھا۔۔۔ ہم ایک اڑن کھٹولے پر سوار اس وادی میں خاموشی سے تیرتے تھے جہاں کوئی نہ تھا۔ برف تھی' برف کے راستے اور جھیلیں تھیں اور ہیبت ناک خاموشی تھی۔ کوئی اور سیارہ تھا جس پر ہمیں اترنا تھا اور



ہم زمین سے کروڑوں کلومیٹر دور آ چکے تھے۔ صرف پنکھے کی ایک مدھم شور کرتی آواز تھی اور جہاز کا ایک ونگ تھا جو ہمارے ساتھ ساتھ تھا۔ ہم ان پہاڑوں کے اوپر ہوئے جن کی چوٹیوں سے برف کی لکیریں نیچے اترتی تھیں اور وہاں ایک بڑی جھیل تھی جو سیف الملوک تھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ سیف الملوک ہے لیکن اس بلندی سے وہ ہمارے لیے کوئی اور جھیل تھی۔ کسی خلاء میں' کسی خیال میں ایک نیلگوں عکس۔

پھر بابو سر ٹاپ۔۔۔ اور ہارس شو لیک کیونکہ یہ گھوڑے کے نعل کی شکل کی ہے ۔۔۔

"اوئے ابو میں نے ہارس شو لیک نہیں دیکھی' کہاں ہے؟" سمیر چونک کر بولا۔

"۔۔۔ آپ دیکھیں گے بیٹے۔" پائلٹ نے پیار سے کہا اور پھر خصوصی طور پر جہاز کو ذرا ڈائیو کر کے اس زاویے پر لے گیا جہاں سے سمیر اس جھیل کو دیکھ سکتا تھا۔

"دیکھ لی؟" پائلٹ نے پوچھا۔

"تھینک یو انکل۔۔۔"

اور پائلٹ نے جہاز کو پھر سے سیدھا کر لیا۔

سلیپنگ بیوٹی ہماری جانب آ رہی تھی۔۔۔

برف پوش چوٹیوں کا ایک سلسلہ جو کسی برہنہ حسن خوابیدہ سے مشابہ تھا۔۔۔ برف کی ایک عورت۔۔۔ جو یقیناً بے حد ٹھنڈی تھی۔۔۔ اسی لیے تو ابھی تک ویسی کی ویسی ہی لیٹی ہوئی تھی۔۔۔۔ اس کا سینہ اور ٹھوڑی بے حد نمایاں تھے۔۔۔۔۔۔ نیچے دو الگ تھلگ اور ویران جھیلیں تھیں جن پر سے جہاز پرواز کر رہا تھا۔

"ان کا کیا نام ہے" سمیر نے پائلٹ سے دریافت کیا۔

"ان کا کوئی نام نہیں"

"یہاں لوگ جاتے ہوں گے؟"

"نہیں۔ ان تک جانے کا کوئی راستہ نہیں"

"کوئی تو ہو گا" سمیر نے بے یقینی سے سر ہلایا۔ اور مجھے اس میں اپنا آپ نظر آیا۔

موسم حیرت انگیز طور پر صاف اور دور دور تک چمکتا تھا۔۔۔ پائلٹ نے اصرار کیا کہ ہم گلگت لینڈ کرنے تک کاک پٹ میں ہی ٹھہرے رہیں۔۔۔ اس چھوٹے سے کاک پٹ میں جہاں دو آدمی بمشکل بیٹھے ہوئے تھے اور ہم دونوں بمشکل اپنے آپ کو اس کے اندر رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔۔۔۔۔۔ دنیا کا وسیع ترین کوہستانی سلسلہ نظر آ رہا تھا جو ہمارے آس پاس سرکتا چلا جاتا تھا۔ پائلٹ نے ایک گیئر نما شے دبا کر

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



جہاز کو قدرے بلند کیا' سامنے کا منظر قدرے نمایاں ہوا "میرا خیال درست ثابت ہوا ہے آج کے ٹو نظر آ رہی ہے۔ ذرا غور سے دیکھنا ہو گا' فاصلہ بہت ہے"

خاموش پہاڑوں سے پرے جہاں بہت برف تھی اور نیچے بادل تھے اور اوپر سو فیصد نیلا اور کھلا اور خالی آسمان' وہاں بہت ساری چوٹیوں میں سے ایک کے ٹو یا شاہ گوری تھی ..... کونسی ؟.....وہ جس کے اوپر ایک موہوم سا زرد بادل کبھی نظر آتا ہے اور کبھی نہیں آتا۔ کے ٹو بقیہ چوٹیوں کی طرح نظر نہیں آتی تھی بلکہ کچھ آپ کے تخیل میں اس کی تمام تر تصویریں جو تھیں وہ باری باری دکھائی پڑتی تھیں اور کبھی اس کی ہلکی زرد شبیہہ کا دھوکہ سا ہوتا تھا۔ البتہ مشہور چوٹی براڈ پیک واقعی بے حد چوڑی تھی اور صاف ابھرتی تھی۔ گیشربرم سلسلے کی چوٹیاں بھی نظر آ رہی تھیں اور راکاپوشی چونکہ قریب ترین تھی اس لیے وہ برف ہی برف تھی۔ جہاز کا زاویہ ذرا سا بدلا تو کے ٹو واقعی نظر آ گئی اور یہ ہماری خوش بختی تھی کیونکہ فلائٹ کے دوران بہت کم لوگوں نے اسے دیکھا تھا بلکہ ایک ماہ کی مشقت اور کوہ پیمائی کے باوجود بے شمار کوہ پیما برے موسم کی وجہ سے اس کی شکل دیکھے بغیر واپس آجاتے ہیں۔ اور ہم نے اس کی خواہش نہیں کی تھی اور یہ نظر آ گئی.....اہرام نما کے ٹو جو دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی ہے۔

"گلگت اب زیادہ دور نہیں.....ہم اس وقت چلاس کے اوپر ہیں....."پائلٹ نے بتایا۔

نیچے دریائے سندھ کا بل کھاتا ہوا وجود پہاڑوں میں بند تھا۔

.......جہاز ذرا ترچھا ہوا اور پھر.....نیچے زمین پر فیری میڈو کا راستہ نظر آ رہا تھا۔

یہیں دو برس پیشتر.....اپنے قیام کی آخری رات ہم نے الاؤ روشن کیا تھا اور گاڈفرے نے کہا تھا "اسے بجھا دو مجھے ستارے نظر نہیں آتے.....دو برس پیشتر.....بولڈر رج ہمارے عین نیچے تھی اور یہیں کہیں میں اور خان گری اور چڑھائی کی شدت سے بوکھلائے ہوئے ایک ایسے ہی جہاز کو دیکھتے تھے۔ تاتو نالہ رائے کوٹ گلیشیئر سے چلتا آ رہا تھا اور دریائے سندھ میں گم ہو رہا تھا۔ نانگا پربت کی پوری برفیلی کائنات دائیں ہاتھ پر تھی اور اس کے دامن میں فیری میڈو تھا.....فیری میڈو ادھر تھا اور اس بار ہم نے نانگا پربت کی دوسری جانب ادھر جانا تھا اور وہ رخ یہاں سے نظر نہیں آتا تھا۔

جہاز نیچے ہونے لگا۔۔۔ وادیء گلگت کے سبز ٹکڑے دریائے گلگت کے آس پاس تھے اور قریب ہو رہے تھے۔ ہم اپنی نشستوں پر واپس چلے گئے..... جہاز ایک چٹان کی



جانب جا رہا تھا..... نیچے شاہراہ ریشم پر دو کاریں رینگ رہی تھیں' لگتا تھا کہ چٹانوں کے ساتھ چیونٹیاں چپٹی ہوئی ہیں۔ جہاز نے ایک دھچکے کے ساتھ اپنے پہیے نکالے.....اور چند لمحوں میں ہم گلگت کی زمین کو چھو رہے تھے۔

ماؤنٹ بلور ہوٹل' گلگت کے مین بازار میں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں ہے۔ بلکہ وہاں ہے جہاں ایک پوشیدہ پر سکون پرانی رہائش گاہ ہے جس کے آس پاس ایک نیم ویران باغ ہے اور جہاں سیب اور اخروٹ کے درخت ہیں۔ اس کا ماحول گلگت سے الگ اور کٹا ہوا ہے.....پتھریلی دیواروں پر جنگلی گلاب کی بیلیں چھائی ہوئی ہیں اور گھاس کو ایک عرصے سے کاٹا نہیں گیا۔ البتہ یہاں کے بستر صفائی کے کسی مقابلے میں کسی قسم کی پوزیشن حاصل نہیں کر سکتے.....لیکن یہاں ایک ایسا ٹھہراؤ ہے' ایسی سستی ہے کہ انسان کسی اور جگہ جانے کے قابل نہیں رہتا.....برآمدے میں نہایت قدیمی صوفوں کے ڈھانچے ہیں جن پر اب بھی تھوڑی بہت کوشش سے بیٹھ جانا ممکن ہے۔ یہاں کے ویٹر بھی خاموش اور دھیمے ہیں۔ راہبر حسن منیجر ہیں اور انہیں مسکرانے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں.....

اور یہاں ایئرپورٹ سے آنے کے بعد منظر کچھ یوں تھا کہ سیر باغ میں خیمہ زن چند انگریز یا آئرش یا سکاٹش قسم کے سیاحوں کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔ راہی بستر پر لیٹا یوگا کی کسی مشق میں مگن تھا۔ سلمان سو رہا تھا اور خراٹے لے رہا تھا اور میں برآمدے کے قدیمی صوفے پر براجمان اپنے اندر بے حد خوش تھا کہ مجھے وہ کچھ مل رہا تھا جو میرے دل کی خواہش تھی.....

گلگت ایک ایسا شہر ہے جس کے درودیوار میں صرف کوہ پیمائی اور ایڈونچر کی کہانیاں ہیں اور جہاں سے نامعلوم وادیوں اور دور افتادہ پہاڑی سلسلوں کے لئے بے شمار راستے نکلتے ہیں۔۔۔ یہ کیسا عجیب احساس تھا کہ ابھی صرف ساڑھے تین گھنٹے پیشتر میں ایک انتہائی میکانکی زندگی کا بے بس پرزہ تھا' ٹیلی ویژن سٹوڈیوز میں ایک روبوٹ تھا اور اب۔۔۔ میں آزاد تھا اور گلگت میں تھا اور مجھے روپل جانا تھا اور روپل کو کون جانتا ہے اور میں نے اسے جانا تھا۔۔۔ اور پھر دیوسائی میدان..... زندگی اس سے زیادہ بامقصد نہیں ہو سکتی تھی' وہ زندگی جسے میں زندگی کہتا تھا.....

راہی جو خاصی دیر سے مردوں کی طرح بے حس و حرکت ٹانگیں اور ہاتھ پھیلائے لیٹا ہوا تھا یکدم چھلانگ لگا کر اٹھ بیٹھا "میں تیار ہوں"

اس پر سلمان بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا "بھائی جان کیا ہوا؟"

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



"یہ تیار ہے ـــ" میں نے کہا "کس چیز کے لئے تیار ہے یہ تم خود پوچھ لو"

"کیوں راہی صاحب؟"

"میں اب مولی ٹماٹر اور پیاز کا سینڈوچ کھانے کو تیار ہوں ـــ یہ دیکھو" اس نے بستر کے نیچے سے ایک شاپنگ بیگ نکال کر اسے بستر پر الٹ دیا اور متعدد ٹماٹر پیاز اور مولیاں وغیرہ ادھر ادھر لڑھک گئے ـــ "ڈبل روٹی بھی ہے ـــ ڈبل روٹی کے ساتھ ٹماٹر کھاؤ' ایسا کھانا تمہیں پورے گلگت میں نہیں ملے گا ـــ"

"یقیناً نہیں ملے گا ـــ"

راہی صاحب نے تقریباً زبردستی سب حضرات کو ایک ایک سلائس اور مولی یا چھلا ہوا پیاز تھما دیا ـــ اور ہم قدرے آبدیدہ ہو کر اس سینڈوچ کو کھانے لگے ـــ آئندہ چند دنوں میں راہی نے مجھے اپنی خوراک کی عادت سے بے حد حیران کیا ـــ وہ بے حد سادہ غذا کھاتا تھا' کچی سبزیاں' ابلے ہوئے چاول اور دال ـــ اور بس ـ

گلگت کے اس پہلے لنچ سے ہماری تشفی نہ ہوئی اور میں اور سمیر ہوٹل سے باہر آ گئے اور نزدیکی بیکری سے کچھ مقامی کیک خرید کر اپنا پیٹ بھرا ـــ بیگ صاحب کی دوکان بھی یہاں سے بالکل قریب تھی ـــ جی ایم بیگ میرے لیے گلگت کا دوسرا نام تھے ـ ایک ایسا شخص جسے میں دوست کہہ سکتا تھا ـــ نہ صرف وہ بلکہ جس ماحول میں وہ بیٹھتے تھے وہ بھی میرے لیے کشش رکھتا تھا ـــ طرح طرح کے نوادرات ـ نقشے ـ کوہ پیمائی کے روٹ ـ چینی ہینڈی کرافٹ ـ چترالی قالین اور ان کے درمیان بیگ صاحب سنہری مسکراہٹ کے ساتھ سینے پر ہاتھ باندھے سرہلاتے ہوئے ـــ اور اس دوران غیر ملکی گاہک اور دوست جو کوہ پیمائی اور ٹریکنگ کے بارے میں ان سے مفت مشورے کرتے تھے ـــ ہم بیگ صاحب کی بک شاپ پر پہنچے تو وہاں ایک منحنی سا نوجوان جھاڑ پونچھ کر رہا تھا ـ "بیگ صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ نہیں ہیں ـــ" نوجوان نے ناک چڑھا کر کہا "میں نیک نام ہوں ـــ"

"ٹھیک ہے آپ نیک نام ہوں گے لیکن بیگ صاحب کہاں گئے ہیں؟"

"اوہو آپ تو تارڑ صاحب ہیں ـــ" نوجوان نے میرے نزدیک آ کر مجھے سر سے پاؤں تک اچھی طرح دیکھنے کے بعد کہا "میں گھر فون کرتا ہوں" اس نوجوان نے گھر فون کیا اور اطلاع کر دی کہ تارڑ صاحب لاہور سے آئے ہیں' ماؤنٹ بلور میں ہیں' بیگ صاحب کا انتظار کر رہے ہیں ـ



"شکریہ ـ ویسے آپ کا کیا نام ہے"

"نیک نام ـــ" نوجوان مسکرایا "میں بیگ صاحب کا چھوٹا بیٹا ہوں ـــ"

ہم دوکان سے باہر آئے تو گلگت کے بازار میں تین بڑے بانکے گھڑ سوار جا رہے تھے ـ وہ پٹھان تھے شلوار قمیض ـ پشاوری چپلوں' تلے دار تلّے اور بندوقوں سمیت ـ لیکن وہ کچھ زیادہ ہی پٹھان نظر آ رہے تھے ـــ یہ تینوں بانکے جب ہمارے قریب آئے تو معلوم ہوا کہ ان میں ایک باگی ہے اور پٹھان لباس میں ہے ـ بقیہ دو حضرات بھی دراصل امریکی سیاح تھے ـ

"ہے ـــ تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے منہ پر ہاتھ رکھ کر انہیں پکارا ـ

"درہ خنجراب کے راستے بیجنگ ـــ ساتھ چلنا چاہتے ہو؟" ان میں سے ایک نے پیچھے مڑ کر ہاتھ ہلایا ـ

بس یہی گلگت کی چارم تھی' اس قسم کے منظر صرف اسی شہر میں دیکھنے کو ملتے تھے ـــ دو سفید گھوڑے اور درمیان میں ایک براؤن رنگ کا گٹھے بدن والا تھرتھراتا ہوا گھوڑا ـــ اور ان پر نیلی پگڑیوں والے "پٹھان" جو دنیا کی بلند ترین شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے چین جا رہے تھے ـــ یہاں کے لوگ ایسے عجوبوں کو عجوبہ نہیں سمجھتے' انہیں عادت پڑ چکی ہے ـ

"ابو چناران چلیں؟ ریاض صاحب سے مل آئیں" ـــ سمیر نے مشورہ دیا ـ

چناران کے ساتھ ہماری بہت ساری یادیں وابستہ تھیں ـــ ابھی دو برس قبل ہم سب نیلی سوزوکی پر سوار جب خنجراب گئے تھے تو گلگت میں ہم چناران کے چناروں میں ہی تو قیام پذیر ہوئے تھے ـــ راستے میں دو صاحبان سے راستہ پوچھا تو وہ بھی ادھر جا رہے تھے ـــ "ہم سیاحوں کا ایک گروپ چترال سے لائے تھے' شندور پاس اور پھنڈر کے راستے ـــ اب واپس چترال جائیں گے ـــ چناران میں مسافر تلاش کرنے جا رہے ہیں"

ایک جانب باغ تھا اور اس باغ کے گھنے درختوں اور سبزے اور بے پناہ خود رو پھولوں میں ایک گھر تھا ـــ کسی ایسے شخص کا جو زندگی کی حقیقت جان چکا ہو ـــ یہ ایک قراقری ریاست کے بوڑھے شہزادے کی رہائش گاہ تھی ـ

"چناران" وہیں تھا لیکن ریاض صاحب وہاں نہ تھے ـ

"اب کہاں جائیں؟" سمیر نے اپنی تھوڑی ہاتھ میں لیتے ہوئے سر ہلایا ـ

"ماؤنٹ بلور ہوٹل ـــ میں تھک چکا ہوں"

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



ہوٹل کے باغ باغیچے اسی طرح سکون اور ٹھہراؤ میں سرسبز ہو رہے تھے اور ہمارے کمرے میں بستر پر ایل بریز بیٹھا اپنے گنجے سر کو ایک کچے تربوز کی طرح انگلیوں سے ٹھونک بجا رہا تھا اور کہہ رہا تھا "سواد آگیا ہے بھائی جان۔۔۔"

یہ سلمان رشید تھا جو تازہ تازہ ٹنڈ شدہ تھا اور بے حد ہونق لگ رہا تھا "ٹریکنگ کے لیے ٹنڈ بہترین شے ہے بھائی جان ۔۔۔ سفر کے دوران سب سے زیادہ مٹی بال جمع کرتے ہیں۔ اور نہ رہیں گے بال تو پھر صفائی ہی صفائی ۔۔۔ ابھی ابھی ایک کوہستانی نائی نے ایک عدد کھنڈے استرے کے ساتھ ایسے ایسے کمالات دکھائے ہیں کہ کیا بیان کروں خود ہی دیکھ لیجئے" یہ کہہ کر وہ اپنی ٹنڈ سمیت اٹھا اور جھکا جھکا میرے پاس آگیا۔۔ ٹنڈ پر نائی کے کمالات بصورت روئی کے کھیت صاف نظر آ رہے تھے۔۔۔۔

راہی اپنی بیگم کو پکچر پوسٹ کارڈ لکھ رہا تھا اور آہیں بھی بھرتا جاتا تھا ساتھ ساتھ!

اور ایک کرسی پر سیدھی کمر اور سنہری مسکراہٹ کے ساتھ بیگ صاحب تشریف رکھتے تھے۔۔۔۔ پتلون قمیض میں اور قراقلی ٹوپی کے بغیر وہ خاصے نوجوان لگ رہے تھے۔

"ہاں آں۔ تارڑ صاحب۔ نیک نام نے آپ کا بتایا۔۔ بہت دیر سے انتظار کر رہا تھا۔۔۔۔ سلجوق کا کیا حال ہے؟ بیگم صاحبہ ٹھیک ہیں۔۔ میرا بھیجا ہوا چینی شیر پسند آیا۔۔ اس مرتبہ کہاں جائیے گا؟ اکرام نے تو مجھے آپ کے لیے خیمہ نہیں بھیجا وہ خود ایک مہم کے ساتھ کنکورڈیا گیا ہوا ہے کے ٹو کے بیس کیمپ کی طرف ۔۔۔ اور آج شام تارڑ ان میں قراقرم رائٹرز فورم کی جانب سے آپ کے اعزاز میں ایک شام ہے۔۔۔ گلگت میں کتنے روز قیام رہے گا؟"

میں مسکراتا رہا اور مسکراتے سرہلاتے بیگ صاحب کی گفتگو سنتا رہا اور پھر درجہ بہ درجہ ان کے سوالوں کے جواب دیئے۔

"اچھا۔۔۔۔ تو اس بار آپ روپل اور دیو سائی جائیں گے۔۔۔ ان کی مسکراہٹ کچھ اور زیادہ سنہری ہو گئی "اچھا۔۔۔ تو کچھ خوراک اور۔۔۔۔ کھانا پکانے کا بندوبست ہے؟۔۔۔ خیمہ؟ میرے پاس تو خیمے ختم ہو گئے۔۔۔۔ دریافت کروں گا آپ کے لیے۔۔۔۔ اور جناب فوری طور پر کل ہی سفر پر روانہ ہونا دانش مندی نہیں۔۔۔۔ آپ میدانوں سے آئے ہیں ذرا موسم کو ایک دو روز میں قبول کریں پھر بلندی کی طرف جائیں۔۔۔ تو میں اب



شام کو آؤں گا آپ کو لینے۔۔۔۔ ابھی گھر کو جاتا ہوں۔۔۔" بیگ صاحب اٹھے درجہ بہ درجہ سب سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گئے۔

"بھائی جان۔۔۔" سلمان ابھی تک اپنی ٹنڈ پر ہاتھ پھیر پھیر کر مزے لے رہا تھا "مجھے یاد پڑتا ہے کہ شمالی علاقوں کے بارے میں کئی انگریزی کتابوں میں شاید جن بیگ صاحب کا ذکر آتا ہے تو شاید یہی بیگ صاحب ہیں۔۔۔"

"یہی بیگ صاحب ہیں۔۔۔"

باہر دھوپ ڈھل رہی تھی۔۔۔۔ اخروٹ کے گھیرے دار درخت کی شاخوں میں چڑیاں شور کرتی تھیں اور ہم برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔۔۔۔ ہمارے برابر کے کمرے میں کچھ جاپانی قسم کی کچھ چیزیں تھیں' ان کے بارے میں یہ طے کرنا بے حد دشوار تھا کہ وہ عورتیں ہیں یا مرد ہیں یا صرف کٹھ پتلیاں ہیں۔ وہ کہیں آتے جاتے نہیں تھے۔ بہت دنوں سے ماؤنٹ بلور کے اس کمرے میں مقیم تھے اور وہیں برآمدے میں چاول وغیرہ ابال کر انہیں دودھ میں بھگو کر کھا لیتے تھے۔

"ویسے بھائی جان" سلمان کمرے سے نکل کر برآمدے میں آگیا جہاں صوفوں کے ڈھانچوں پر میں بمشکل توازن قائم رکھے بیٹھا تھا اور اخروٹ کے درختوں میں گونجتی چڑیوں کی چہکار سن رہا تھا "ویسے بھائی جان ٹنڈ پر اگر ناریل لگایا جائے تو دماغ کے علاوہ دیگر جسمانی عوارض کے لیے بھی بے حد مفید ہے۔۔۔۔ آپ میری ٹنڈ کو مائینڈ تو نہیں کرتے؟"

"کرتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔"

"اس کا علاج میرے پاس ہے" اس نے گلے میں بندھا ہوا فلسطینی رومال کھولا اور اسے سر پر گرہ دے کر باندھ لیا۔۔۔۔ اب وہ کسی بے بس اور حسین دوشیزہ کو لوٹ لینے والا سمندری قزاق لگ رہا تھا۔

جاپانی کمروں کی جانب سے ایک نوجوان ہیرو نما شخص آیا اور بڑا مئودب ہو کر سلمان کے قریب بیٹھ گیا۔

"بھائی جان یہ اخلاق ہے۔ بڑا خوش اخلاق ہے" یہ کہہ کر سلمان نے ایک زوردار قہقہہ لگایا جس کی شدت سے اخروٹ کا درخت چڑیوں سے خالی ہو گیا "یہاں شمالی علاقوں میں گوجرانوالہ کی ایک مل کا کپڑا فروخت کرتا ہے۔"

اخلاق واقعی خوش اخلاق تھا۔ اور اس نے شام کے کھانے پر ہماری رفاقت پر اصرار کیا اور ایسے کیا جیسے ہم اس کے گھر آئے ہوئے تھے۔۔۔۔

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



"ہاں جی پھر اخلاق صاحب اس بندوبست کا کیا بندوبست ہوا؟" سلمان نے اتنے دھیمے لہجے میں اس سے پوچھا کہ میرے کان کھڑے ہو گئے کہ یہ اتنے دھیمے لہجے میں کیوں پوچھتا ہے۔ اخلاق ذرا شرمندہ ہوا اور اسے ایک طرف لے جا کر کچھ گفت و شنید کی جو میں شنید نہ کر سکا.... پھر سلمان ایک شرارتی بچے کی طرح مسکراتا ہوا اور ہاتھ ملتا ہوا آیا اور کہنے لگا "بھائی جان دعا کیجئے گا۔" اور پھر دونوں چلے گئے' سلمان کان کھجاتا ہوا اور اخلاق گردن کھجاتا ہوا۔

سلمان کے قہقہے کی شدت سے رخصت شدہ چڑیاں اخروٹ کے درخت پر واپس آنے لگیں.... ماؤنٹ بلور کے بڑے پھاٹک میں سے ایک نوجوان جھک کر داخل ہوا اور دوسرا بغیر جھکے داخل ہو گیا کہ وہ ذرا پستہ قد تھا۔ دراز قد نوجوان نے اپنی ستواں ناک پر انگلی سے کھجایا اور پھر چاروں طرف دیکھا.... اس کی نظریں واپس آئیں جہاں میں برآمدے میں بیٹھا تھا اور وہ میرے جانب آنے لگا.... یہ نجیب تھا' اسلام آباد کی ایک ویران سڑک پر سیر کرتے ہوئے وہ سامنے سے آ گیا تھا.... گلگت کے قریب بونجی کا رہنے والا تھا' شکل سے ہالی وڈ کی کاؤ بوائے فلموں کا ہیرو لگتا تھا' طالب علم تھا اور کوہ پیماؤں کے ہمراہ گائڈ کے طور پر جاتا تھا.... بے حد ملنسار' خوش مزاج اور صرف اپنی باتیں کرنے والا.... اسلام آباد میں ہی میں نے ان دنوں میں گلگت آنے کا تذکرہ کیا تھا....

"میں روزانہ ایئرپورٹ فون کر کے آپ کا پتہ کرتا تھا۔ "یہ شادمینا ہے" اس نے نیلی جین نما پتلون' ٹی شرٹ اور ایک بڑی مسکراہٹ میں ملبوس اپنے ساتھی کی جانب اشارہ کیا....

"کیا مینا ہے؟" میرے پلے کچھ نہ پڑا۔

"شادمینا" اس پستہ قد نوجوان نے ہنس کر کہا اور جب ہنس کر کہا تو معلوم ہوا کہ وہ نوجوان تو ہے لیکن اس کے ساتھ خاتون بھی ہے....

"میں آپ سے ملنا چاہتی تھی...."

"آپ گلگت ایسے وحشی علاقے میں کیا کر رہی ہیں؟"

"میں ایک کوہ پیما مہم کے ساتھ رابطہ افسر کے طور پر جا رہی ہوں"

"پہاڑوں میں" میں نے بے یقینی سے کہا۔

"کوہ پیما مہمیں عام طور پر پہاڑوں میں ہی جایا کرتی ہیں" وہ بدستور ہنستی ہوئی بولی....



"تارڑ صاحب یہ شادمینا پاکستان کی پہلی کوہ پیما خاتون ہے.... بالتورو گلیشیئر کر کے آئی ہے اور اب جتورہ جا رہی ہے.... بہت زبردست لڑکی ہے جی...."

"اس میں کوئی شک نہیں ..... آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی....." اور مجھے واقعی اس سے مل کر بے حد خوشی ہوئی تھی.... "اور تم کیا کر رہے ہو؟"

نجیب کو بس اسی سوال کا انتظار تھا "آپ وولف گینگ کو جانتے ہیں؟ نہیں جانتے ..... جرمن ہے اور دنیا کے مشہور ترین راک کلائمبرز میں شمار ہوتا ہے...... لیکن وہ دوسرے چٹانوں پر چڑھنے والوں کی طرح نہیں ہے کہ رسوں میخوں اور کلہاڑیوں کی مدد سے اوپر جائے۔ بلکہ وہ فری کلائمبنگ کرتا ہے.... اس طرح" نجیب نے ہتھیلیاں پھیلا کر اپنی انگلیوں کو کسی خیالی چٹان میں پیوست کرتے ہوئے کہا "وہ کوئی سہارا نہیں لیتا اور صرف اپنے پاؤں اور ہاتھوں کے ساتھ چٹانوں پر چڑھتا ہے.... جیسے زمانہ قدیم کا انسان چڑھتا تھا...."

"خطرناک تو ہو گا۔"

"بہت کم فری کلائمبر زندہ بچتے ہیں.... لیکن یہ لوگ آپ جانتے ہیں کہ یہاں۔" نجیب نے انگلی سے اپنے سر کو چھوا "بالکل ڈھیلے ہوتے ہیں"

"تو پھر تم اس وولف کے ساتھ کیوں جا رہے ہو؟"

"تارڑ صاحب یہ تو ایک زبردست چانس ہے۔ میرے لیے..... صرف یہ کہہ دینا کہ میں وولف گینگ کے ساتھ راک کلائمبنگ کرتا رہا ہوں دوسرے لوگوں کو حسد میں جلا کر دینے کے لیے کافی ہے.... اور پتہ ہے ہم کیا کلائمب کریں گے؟۔ ٹرنگو ٹاورز"

"ٹرنگو ٹاورز" ان چٹانوں کا مجموعہ ہے جو کنکورڈیا کے راستے میں پڑتی ہیں اور جنہیں دیکھ کر ایک مرتبہ تو دل تھم جاتا ہے کہ ان کی بلندی اور شکل آسمان کی وسعتوں میں چھید کرتے ہوئے میناروں کی طرح ہے۔ وہ دنیا کے ہر راک کلائمبر کا خواب ہیں....

سلمان اور اخلاق منہ لٹکائے واپس آ رہے تھے "آپ نے دعا نہیں کی ناں بھائی جان" سلمان شکایت بھرے لہجے میں بولا "بندوبست کا کوئی بندوبست نہیں ہوا۔ ہنزہ واٹر تو دور کی بات ہے یہاں تو سوڈا واٹر بھی نہیں ملتا.... بھائی جان یہ چڑیاں کیوں شور کر رہی ہیں۔" اس نے غصے سے اخروٹ کے درخت کو گھورا اور پھر "ہوئے ہوئے" کہتے ہوئے زور زور سے تالی بجائی' چڑیاں پہلے چپ ہوئیں اور پھر اپنے پروں کی

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ درخت خالی کر گئیں۔

ہنزہ اور گلگت کے علاقوں میں بیگ حضرات بکثرت پائے جاتے ہیں.... آپ کسی بھی گورے چٹے اور خوش شکل صاحب کو بے دھڑک "بیگ صاحب کیا حال چال ہے؟" کہہ سکتے ہیں.... اور وہ بیگ صاحب ہو گا اور اگر نہیں ہو گا تو نہ سہی اس کے برابر کھڑا ہوا شخص تو ضرور ہو گا.... میرے سامنے بھی ایک اور بیگ صاحب تھے' ضیاء اللہ بیگ.... پہلی ملاقات راولپنڈی میں چنگیز سلطان کے دفتر میں ہوئی تھی جہاں انہوں نے اپنے پامیر ٹورز کا کارڈ تھمایا تھا اور اب دوسری ملاقات ان کے دفتر میں ہو رہی تھی۔

"نانگا پربت کی روپل سائڈ کو جانے کے لیے آپ کو استور پہنچنا ہو گا اور استور روڈ بہت خراب ہے.... سکردو روڈ تو بارہ دن بند رہنے کے بعد آج شاید کھل جائے لیکن استور روڈ.... بہرحال استور سے آپ کو ترشنگ جانا ہو گا۔۔ وہاں تک جانے کے لیے آپ کو پوری جیپ کرائے پر حاصل کرنی ہو گی.... عام لوگوں کے لیے ترشنگ تک کا کرایہ اٹھارہ سو روپے' لیکن آپ کے لیے میں اپنی کمیشن چھوڑ دوں گا۔۔ چودہ سو روپے.... لیکن آپ واپس بھی تو آئیں گے ؟"

"جی نہیں۔۔" میں نے سر ہلایا "نانگا پربت سے ہم واپس ترشنگ آئیں گے اور وہاں سے چلم چوکی اور پھر دیوسائی عبور کر کے ہم سکردو میں اتریں گے۔۔ ادھر واپس نہیں آئیں گے"

"اور آپ پرسوں صبح روانہ ہونا چاہیں گے؟ ٹھیک ہے میں کل جیپ بک کر دوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ موسم صاف ہو' تھوڑی سی بارش استور روڈ کو استور نالے میں گرا دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔۔"

سفری منصوبہ بندی طے کرنے کے بعد ضیاء صاحب کے والد صاحب نے ہمیں اپنے کلام سے نوازا' وہ بہت اچھے شاعر تھے.... اور پھر پامیر ٹور کے دفتر میں ٹی ٹی ذو داخل ہوا.... یہ ایک دبلا پتلا عینک کرتی جسم اور کھلے منہ والا جاپانی تھا جو صرف اشاروں سے بات کرتا تھا یا کبھی کبھار ایک جھٹکے دار "آہ" کرتا تھا۔ اس کے علاوہ جب کسی بھی موقع پر وہ بے بس ہو جاتا تھا یا بہت خوش ہوتا تھا تو کہتا تھا "نو پرابلم"۔۔ وہ آیا' اپنے رک سیک کی جیب میں سے ایک نقشہ نکالا اور میز پر پھیلا کر کہنے لگا "مازنو پاس۔"



ضیاء اللہ بیگ نے فوراً میری جانب دیکھا اور پھر جاپانی سے کہنے لگا۔۔ "آہ مازنو پاس" جاپانی نے جواباً ایک اور "آہ" کی اور چپ ہو گیا۔ اور ضیاء اللہ بیگ ایک تجربہ کار ٹور آپریٹر کی طرح رواں ہو گیا "جیپ ٹو استور۔ جیپ ٹو ترشنگ۔ ترشنگ ٹو مازنو پاس ٹریکنگ"

"آہ۔۔" جاپانی نے مدبرانہ انداز میں سر ہلایا۔

"جیپ ٹو ترشنگ اینڈ بیک گلگت تھرٹی سکس ہنڈرڈ۔۔" بیگ صاحب نے رقم کاغذ پر لکھ کر دکھائی کہ جیپ کے ترشنگ جانے اور آنے کا اتنا خرچہ ہو گا۔

"نو پرابلم۔۔" جاپانی نے اپنے رک سیک کی ایک خفیہ جیب میں سے رقم نکال کر میز پر رکھ دی۔

"آپ کا کام بھی ہو گیا تارڑ صاحب۔۔" بیگ صاحب نے جاپانی کی رقم گنتے ہوئے کہا "اسے کچھ پیسے دے کر اسی کے ساتھ روانہ ہو جائیں۔۔"

چنانچہ میں نے جاپانی کے ساتھ گفت و شنید کی کہ بھائی ہم آدھا کرایہ دیتے ہیں ہم تینوں کو بھی ساتھ لے چلو۔ اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا' بلکہ وہ خوش تھا کہ کچھ رقم اسے فوری طور پر واپس مل رہی ہے.... چنانچہ ایک "آہ" کے ساتھ معاملہ طے پا گیا۔

"پرسوں صبح جیپ پانچ بجے آپ کے ہوٹل میں ہو گی۔۔ اس جاپانی سے پوچھئے کہ یہ کونسے ہوٹل میں قیام پذیر ہے" بیگ صاحب نے جاپانی کو رسید لکھ کر دے دی۔

"میں کیسے پوچھوں؟" میں نے کان کھجاتے ہوئے عرض کیا "بہرحال۔۔ جاپانی..... ہوٹل؟"

جاپانی نے پھر میری بات غور سے سنی اور سر جھٹک کر بولا "نو پرابلم"

"سمیر یار تم کوشش کرو" میں نے ہتھیار ڈال دیے.....

سمیر نے جاپانی کا جائزہ لیا۔ اس کے ساتھ متعدد بار ہاتھ ملایا اور پھر کہنے لگا "سی۔ مائی فادر ہوٹل ماؤنٹ بلور۔ یو وہاٹ ہوٹل ؟"

جاپانی نے مزید خوش ہو کر کہا "آہ آہ" اور پھر بال پوائنٹ پکڑ کر اپنی ہتھیلی پر کچھ لکھ کر سمیر کو دکھایا..... ہتھیلی پر ماؤنٹ بلور لکھا ہوا تھا.....

"ارے یہ بھی وہیں رہتا ہے" سمیر خوش ہو گیا "ہاؤ آر یو جاپانی۔۔" اس نے جاپانی کے ساتھ ایک مرتبہ پھر ہاتھ ملایا اور اس کے جواب میں جاپانی نے کمر تک جھک

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



کر ایک شدید جھٹکے کے ساتھ "آہ" کی اور رک سیک اٹھا کر دفتر سے باہر چلا گیا۔

"تو پرسوں صبح جیپ آپ کے ہوٹل میں ہو گی" بیگ صاحب نے تاکید کی۔

"آہ۔۔" میں نے مسکرا کر کہا اور ہم دونوں پامیر ٹور کے دفتر سے باہر آ گئے جہاں راہی ہمارا منتظر تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں آٹے کا ایک تھیلا تھا لیکن اس میں آٹا نہ تھا بلکہ پیاز' چاول' دالیں اور آلو تھے جو اس نے متوقع پہاڑی راستوں کے لئے خریدے تھے۔ میں نے اس لمحے تو چاول اور دالوں کی اس پوٹلی کو شدید نظر حقارت سے دیکھا کیونکہ خوراک کے طور پر ہمارے رک سیک میں ٹین بند' قورمے۔ کوفتے۔ بھنا ہوا گوشت۔ حلیم۔ سارڈین مچھلیاں۔ پنیر۔ سیون اپ اور کوکا کولا اور پتہ نہیں کیا کیا تھا لیکن بعد میں نانگا پربت کے دامن میں راہی کے بنگالی طرز کے پھیکے دال چاول میں جو مزا آیا وہ بالکل بہشتی تھا۔ اب ہمیں ایک عدد خیمے کی تلاش تھی' ہر دو بیگ صاحبان اس سلسلے میں معذرت کر چکے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس سیزن میں گلگت میں خیموں کا قحط پڑ جاتا ہے۔ ہمارے لیے یہ امر باعث تشویش تھا۔۔۔۔ استور سے آگے اگر آپ کے پاس خیمہ نہیں ہے تو آپ ایک مردہ بخ ہیں۔۔۔۔ بلکہ منجمد مردہ بخ۔۔۔۔ چنانچہ خیمے کی تلاش شروع ہو گئی۔ جماعت خانہ بازار میں داو کی دوکان پر بڑی ورائٹی تھی۔۔۔۔ پولینڈ کی کسی کوہ پیما ٹیم کا تاوان نکور سامان کوہ پیمائی ان کے پاس مناسب اور غیر مناسب داموں پر موجود تھا۔۔۔۔ مجھے کوہ پیمائی کے بوٹ جچ کو لگے لیکن میں ان کا کیا کرتا۔۔۔۔ میں جوگر شوز پہنے ہوئے تھا۔۔۔۔ ایک جرمن طرز کا خیمہ دستیاب تھا لیکن صرف دو آدمیوں کے لیے تھا اور صرف ساڑھے تین ہزار کا تھا چنانچہ یہ دونوں باتیں ناقابل قبول تھیں۔۔۔۔ دوکان میں مشہور کوہ پیما میسنر کی تصویر آویزاں تھی جو داو کے بقول اس کا فرینڈ تھا۔ یہاں راہی کو ایک روسی سٹوو پسند آ گیا جو اس نے فوراً خرید لیا۔ دوسرے داو جو پارک ہوٹل کے سائے میں دوکانداری کرتے تھے ان کے پاس بھی کرائے پر اٹھانے کے لیے کوئی خیمہ نہ تھا۔ یہ داو صاحب بڑی حضرت چیز ہیں۔۔۔۔ ایک اور دوست "ماؤنٹین موورز" کے مسرت صاحب تھے لیکن وہ بھی خیمہ خلاص تھے۔۔۔۔ پھر ایک ایسی دوکان ملی جس میں سیکنڈ ہینڈ اشیاء کے انبار لگے تھے۔ ان میں ایک خیمے کے آثار تھے' میخیں اور ڈنڈے اور کپڑے کے تھان۔

"کیا ان سب کو ملا کر ایک خیمہ بنایا جا سکتا ہے؟" میں نے دوکاندار سے پوچھا۔

"معلوم نہیں صاحب" دوکاندار نے نہایت شرافت سے جواب دیا" مجھے ایک



پورٹر دے گیا تھا۔ کہتا تھا خیمہ ہے۔۔۔۔ پتہ نہیں ہے کہ نہیں۔۔ آپ دیکھ لو"

ہم نے اسے بہت دیر تک دیکھا۔۔۔۔ الٹا سیدھا کیا۔ الٹا پلٹا کیا لیکن وہ خیمہ نہ بنا۔۔۔۔ ہم مایوس ہو کر جی ایم بیگ کی دوکان پر آ گئے۔

"یہ سٹوو کیسا ہے؟" راہی نے بڑے فخر سے اپنا سٹوو بیگ صاحب کے سامنے پیش کیا۔

"آں۔۔۔۔ اچھا ہے۔۔۔۔ لیکن بھاری ہے' ایک گدھا آپ کو چاہیے اسے اٹھانے کے لئے"

بیگ صاحب درست کہتے تھے ہم نے سٹوو کے وزن کے بارے میں سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا "تو پھر کیا کریں۔۔"

بیگ صاحب نے ایک انتہائی مختصر سا سٹوو کا بچہ ہمارے سامنے رکھ دیا "یہ چینی ہے۔ بہت کار آمد ہے۔۔۔۔"

"اس پر کھانا پک سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں پک سکتا؟" بیگ صاحب نے بازار سے سپرٹ کی ایک بوتل منگائی اور سٹوو کے بچے میں بھر دی۔۔۔۔ پھر اسے دیا سلائی دکھائی تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے اچھی خاصی گرمی دینے لگا "یہ چینی ہے بہت کار آمد ہے" بیگ صاحب اپنی سنہری مسکراہٹ کو استعمال میں لائے "اور یہ تحفہ ہے میری طرف سے آپ کے گلگت آنے پر۔۔۔۔"

"آہ۔۔" میں نے صرف اتنا کہا۔

اس شام نارتھ ان کے منگول طرز کے شاندار ہال میں بہت ساری شمعیں روشن تھیں۔۔۔۔ کچھ شمعیں ایسی جو لوڈشیڈنگ کی وجہ سے انتظامیہ نے جلائی تھیں اور بیشتر شمعیں محبت کی جو لوگوں کے دلوں میں روشن تھیں اور ان کی لو سے نارتھ ان کا ہال جھلملاتا تھا۔۔۔۔ یہاں بیگ صاحب قراقرم رائٹرز فورم کی جانب سے ہمیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔۔۔۔ ادیب۔ شاعر۔ دانشور اور صحافی ہم سے اپنے دل کی بات کرتے تھے کہ ہمیں الگ نہ رکھیں' ہمیں بھی پاکستانی تہذیب کے دھارے میں شامل کر لیں۔۔۔۔ شیشے کی چھت تک پہنچتی کھڑکیوں میں سے وہ شام جھانکتی تھی جو ہمیشہ میرے دماغ میں فتور پھونکتی تھی۔۔۔۔ گلگت کے بلند پہاڑوں کے اوپر ابھی شفق کی سرخی ٹھہری ہوئی تھی' کھڑکیوں کے شیشے باہر کی خنکی سے ٹھنڈے ہو رہے تھے اور باہر ایک اداسی تھی جو میری منتظر تھی اور میں اس تک جانا چاہتا تھا' اس سے ملاقات کرتا

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



چاہتا تھا اور یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ تم ہمیشہ میرے اندر خیمہ زن رہیں تو اب اجنبی کیوں ہوتی ہو..... اور میں بے بس ہو کر تمہاری طرف کھنچتا چلا آتا ہوں تو کیوں مجھے بے بس کرتی ہو..... اور اس اداسی کو میں نے بہت جگہوں پر اپنا منتظر پایا۔ یہ میری تاک میں نہیں تھی بلکہ میری منتظر تھی..... اور پھر میں نے اس منظر' اس مقام کی تھوڑی سی اداسی کو اپنے ساتھ بھی لیا اور اسے اپنے گھر تک لے آیا' اپنے ساتھ بسایا..... لکڑی سے بنے ہوئے اس ہال میں لوگ اپنی محبت کا اظہار کر رہے تھے..... اور باہر وہ میری منتظر تھی..... لیکن جونہی تاریکی گہری ہوئی وہ چلی گئی.....

گلگت بازار کی ویرانی میں ہم ہوٹل ماؤنٹ بلور کی جانب چلتے تھے.....

باہر بادل تھے۔

برآمدے کے سامنے اخروٹ کے درخت میں خاموشی تھی۔

راہی نے اپنا روسی سٹوو کھول رکھا تھا اور اب اسے دوبارہ جوڑنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔

سلمان ڈائری لکھ رہا تھا اور اپنی ٹنڈ کو نہایت اہتمام سے سہلا رہا تھا۔

مجموعی طور پر سستی اور کاہلی کا موسم تھا۔ یوں بھی ہم سب "کاشغران" سے کابلی پلاؤ اور کوفتے تناول کر کے آئے تھے۔

اس موسم میں گلگت ریڈیو کے سٹیشن ڈائریکٹر اکرم خان آ گئے۔ ان کے ہمراہ جنگ کا نوجوان آئیڈلسٹ فخر تھا جو تازہ تازہ ریڈیو پروڈیوسر بھرتی ہوا تھا۔ فخر سے میری سلام دعا پرانی تھی..... اکرم صاحب بڑی پر بہار شخصیت تھے۔ انہوں نے ہمیں اپنی ویگن میں ڈالا اور دنیور لے گئے کیونکہ گلگت کا ریڈیو سٹیشن وہاں سے خاصے فاصلے پر واقع دنیور کے قصبے میں ہے۔ یہاں انٹرویوز لئے گئے اور چائے پلائی گئی..... واپسی پر ہم بازار میں اتر گئے کیونکہ ہمارے پاس سب کچھ تھا لیکن ابھی تک خیمہ نہیں تھا اور خیمے کے بغیر ہم ترشنگ جانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے.....

ایک مرتبہ پھر ہم اس دوکان کے سامنے کھڑے تھے جہاں سیکنڈ ہینڈ اشیاء کے انبار میں ایک خیمے کے آثار پڑے تھے۔

"کیا یہ واقعی خیمے کی صورت میں ایستادہ ہو جائے گا" میں نے دوکاندار سے پوچھا اور دوکاندار نے انتہائی ناگواری سے کہا "کیا پتہ"

"ہم اسے لگا کر دیکھ لیں۔ اگر لگ گیا تو خرید لیں گے"



"لے جاؤ"

ہم نے خیمے کی گٹھڑیاں سر پر اٹھائیں اور پامیر ٹور کے سامنے واقع چھوٹے سے باغیچے میں آ گئے۔ نجیب آر ایس ریستوران میں چائے پی رہا تھا' ہمیں دیکھ کر فوراً باہر آ گیا "کیا ہو رہا ہے سر؟"

"کیا یہ خیمہ ہو سکتا ہے؟" میں نے دونوں گٹھڑیوں اور میخوں کی جانب اشارہ کیا۔

"ہو سکتا ہے ہو۔ ہو سکتا ہے نہ ہو....." اس نے فوراً" گٹھڑیاں کھول کر کپڑے کو زمین پر پھیلا دیا۔ پھر راڈ جوڑنے لگا..... فوری طور پر ایک چھوٹا سا ہجوم جمع ہو گیا جو اس خیمہ پزل کو حل کرنے کے لئے مشورے دینے لگا۔ کچھ کا خیال تھا کہ یہ خیمہ ہے اور بیشتر کا خیال تھا کہ کبھی یہ خیمہ تھا اور اس کے کچھ حصے ہیں اور کچھ غائب ہیں..... نجیب کی کوششیں رنگ لائیں اور خیمہ تیار ہو گیا..... لیکن یہ سنگل تھا اس پر جو ڈبل چادر بارش سے بچاؤ کے لئے ہوتی ہے وہ غائب تھی۔ اس کی جگہ دوکاندار نے ہمیں کوئی کمبل نما چیز دے دی تھی..... بہرحال فقیروں کو چناؤ کا اختیار نہیں ہوتا' ہم نے مجبوراً" یہ سنگل خیمہ خرید لیا..... لیکن یہ بے حد غلیظ تھا..... ہوٹل واپس آ کر ہم نے اسے ایک ٹب میں بھگو دیا۔ راہی اور سمیر اسے ماہر دھوبیوں کی طرح دھونے لگے..... جب خیمہ دھل چکا تو نجیب نے اسے اٹھایا اور کہنے لگا "اب اسے سوکھنے کے لئے سامنے والی پتھریلی دیوار پر ڈال دیا جائے تو بہتر رہے گا..... لیکن دیوار پر کون چڑھے گا یہ بیحد اونچی ہے"

"ہوں" اس نے سر ہلایا۔

"کیسے راک کلائمبر ہو؟ ایک چھوٹی سی دیوار کو بھی کلائمب نہیں کر سکتے"

نجیب شرمندہ ہو کر کہنے لگا "مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تھا۔ کمال ہے یہ دیوار کیا چیز ہے" اس نے ایک چھلانگ لگائی اور دیوار سے چمٹ گیا اور پھر اچک کر اس کے اوپر جا بیٹھا "لاؤ خیمہ لاؤ"

زرد رنگ کا خیمہ ماؤنٹ بلور کی دیوار پر پڑا سوکھتا تھا اور اخروٹ کے درخت میں اب چڑیاں بولتی تھیں..... یہ زرد رنگ امید کا رنگ تھا۔ اس امید میں ہم نے جنگلوں اور ویرانوں میں راتیں گزاری تھیں..... میں جب اس خیمے کو دیکھتا تھا تو میرے اندر کے خانہ بدوش کا خون گرم ہوتا تھا..... وہاں جہاں میں قید تھا وہاں میں نے اپنے آپ کو چھڑانے کے لے اتنا زور لگایا تھا کہ میری گردن زخمی ہو گئی تھی۔ اس پر

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس رسی کے نشان خون آلود تھے جس کے ساتھ میں باندھا گیا تھا..... اور اب میرے سامنے زرد رنگ کا خیمہ ماؤنٹ بلور کی دیوار پر پڑا سوکھتا تھا' اخروٹ کے درخت میں چڑیاں بولتی تھیں اور میری گردن پر کوئی زخم نہ تھا..... پہاڑوں میں' دور دراز کی وادیوں میں پہنچنے اور ان کی ازلی خاموشیوں میں بسیرا کرنے کے خیال نے مجھے آزاد کر دیا تھا اور غلامی کے تمام زخم مندمل کر دیئے تھے..... میں نے ایک گہرا سانس اپنے اندر کھینچا اور اس کے ساتھ خیمے کی زردی اور چڑیوں کا شور اور گلگت کی چٹانوں کی خنک اور وحشی ہوا سب میرے اندر گئے اور وہاں بسیرا کیا۔

اس شام فخر نے پارک ہوٹل میں ہمیں کھانے کے لئے مدعو کیا تھا.....

وہاں بھی صرف پہاڑوں اور بلند چوٹیوں کی باتیں تھیں..... ایک جانب پیرس سے پیکنگ کار ریلی کے شرکاء کندھے سکیڑتے' بازو لہراتے اور ہونٹ بھینچتے آس پاس کے ماحول سے بے خبر ایک چھوٹا سا فرانس بنائے بیٹھے تھے اور آپ جانتے ہیں کہ فرانس میں کیا کچھ ہوتا ہے.... یہیں پر راک کلائمبر وولف گانگ سے میری ملاقات ہوئی..... میں نے نادانی کی جو اس سے ہاتھ ملایا' وہ کسی انسان کی نہیں لوہے کے روبوٹ کی آہنی گرفت تھی..... وہ بنیان پہنے ہوئے تھا اور اس کا بدن دکھائی دیتا تھا کہ صرف لوہا ہے..... ظاہر ہے ہاتھوں کے پنجوں اور پاؤں سے چٹانوں میں جگہ بنا کر اوپر جانے کے لئے اس قسم کا وجود درکار تھا.....

"آخر فری راک کلائمبنگ ہی کیوں؟"

"یہ ہمیشہ پہلا سوال ہوتا ہے جو مجھ سے پوچھا جاتا ہے۔۔" وہ مسکرایا تو اس کے بدن کی سختی کچھ نرم پڑی "یورپ میں ہر شے خودکار ہو رہی ہے۔۔ انسان پیچھے رہ گیا ہے' وہ مشینوں اور سازو سامان کا محتاج ہو گیا ہے..... کچھ اسی طرح کوہ پیمائی اور چٹان پیمائی بھی مکینیکل ہو گئی ہے۔ یہاں اس قسم کا انتہائی پیچیدہ اور جدید سازو سامان استعمال کیا جا رہا ہے کہ یہ پہاڑوں اور چٹانوں کے ساتھ زیادتی ہے۔۔"

"چٹانوں کے ساتھ زیادتی ہے؟"

"ہاں۔۔ جیسے آپ کسی جنگلی جانور کو کلاشنکوف سے بھون ڈالیں تو یہ زیادتی نہیں ہے؟ چٹانوں اور پہاڑوں کی طاقت اور ان کی خطرناکی کو بھی موقع ملنا چاہیے کہ وہ انسان پر حاوی ہو سکیں۔۔ بس اسی لئے ہم چٹانوں پر صرف اپنے پنجے جما کر چڑھتے ہیں..... اور یوں لاکھوں برس قبل فطرت اور انسان میں جو رشتہ تھا اسے دوبارہ جوڑتے ہیں..... یوں بھی اگر آپ پانچ چھ ہزار میٹر بلند ایک عمودی چٹان کے ساتھ



رسے کے بغیر چمٹے ہوں تو وہ جو احساس ہے بس اس کے لئے ہم یہ خطرات مول لیتے ہیں"

"ویسے ہم پاکستانیوں کا ایک تجسس یہ بھی ہے کہ یورپی لوگوں کو چونکہ پیچھے سے رونے والا کوئی نہیں ہوتا اس لئے وہ اپنی زندگی خطرے میں ڈالتے ہیں....."

"نہیں۔۔ نہیں۔۔" وولف گانگ بے حد محظوظ ہوا "یہ خیال غلط ہے..... ہماری مائیں اور بہنیں بھی ہمارے لئے فکر مند رہتی ہیں..... میں جتنے روز یہاں رہوں گا میرے خاندان کے لوگ روزانہ گلگت فون کر کے میرا پتہ کریں گے۔۔ آپ جانتے ہیں کہ پچھلے برس بھی میں ٹرینگو ٹاورز کو سر کرنے کے لئے آیا تھا لیکن صرف دس روز کے بعد میرے ساتھی اپنی بیویوں اور خاتون دوستوں کے لئے اداس ہو گئے۔ کسی کو اپنی ماں یاد آنے لگی کہ وہ اس طرح کا کھانا پکاتی تھی اور کسی کو اپنے بچے یاد آنے لگے اور نتیجہ یہ نکلا کہ ہم مہم ختم کر کے واپس چلے گئے کیونکہ ہم اداس ہو گئے تھے..... نہیں' ہمارے پیچھے بھی رونے والے ہوتے ہیں۔۔"

گلگت کا بازار سنسان ہو چکا تھا اور بادلوں کی وجہ سے تاریکی کچھ زیادہ تھی جب ہم اپنے ہوٹل واپس جا رہے تھے..... اگلے روز کے سفر کا خوف ہمارے اندر بیٹھ رہا تھا..... ہم ماؤنٹ بلور کا پھاٹک کھول کر اندر داخل ہوئے تو ہمارے کمرے کے سامنے جیپ نمبر جی ایل ٹی ۹۹۰۰ کھڑی تھی..... اگلی صبح ہمیں ترشنگ لے جانے کے لئے ..... اندھیرے میں بھی پتھریلی دیوار پر پھیلا ہوا زرد خیمہ نظر آ رہا تھا..... البتہ اخروٹ کے درخت میں خاموشی تھی۔

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com

## "روڈ تو استور اور چکور ہی چکور"

رات نیند کچھ کم آئی البتہ وہ نم مہک آتی رہی جو یہ بتاتی تھی کہ باہر پتوں اور گھاس پر ہلکی بارش ہے جو انہیں صاف کرتی ہے اور بے آواز گرتی چلی جاتی ہے..... پھر دھلی ہوئی فضا میں تیرتی مؤذن کی آواز آئی ..... میں نے اپنے گرد کمبل لپیٹا اور اندھیرے میں آنکھیں جھپکتا برآمدے میں آ گیا۔ یہاں بارش کی کن من آواز آتی تھی پر ذرا کم کم..... بوندا باندی تھی..... اخروٹ کے درخت تلے ہماری جیپ بھیگ رہی تھی..... میں واپس کمرے میں آ گیا..... اگر موسم کے یہی آثار رہے تو استور روڈ پر سفر مشکل تھا۔ بہر طور میں نے شیو کی اور شدید سرد پانیوں سے غسل کیا.....

کمیر نیند میں بڑبڑا رہا تھا۔ میں نے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا "بیٹے اٹھو" وہ فوراً آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی اور پھر آنکھیں بند کر کے بستر پر ڈھیر ہو گیا..... وہ ابھی تک گہری نیند میں تھا۔ میں دوبارہ باہر آیا تو جیپ ڈرائیور ٹائروں کی ہوا چیک کر رہا تھا اور بارش ختم ہو چکی تھی۔

"سلام جناب ...... میرا نام علاؤالدین ہے۔ آپ کو استور لے جانا ہے"

"ہم پندرہ منٹ میں تیار ہو جائیں گے"

اس نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں بادلوں کی تاریکی تھی "استور روڈ بہت خراب ہے جناب..... اگر وہاں بھی اتنی بارش ہوئی ہے تو آج نہ جائیں..... آپ ابھی آرام کریں..... سورج نکلے گا تو جائیں گے"

میں باغ میں سے ہوتا ہوا جاپانی کے خیمے کے قریب چلا گیا "شی می زو"

فوری طور پر ایک جھٹکے دار جواب "آہ" کی صورت میں آیا۔ وہ بیدار ہو چکا تھا۔

"تیار ہو جاؤ۔ ہم استور جائیں گے۔"

"نو پرابلم"



میں واپس آیا تو کمیر سلیپنگ بیگ لپیٹ کر انہیں رک سیک میں ٹھونس رہا تھا۔

"شاباش" میں نے اسے تھپکی دی۔

علاؤالدین نے ہمارے رک سیک اور بیگ جیپ کے پچھلے حصے میں ایک مضبوط رسے کے ساتھ باندھے اور پھر ان پر واٹر پروف بچھا دیا..... تاریکی کم ہو رہی تھی اور اخروٹ کا درخت آہستہ آہستہ پرشور ہو رہا تھا۔

"میرے خیال سے بسم اللہ کریں" میں نے علاؤالدین سے کہا۔

"صاحب خطرہ ہو گا..... ابھی بادل ہیں" اس نے ہتھیلی پھیلا کر کسی ایک بوند کو محسوس کرنے کی کوشش کی۔

"خطرہ ہو گا تو واپس آ جائیں گے"

جاپانی اور راہی اگلی نشستوں پر بیٹھ گئے اور ہم دونوں پچھلی سیٹوں پر براجمان ہو گئے..... گلگت کا بازار خالی تھا۔ ابھی نیم تاریکی تھی اور سڑک بھیگی ہوئی تھی..... ایئرپورٹ کے قریب سے گزر کر ہم نے پل عبور کیا اور دنیور کے قصبے سے گزر کر جگلوٹ کی جانب رواں ہو گئے..... جیپ کی رفتار کم تھی کیونکہ سڑک پر پھسلن تھی..... جگلوٹ میں تیل پانی چیک ہوا اور پھر ہم شاہراہ ریشم سے نیچے اتر کر دریائے گلگت پر واقع ایک معلق پل کو عبور کر کے دوسری جانب چلے گئے اور دوسری جانب جاتے ہی معلوم ہو گیا کہ شاہراہ ریشم اور عام سڑکوں میں کیا فرق ہوتا ہے..... کیونکہ یہاں سے جیپ کے پھڑپھڑانے اچھلنے، ہچکنے کا جو سلسلہ شروع ہوا تو صرف اس روز ختم ہوا جب ہم دس دن کے سفر کے بعد اسی پل کو پار کر کے شاہراہ ریشم پر واپس آئے..... اور جیپ کی ہر حرکت کے ساتھ آپ بھی بے اختیار ہو کر وہی حرکت کرتے ہیں اور آپ کی پسلیوں کا جل ترنگ بجتا چلا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بونجی کا علاقہ شروع ہو گیا..... زیادہ تر عمارتیں فوجی نوعیت کی تھیں۔ ایک بہت بڑے سیمنٹ شدہ میدان میں فوج کا ایک دستہ پریڈ کرتا ہوا پاکستانی پرچم کو سلامی دے رہا تھا۔ ان کے پس منظر میں قراقرم کی نیم تاریک بلندیاں اور بادل تھے..... بونجی میں ہم ایک قدیم مسجد کے سامنے ایک چائے خانے کے باہر تھوڑی دیر کے لیے رکے.....

بونجی سے باہر باغوں کا ایک سلسلہ تھا۔

آبادی ختم ہوئی تو ہر شے پیچھے ہٹتی چلی گئی..... اور ہم ایک بہت ہی وسیع لینڈ سکیپ میں مختصر ہوتے چلے گئے۔ ہماری حیثیت کم ہوتی چلی گئی اور پھر جیسے ایک ذیوٹی، جو ہماری جیپ تھی، کسی بے انت ویرانے میں رینگ رہی تھی۔ اس حیرت

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



ناک لینڈ سکیپ کے آخر میں قراقرم بلند تھے اور اتنے زیادہ بلند تھے کہ آپ کو وہ ایک مرتبہ دیکھنے سے نظر نہیں آتے تھے بلکہ آپ پہلے سامنے دیکھتے تھے اور پھر سر اٹھا کر اوپر دیکھتے تھے۔ انہیں بلندیوں میں کہیں شاہراہ ریشم کا فیتہ تھا۔ اور ان کے نیچے سندھ تھا جو یہاں سے نظر نہیں آتا تھا البتہ وہ کھائی نظر آتی تھی جس کے اندر وہ رواں تھا...... میں اس وسعت میں سانس لینا چاہتا تھا اور ڈرائیور نے میرے کہنے پر جیپ روک دی...... میں باہر آیا تو مزید مختصر اور بے حیثیت ہو گیا...... پاکستانی شمال میں اتنی شاندار اور وسیع لینڈ سکیپ میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی...... آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ لیکن ان میں برسنے کی خواہش کم دکھائی دیتی تھی اور ظاہر ہے یہاں ہوا بلا روک ٹوک چلتی تھی...... میں نے ایک مرتبہ افغانستان میں ایک ایسے ہی لینڈ سکیپ میں کچھ وقت گزارا تھا جب سفر میں بس کا ٹائر پنکچر ہو گیا تھا...... پست قد جھاڑیوں کے پھیلاؤ میں کچی سڑک کا ایک حصہ ٹیڑھی مانگ کی طرح بل کھا رہا تھا...... ایک جانب بونجی تھا جدھر سے ہم آئے تھے اور دوسری جانب خشک چٹانوں کی وہ عظیم دہشتناک دیوار تھی جس کے اندر کوئی راستہ تھا جس پر ہمیں جانا تھا۔ اور وہ راستہ ان تاریک چٹانوں کے اندر ہی اندر استور اور ترشنگ تک جاتا تھا۔ یہ باہر کی دنیا تھی جس میں ہم کھڑے تھے اور وہ ایک پوشیدہ اور الگ تھلگ دنیا تھی جہاں ہمیں جانا تھا...... یہاں سے بولڈر رج کی وہ بلندی بھی نظر آتی تھی جسے عبور کر کے فیری میڈو کے لئے سفر کیا جاتا ہے...... جب میں اور خان وہاں تھے تو ہم نے شاید اس وسیع لینڈ سکیپ کو بھی دیکھا ہو گا لیکن اس وقت دو برس پیشتر ہم تھکاوٹ اور پسینے سے اتنے بے حال تھے کہ ہمیں صرف چند قدم آگے تک دکھائی دیتا تھا ہم نے اسے کہاں دیکھا ہو گا......

"وری گرینڈ......" سمیر نے کہا جو جاپانی سے کہا جو تصویریں اتارنے میں مشغول تھا......

"آہ" اس نے جواب دیا۔

"یو لائک اٹ؟" راہی نے پوچھا۔

"نو پرابلم"

راہی آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آ گیا "آپ کو معلوم ہے کہ میں نے بنگلہ دیش کی بجائے پاکستان میں رہنا کیوں پسند کیا۔ اس لیے کہ میں پہاڑوں سے دور نہیں رہ سکتا...... یہ میری کمزوری ہیں۔ میں کاغان بھی گیا ہوں لیکن تارڑ صاحب ...... یہ تو پہاڑ نہیں کچھ اور ہیں۔" اس نے آس پاس ایک دیوانے کی طرح دیکھا "بابا یہ تو...... پتہ نہیں کیا ہیں...... اتنے اونچے اور رعب والے...... اس لینڈ سکیپ کو ساری



عمر دیکھ سکتا ہوں۔" راہی بہت متاثر نظر آ رہا تھا...... وہ ایک بڑے پتھر پر کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا...... بالکل ساکت اور اکڑا ہوا جیسے قدیم زمانوں کا کوئی جاپانی سمورائے ہو......

اس ہوش گم کر دینے والی بے حساب لینڈ سکیپ نے ہم پر ایسی دھاک بٹھا دی کہ ہم اس سے پرے دھندلی اور برف پوش چوٹیوں کے ایک مجموعے کو نہ پہچان سکے...... اور پھر مجھے خیال آیا کہ ہمیں تو ان کے پاس جانا ہے ان کے دامن میں...... یہ نانگا پربت تھی...... ابھی بہت دور اور غیر واضح ...... جیسے زمین کا نہیں آسمانوں کا حصہ ہے...... اور چاہے یہ آسمان پر تھی ہم نے اس تک پہنچنا تھا......

سفر دوبارہ شروع ہوا تو لینڈ سکیپ کی میدانی کیفیت بدلنے لگی اور دھیرے دھیرے یہ چٹانوں میں بدلی اور ہم ایک ایسے کنارے پر چلنے لگے جس کے نیچے ایک وسیع دریائی گزرگاہ کی ریت اور ٹیلے تھے اور قراقرم کے ساتھ ساتھ دریائے سندھ سکردو کی جانب سے بہتا آ رہا تھا اور ادھر جدھر ہم تھے وہاں سے چٹانوں کے اندر سے استور نالہ اپنے زور میں جھاگ اڑاتا شور کرتا آتا تھا' گزرگاہ میں داخل ہو کر پرسکون ہوتا تھا اور سندھ کے ساتھ اس کا گہرا اور خاموش ملاپ ہونے لگتا تھا...... اس نالے کے اوپر ایک معلق پل تھا جس پر ہماری جیپ کھڑکھڑاتی ہوئی گزرنے لگی...... پل کے پار زیادہ جگہ نہ تھی' صرف "استور" کا بورڈ آویزاں تھا اور اس بورڈ کے ساتھ ایک عمودی بلندی تھی اور بلندی کے ساتھ ایک نیم پختہ راستہ چمٹا ہوا تھا اور یہ راستہ اندر چٹانوں کے اندر جا رہا تھا...... ایک عظیم وسعت میں سفر کرنے کے بعد ہم گویا ایک تنگ گلی میں داخل ہو گئے۔ نیچے استور نالہ دوسری طرف ایک اور بلندی۔ آسمان کم اور خشک چٹانیں زیادہ...... اور خون خشک اس سے بھی زیادہ...... ہم باہر کی دنیا سے اندر کی دنیا میں سفر کرنے لگے...... سوئے استور!

آسمان جہاں کہیں اور جب کبھی دکھائی دیتا تھا اس پر بادل کم نظر آ رہے تھے اور بارش کا خطرہ ٹل چکا تھا۔ لیکن یہ کیسا سفر تھا۔ ایک نامعلوم کے اندر تک جانے کا سفر...... ایک چھوٹی سی کچی سڑک جو نیم پتھریلے چٹانی سلسلے میں سے کھودی گئی ہے۔ نیچے استور نالہ جسے اللہ جانے نالہ کیوں کہا جاتا ہے کہ یہ باقاعدہ ایک دریا ہے اور دریا کے ساتھ ایک اور سلسلہ کوہ جس کے پار آپ کبھی نہیں دیکھ سکتے اور یہ نالہ بھی زیادہ شریف نہیں' اس کی تندی دیکھنے کے لائق ہے۔ اور چٹانوں میں بھنچا ہوا اس کا پانی جھاگ کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتا۔ اسے شیطانی نالہ بھی کہا جاتا ہے...... چنانچہ استور تک آپ ایک چٹانی سینڈوچ میں بند ہیں...... آپ کی جیپ' ایک کچی سڑک اور

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



ایک نالہ۔ اور آپ کبھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کہیں نہیں جا رہے' ایک ہی مقام پر آپ کی جیپ کا انجن چل رہا ہے کیونکہ آس پاس' دائیں بائیں وہی ہے جو ایک گھنٹہ پیشتر تھا..... ہاں کبھی کبھار دوسری جانب کوئی بلند آبشار نالے میں گرتی دکھائی دیتی ہے تو زندگی کا احساس ہوتا ہے۔.....

اور یا پھر چندا کے چکور ہیں.....

جیپ ایک اکتا دینے والی دھن میں دھچکے کھاتی آپ کو دھکے دیتی مڑتی چلی جاتی ہے' چڑھائی چڑھتی ہے۔ اس کے ٹائروں کے تلے جو کنکر اور پتھر آتے ہیں وہ آپ کے سامنے استور نالے میں گرتے جاتے ہیں۔ اور لگتا ہے استور نالے میں ہر وہ شے گرے گی جو سڑک پر نہیں رہے گی لیکن آپ خوفزدہ نہیں کیونکہ آپ بے بس ہیں۔ آپ کچھ نہیں کر سکتے..... آپ کو نانگا پربت جانے کے لئے مجبور نہیں کیا گیا تھا۔ اگر نہیں کیا گیا تھا اور آپ اپنی من مرضی سے آئے ہیں تو پھر بھگتئے.....اور پھر آپ دیکھتے ہیں کہ کچی سڑک پر کبوتروں کا ایک غول آرام کر رہا ہے کیونکہ آس پاس سڑک کے علاوہ کوئی ایسی ہموار جگہ نہیں جہاں وہ بیٹھ کر غٹرغوں کر سکیں..... جیپ قریب ہوتی ہے تو وہ بمشکل اس کے ٹائروں تلے کچلے جانے سے بچتے ہیں کہ انہیں جیپیں دیکھنے کی عادت نہیں.....وہ پھڑپھڑا کر اڑتے ہیں اور پھر جیپ کے آگے آگے سڑک کے اوپر اڑنے لگتے ہیں' اور اڑتے چلے جاتے ہیں' جیسے وہ راستہ دکھا رہے ہوں.....اور پھر کبوتروں کا ایک ایسا غول نظر آتا ہے جو جیپ قریب آنے پر ڈرتا نہیں بلکہ آگے آگے دوڑنے لگتا ہے.....اور تھوڑی دیر میں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ چکور ہیں.....

"سچ مچ کے چکور ہیں؟" راہی حیران ہو کر پوچھتا ہے.....

"پکڑیں گے صاحب....." علاؤالدین جیپ روک لیتا ہے۔

کم از کم ایک درجن چکور چٹان کے سائے میں بیٹھے ہیں بلکہ کھڑے ہیں کیونکہ چکور بیٹھ کیسے سکتا ہے' وہ جیپ کو رکتا دیکھ کر اڑتے نہیں۔

"کیا یہ پکڑے جا سکتے ہیں؟" سمیر پوچھتا ہے.....

"ہاں صاحب..... اگر آپ کہتے ہیں تو میں کوشش کرتا ہوں....." علاؤالدین گھر سے فرار ہونے والی مرغی کو پکڑنے کے انداز میں جھک کر ان کی جانب چلتا ہے..... "نہیں صاحب" وہ پلٹتا ہے "یہ بہت چھوٹے ہیں..... بچے ہیں....."

اب ہم اپنی مردہ دلی سے باہر آ گئے ہیں کیونکہ ہر موڑ پر کبوتر اور چکور دکھائی دیتے ہیں..... کبوتر راستہ دکھانے کے انداز میں جیپ کے آگے پرواز کرتے ہیں اور دور تک ہمارا ساتھ دیتے ہیں اور چکور اپنے آپ کو بچانے کے لئے چٹان کے ساتھ لگ



جاتے ہیں یا اڑان کر کے استور نالے کے اوپر چلے جاتے ہیں۔ اور یہیں پر ہم نے سیاہ تیتروں کے جوڑے بھی دیکھے.....

چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ روڈ ٹو استور از فل آف چکورز.....نو پرابلم

استور تک سفر طے ہونے کا احساس اس لئے بھی نہیں ہوتا کہ راستے میں کوئی آبادی نہیں.....کوئی کھیت نہیں۔ کوئی کچھ نہیں..... سوائے استور نالے' کچی سڑک اور چکوروں کے.....

دوپہر ہو چکی تھی.....اور ایک موڑ کے بعد ہم نے ایک ٹریفک جیم دیکھا..... تین چار جیپیں اور درجن بھر ٹریکٹر ٹرالیاں بھی سڑک پر کھڑی تھیں اور ان کے آگے سڑک غائب تھی.....فوج کے نوجوان بیلچوں سے مٹی ہٹا رہے تھے اور اوپر ایک بل ڈوزر سر ٹکرا رہا تھا.....

علاؤالدین نے جیپ روکنے کے بعد پہلا سوال یہ پوچھا کہ کھانے پینے کا کوئی بندوبست ہے کہ نہیں' ہو سکتا ہے ادھر رات بسر کرنی پڑ جائے..... اس نے پچھلے ٹائروں کے پیچھے بڑے بڑے پتھر رکھ کر اطمینان کیا کہ جیپ لڑھکنے نہ پائے اور پھر تازہ ترین صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے آگے چلا گیا.....

سڑک کا تقریباً ایک فرلانگ کا حصہ نیچے گر چکا تھا.....اس کے نیچے ایک پرانی سڑک تھی جو بالکل ڈھے چکی تھی اور اب اسے چھوڑ کر ایک نئی سڑک پہاڑ میں سے تراشنے کی کوشش کی جا رہی تھی.....دوسری جانب بھی ٹریکٹر ٹرالیوں اور جیپوں کے مسافر سڑک کے کنارے بیٹھ کر استور نالے کو تکتے جا رہے تھے..... ان کے لئے یہ معمول تھا کہ استور روڈ گر گئی ہے اور رات ادھر ہو گی ..... لیکن شب بسری کے لئے بھی یہ مقام کچھ زیادہ پر فضا نظر نہیں آتا تھا..... اور یہاں سے استور نالہ بھی سیدھا نیچے تھا.....

میں بھی بقیہ مسافروں کی طرح سڑک کے کنارے پر بیٹھ کر استور نالے کے پانیوں کو دیکھنے لگا..... سمیر اور جاپانی کا آپس میں ایک تعلیمی معاہدہ ہو گیا جس کے تحت سمیر اسے انگریزی سکھا رہا تھا اور وہ اسے جاپانی سے آگاہ کر رہا تھا..... راہی اپنی سکیچ بک نکال کر استور روڈ کو کاغذ پر منتقل کرنے لگا۔

یہ عارضی پڑاؤ آہستہ آہستہ زیادہ آباد ہونے لگا..... اکثر ٹریکٹر ڈرائیور آگ سلگا کر چائے تیار کرنے لگے۔ چند فوجی جیپیں دھول اڑاتی ہوئی چلی آ رہی تھیں..... ان میں سے ایک جیپ میرے قریب آن رکی اور اس میں سے تین نوجوان کپتان برآمد

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



ہوئے' انہوں نے دریا میں گری ہوئی سڑک کو دیکھا اور زیر لب کچھ ناگفتہ بہ الفاظ کہے.... بل ڈوزر اپنا آہنی جبڑا کھولے مسلسل پہاڑ کو میدان بنانے کی کوشش کر رہا تھا.... فوجی جوان کدالوں پر جھکے پسینے میں نچڑتے تھے.... ایک کپتان میرے قریب سے گزرا۔ پہلے گزر گیا اور پھر واپس آ کر کہا "آپ ہیں؟" کہہ کے بیحد پرمسرت ہوا' زوردار جھٹکے کے ساتھ بار بار ہاتھ ملایا اور کہنے لگا "گویا آپ سچ مچ سفر کر کے سفرنامے تحریر کرتے ہیں... میرے لائق کوئی خدمت؟"

"اگر آپ ہمیں آج ہی دوسری جانب پہنچانے کا بندوبست کر سکتے ہیں تو کر دیجئے.... کہ یہ سڑک فوج کے زیر انتظام ہے.... نہیں کر سکتے تو نہ سہی...."

نوجوان کپتان نے اپنے آپ کو سنجیدہ ظاہر کرنے کے لئے تیوریاں بھی چڑھائیں اور کہنے لگا "آئی ول ٹرائی مائی بیسٹ سر..." بقیہ دونوں کپتان بھی اس کے ہمراہ آگے چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئے اور کہنے لگے "آپ صرف ڈیڑھ گھنٹے تو انتظار کر سکتے ہیں ناں؟.... ابھی اس پہاڑ کو ڈائنا مائیٹ سے اڑایا جائیگا...."

لوگ پیچھے ہٹنے لگے... آگے تک گئی ہوئی جیپیں واپس ہونے لگیں اور فوجی جوانوں نے سب کو خبردار کیا... اور پھر ایسا شاندار دھماکہ ہوا کہ آدھے پہاڑ کے ساتھ درخت اور جھاڑیاں بھی فضا میں بلند ہوئیں.... گرد کا ایک بادل عارضی طور پر ہوا میں معلق ہوا... بل ڈوزر پھر سے راستہ بنانے لگا اور واقعی ایک گھنٹے کے بعد ہم پھر سے رواں دواں تھے....

پچھلے پہر ہوا میں خنکی محسوس ہوئی۔ خشک جھاڑیوں کی بجائے چیڑ کے چھوٹے چھوٹے درخت نظر آنے لگے اور ہم ذرا نیچے ہو کر تقریباً دریا کے ساتھ آ گئے.... تھوڑی دیر کے لئے رکے' اپنے آپ کو ٹھنڈے پانی سے بھگو کر تروتازہ کیا اور پھر چل اے مسافر چل....

"علاؤالدین بھائی" راہی نے ڈرائیور سے کہا "استور کتنی دور رہ گیا ہے؟"

"استور ادھر رہ گیا ہے" اس نے دریا کے ساتھ بلندی کی جانب چڑھتی ہوئی ایک سڑک کی طرف اشارہ کیا "ادھر سے دو کلومیٹر اوپر ہے لیکن ہم ادھر سے سیدھے ترشنگ جائیں گے"

"اور چائے کہاں پئیں گے؟" راہی نے بڑی معصومیت سے دریافت کیا۔

"گریکوٹ میں...."

چنانچہ ہم استور نہ دیکھ سکے' اس کے آس پاس کو سونگھ کر آگے نکل گئے۔



گریکوٹ' بلند اور خشک پہاڑوں میں گھرا ہوا ایک مختصر سا قصبہ تھا.... یہاں استور نالے کا پاٹ بہت وسیع تھا۔ چند فوجی بیرکیں تھیں۔ تین چار دوکانیں اور ایک چائے خانہ تھا جس کی کالک بھری دیواروں کے ساتھ ٹیک لگا کر ہم دھواں بھری چائے نوش کرتے تھے اور مزے کرتے تھے.... گریکوٹ میرے لئے بے حد اہم تھا... یہاں سے اوپر کو راستہ جاتا تھا' چلم چوکی کو... اور اس سے اوپر دیوسائی کے میدان تھے.... ہماری منصوبہ بندی یہی تھی کہ نانگا پربت سے واپسی پر گریکوٹ آیا جائے اور یہاں سے چلم چوکی اور دیوسائی اور وہاں سے سکردو... چائے خانے کا مالک عبداللہ ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھا لیکن اس نے شک کا ایک بیج ہمارے دل میں بو دیا' کہنے لگا "اوپر جو بڑا پانی ہے اسے عبور کرنے کے لئے ہر برس لکڑی کا پل بنایا جاتا ہے اور سردیوں کے شروع میں اس پل کو توڑ کر آگ تاپی جاتی ہے۔ بڑے پانی کو کئی لوگ پیدل بھی عبور کرتے ہیں اور کئی لوگ اس کوشش میں پانی میں گر کر بہتے چلے جاتے ہیں۔ اور چلے جاتے ہیں... اس برس ابھی تک وہ پل نہیں بنا"

"تو ہم اسے پار نہیں کر سکتے؟"

"نہیں۔ نائلون کا رسہ ہو تو ایک دوسرے کو باندھ کر دوسری طرف جایا جا سکتا ہے"

اسی بڑے پانی یا کالے پانی کے بارے میں مجھے پی آئی اے کے کیپٹن زبیر نے بتایا تھا کہ اگر کبھی آپ کو اسے عبور کرنا پڑے تو بوٹ پہنے رکھئے گا' اگر ننگے پاؤں چلے تو اس کے سنگریزے بلیڈوں کی طرح تیز دھار کے ہیں۔ پاؤں کٹتا چلا جاتا ہے اور آپ کو خبر تک نہیں ہوتی کیونکہ آپ یخ بستہ پانیوں میں ہوتے ہیں.... اور پھر جب پتہ چلتا ہے تو آپ وقتی طور پر اپاہج ہو چکے ہوتے ہیں.... گریکوٹ کے دھواں بھرے چائے خانے میں عبداللہ نے ہمیں دیوسائی کے کئی قصے سنائے.... جن میں ایک یہ بھی تھا کہ صرف تین برس پیشتر تین مقامی گڈریے راستہ بھول گئے اور برف کے ساتھ برف ہو گئے... اور یہ کہ دیوسائی پر ایک صاف آسمان چند لمحوں میں ابر آلود ہو کر پاؤ بھر وزن کے اولے آپ پر گرا سکتا ہے۔ ہمیں شام سے پہلے ترشنگ پہنچنا تھا اور سچی بات ہے میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ اس قسم کے علاقے کو دیکھنے کے لیے میں نے اتنا تردد کیوں کیا؟ ترشنگ آخر گریکوٹ سے ذرا بہتر کوئی گاؤں ہو گا تو پھر کیا ہو گا....

گریکوٹ کے راستے میں بھی سڑک متعدد مقامات پر گری ہوئی تھی اور وہاں

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



ٹرنک یک طرفہ تھی۔ یہ راستہ دریا سے اتنی اونچائی پر تھا کہ جیپ سے جھانکنے پر ہوائی جہاز کے کاک پٹ کا سا منظر دکھائی دیتا تھا۔۔۔ایک جگہ ایک ٹریکٹر ٹرالی پر تودہ گرا ہوا تھا اور صرف ٹریکٹر کا سٹیرنگ مٹی سے باہر تھا۔ چند مزدور اسے کھود کر باہر نکالنے کی کوشش میں مصروف تھے۔۔ڈرائیور کے بارے میں اطلاع ملی کہ وہ تودے کی گڑگڑاہٹ سن کر ٹریکٹر سے کود گیا تھا اور کود کر سیدھا دریا میں گیا تھا۔۔۔ اور یہاں پر دریا میں بہت بڑے بل ڈوزر کا ڈھانچہ چرمرہو کر پڑا تھا اور پانی کے زور سے ذرا سا حرکت کرتا تھا۔۔۔ گریگوٹ کی بیرکوں کے ساتھ ہم نے استور نالے پر واقع بڑے پل کو عبور کیا۔ پل کے پار فوج کے محکمہ سپلائی کا ڈپو تھا۔ ڈپو کے قریب اوپر سے ایک نالے کے ساتھ ایک راستہ اوپر کو اٹھ رہا تھا۔۔۔۔۔۔

"صاحب یہ نالہ دیوسائی سے آرہا ہے" علاؤالدین نے پیچھے مڑ کر کہا۔۔

"تو پھر روکو یار اسے سلام کریں"

اس نے جیپ روکی اور میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا "صاحب کے سلام کرے گا؟"

"اسے" میں نے نالے کی طرف ایک دیوانے کی طرح اشارہ کیا "اسے بابا۔ یہ جو اوپر دیوسائی کے میدانوں سے آ رہا ہے۔ جہاں میں جانا چاہتا ہوں اور جا نہیں سکا۔ لیکن اس مرتبہ ہم جائیں گے۔۔"

"نالے کو سلام کرتا ہے؟" علاؤالدین نے راہی کو اپنا رازداں بنانے کی کوشش کی "کیوں کرتا ہے؟"

راہی نے سر ہلایا "اس کا پیچ ڈھیلا ہے ـــ یہ ادھر دماغ میں گڑبڑ ہے"

نالے کا نیلگوں پانی میری آنکھوں کو ٹھنڈک دے رہا تھا۔۔۔

"ابھی آگے سڑک بہت خراب ہے۔۔۔" علاؤالدین بولا "ادھر خراب ہو تو ایک دن میں ٹھیک ہو جاتی ہے ادھر خراب ہو تو مہینہ مہینہ خراب رہتی ہے۔ شام سے پہلے پہنچنا ہے"

اب لینڈ سکیپ اتنی ویران اور آنکھوں کو دکھ دینے والی بنجر نہ تھی بلکہ تھوڑی سی شادابی تھی' سفیدے کے درخت تھے۔ یہاں سے ہم نے ایک مرتبہ پھر استور نالے کو رحمان پور پل سے عبور کیا لیکن یہاں اس کا نام روپل نالہ تھا۔۔۔۔ ایک راستہ رحمان پور اور رتو کو جا رہا تھا لیکن ہم ترشنگ جانے والے راستے پر تھے۔۔۔ جہاں استور ایک دنیا کے اندر ایک اور دنیا تھی وہاں استور سے آگے پھر ایک اور جہان



تھا۔۔ ایک نیا ان دیکھا جہان۔۔۔ جہاں بہت کم لوگ آئے تھے۔۔۔ ہمارے آگے ترشنگ تھا۔۔۔ اور پتہ نہیں جس کی جانب ہم اتنے طویل سفر کے بعد آئے تھے وہ کیسا تھا۔۔۔ ترشنگ۔۔۔

شام قریب تھی اور ہمارا پورا دن سفر میں گذرا تھا۔ ہم اپنے وقت اور اپنے عہد کو پیچھے چھوڑ کر آگے جا رہے تھے۔ ایک نئے وقت اور نئے عہد میں۔۔ آس پاس سبزہ زیادہ ہو رہا تھا اور روپل نالہ ہم سے پرے ہو چکا تھا۔ ہم ایک سرسبز میدان میں داخل ہوئے۔ پھر بونجی کی طرح پہاڑ پیچھے ہوئے اور لینڈ سکیپ وسیع ہونے لگی۔ میں پچھلی نشست پر بیٹھا بار بار پوچھتا تھا کہ ترشنگ کتنی دور ہے کیونکہ اب میری ہڈیاں بھی دکھ رہی تھیں۔۔۔ میں ونڈ شیلڈ کو دیکھ رہا تھا جس میں ایک بہت وسیع علاقہ شام کی آمد سے پیشتر ایک بجھی ہوئی روشنی میں تھا' ہلکے بادل تھے۔ اور اندر جو ہوا آ رہی تھی اس میں ٹھنڈک تھی۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ ونڈ شیلڈ برف سے سفید ہو گئی ہے اور یہ بہت شتابی سے ہوا۔۔۔ بہت غیر متوقع طور پر' جیسے یونانی دیومالا میں جیسن کی کشتی کے سامنے سمندر کے میدان میں سے ایک عفریت ابھرتا ہے اور آسمان تک چلا جاتا ہے اور اس کے سامنے کشتی اور اس کے مسافر خوفزدہ چہروں کے ساتھ منہ کھولے اسے دیکھتے ہیں۔۔۔ کچھ ایسے ہی اس سرسبز میدان میں شام کی آمد سے پیشتر ایک بجھی ہوئی روشنی میں نانگا پربت کا سلسلہ ہائے کوہ یوں بلند ہوا کہ بلند ہوتا چلا گیا اور اس نے پورے آسمان کو بھر لیا اور ہم پرمسرت چہروں کے ساتھ منہ کھولے اسے دیکھتے تھے اور اس کے آس پاس گہرے بادل تھے جن میں سے ایک گڑگڑاہٹ نکل کر نیچے میدان تک آتی۔۔۔ اور مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ منظر میرے سامنے ہے میں اسے دیکھ رہا ہوں۔۔۔ کیونکہ یہ ایک اور وقت تھا ایک اور عہد تھا جس میں ہم سفر کر رہے تھے۔۔۔ کھیتوں میں بہت سارے جامنی رنگوں کے پھول ہوا سے اپنی جگہ عارضی طور پر بدلتے تھے۔۔۔ سڑک سیدھی جا رہی تھی۔۔۔ چند مکانوں کے سامنے ایک شخص کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا۔ جیپ رک گئی۔۔۔ یہ مولوی یونس تھا۔۔

"آپ آگے نہیں جاؤ۔ سڑک روپل نالے میں گر گئی ہے"

میرا دل بیٹھ گیا۔ اب اتنی دور آ کر اور نانگا پربت کو یوں شاندار دیکھنے کے بعد اگر واپس جانا پڑا تو۔۔۔۔۔

"آپ کہاں جاؤ گے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"ترشنگ اور پھر روپل کے راستے نانگا پربت کے بیس کیمپ"

More Books Visit www.iqbalkalmati.blogspot.com



"تو پھر پورٹرز ہم آپ کو دیں گے۔ یہ ہمارا حق ہے چورت والوں کا...."

"بابا ہم ادھر ترشنگ پہنچیں تو پورٹرز لیں گے ناں.... تمہیں یقین ہے کہ سڑک بالکل خراب ہے اور اس پر سے گزرا نہیں جا سکتا؟"

"ہاں صاحب ... ابھی دو جیپیں واپس گئی ہیں.... اور وہ حصہ اچھا نہیں ہے کیونکہ دریا بالکل ساتھ ہے.... آپ رات ادھر گزار لو۔ ہو سکتا ہے کل تک ٹھیک ہو جائے"

"کیوں صاحب ..." علاؤالدین نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا تم اس سے پیشتر ترشنگ گئے ہو؟"

"نہیں صاحب صرف استور تک ہی آیا ہوں۔ ویسے بھی یہ سڑک تو ابھی نئی ہے ورنہ ادھر تک تو لوگ پیدل آتے تھے ..... صرف دو برس پہلے سڑک نہیں تھی۔"

"کیا خیال ہے جاپانی؟"

"آہ" اس نے سر جھٹکا۔

"میرا خیال ہے کہ وہاں تک جا کر دیکھ لیا جائے کہ کتنی خراب ہے.... اگر نہ گذر سکے تو واپس یہاں آجائیں گے"

"نو پرابلم۔" اس نے جھک کر کہا۔

"چلو بھئی علاؤالدین"

مولوی یونس نے سر ہلایا اور پھر کہنے لگا "آپ واپس آ جاؤ گے۔ لیکن نانگا پربت کے پورٹرز آپ ہم سے لینا۔ اس گاؤں کا نام چورت ہے۔"

چورت کے فوراً بعد میدان ختم ہو گیا اور روپل نالہ ہمارے قریب آ گیا۔ یہ گہرائی میں نہ تھا بلکہ سڑک سے صرف دس بیس فٹ نیچے تھا۔ بہت تیز نہ تھا.... یہاں راستہ خاصا خراب تھا اور جیپ بہت سوچ سوچ کر دھچکوں کے ساتھ چلتی تھی۔ ایک موڑ پر ہم نے ایک خوبصورت آبشار کو بہت بلندی سے کچی سڑک پر گرتے دیکھا۔ نہیں اسے آبشار نہیں کہا جا سکتا' یہ کسی گلیشیئر کا پانی تھا جو چھوٹی چھوٹی نالیوں کی صورت میں نیچے آ رہا تھا۔ اور پھر ایک مسلسل پھوار اور بارش کی شکل میں سڑک پر گر کر روپل نالے میں جا ملتا تھا.... اس آبشار کے آگے وہ مقام تھا جس کے بارے میں مولوی یونس نے اطلاع دی تھی کہ وہاں سڑک دریا میں گر چکی ہے۔ ہم جیپ روک کر آگے گئے.... آبشار کا پانی ہم پر گرتا تھا۔ وہاں سڑک کا ایک چھوٹا سا حصہ



غائب تھا اور وہاں سے دس بیس فٹ نیچے دریا کا پانی تھا.... اور یہ ایسا چھوٹا سا حصہ تھا جس پر سے جیپ ٹائر گزرنا تھا کیونکہ پہاڑ کی جانب کوئی گنجائش نہ تھی۔ اب حساب کتاب یہ لگانا تھا کہ اگر جیپ یہاں سے گزاری جائے تو کیا وہ بیلنس قائم رکھے گی یا ترچھی ہو کر دریا میں گر جائے گی.... ہم اس سوراخ کو تو پر نہیں کر سکتے تھے جہاں سے سڑک غائب تھی....

"صاحب ذرا مدد کرو پتھر لاؤ" ڈرائیور نے اس حصے کو بوٹ سے دباتے ہوئے کہا۔ چنانچہ سب نے حسب مقدور اپنے اپنے سنگ اٹھائے اور وہاں ڈھیر کر دیئے.. علاؤالدین جیپ میں سوار ہوا پھر اسے آہستہ سے نہایت احتیاط سے چلاتا ہوا گرے ہوئے حصے کے قریب لے گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے باہر نکل کر پھر حساب کتاب کیا اور دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اور ہم دوسری جانب سانس روکے جیپ پر نظریں جمائے کھڑے تھے۔ اور ہم نے دیکھا کہ اس حصے پر سے گزرتے ہوئے جیپ کا اگلا ٹائر لحظہ بھر کے لئے ہوا میں معلق ہوا اور پھر پچھلے ٹائر کی بھی یہی کیفیت ہوئی لیکن جیپ ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ ہماری جانب آ گئی ... ہم سب نے باری باری ڈرائیور سے ہاتھ ملایا اور اس کی پیٹھ تھپکی ... خاص طور پر جاپانی "نو پرابلم - نو پرابلم" کہتا نڈھال ہوتا تھا۔

اور حیرت انگیز طور پر ہمارے بدنوں میں تھکاوٹ کم ہو گئی.... ہماری پسلیاں جو آپس میں بھڑ کر رگڑی جا چکی تھیں قدرے آرام سے ہو گئیں۔

"بس جی ترشنگ نزدیک ہے۔" علاؤالدین کو اس بات پر فخر تھا کہ جہاں سے دو جیپ ڈرائیور خوفزدہ ہو کر واپس چلے گئے وہاں سے اس نے اپنے کمال فن سے راستہ بنا لیا.... اور راستہ نیچے ہو کر ایک چھوٹے سے نالے تک گیا۔ اسے عبور کر کے اوپر ہوا اور چڑھتا گیا اور پھر جیپ رک گئی۔